فسانے منٹو کے

ترتیب و انتخاب

ڈاکٹر خالد اشرف

کتابی دُنیا دہلی

فسانے منٹو کے

سعادت حسن منٹو کا فن اور منتخبہ افسانے

فسانے منٹو کے

ترتیب و انتخاب

ڈاکٹر خالد اشرف

©خالد اشرف

FASANEY MANTO KE

Ed: Dr. KHALID ASHRAF
Reader, Kirori Mal College
University of Delhi

Year of Edition : ***2007***

ISBN:81-87666-51-X

Price : Rs. 300/-

نام کتاب : فسانے منٹو کے
مرتب : ڈاکٹر خالد اشرف
قیمت : Rs......... 300
اشاعت : ۲۰۰۷
مطبع : کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

☆☆☆

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Turkman Gate
Delhi-110006 (India)
Mob: 9313972589, 9313543291 Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com

مشفق استاد، کرم فرما، ممتاز دانشور، البیلے شاعر

پروفیسر قمر رئیس کے نام ؏

جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

حرفِ اول

یہ کتاب دراصل ایک بڑے پروجیکٹ کا حصۂ اول ہے۔

کئی سال قبل محترم پروفیسر عتیق اللہ صاحب سے تذکرہ نکلا کہ سعادت حسن منٹو کے ایک جامع انتخاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بازار میں ڈاکٹر اطہر پرویز مرحوم کا مرتبہ۔ جو نسخہ دستیاب ہے، وہ صرف چودہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ منٹو نے اپنی تینتالیس سال سے کم کی زندگی میں دو سو تینتیس سے زائد افسانے قلمبند کئے تھے۔ خاکوں، ڈراموں، انشائیوں اور فلموں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ اگر منٹو کے افسانوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع کافی ہے اور صرف چودہ افسانے منتخب کر کے ان کے فن کے منفرد پہلوؤں کی بھرپور نمائندگی نہیں کی جا سکتی۔

بات ایک بھرپور انتخاب کی ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر خالد علوی نے ایک اور نیا آئیڈیا دیا۔ کیوں نہ ان منتخبہ افسانوں کا تجزیہ بھی کتاب میں دیا جائے تاکہ کتاب اور مصنف کا علمی وقار بڑھے اور منٹو کے فن پر کچھ نیا مباحثہ بھی شروع ہو! —— چنانچہ راقم نے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ لیکن تین سال کی مدت میں جب مسودے کی تکمیل ہوئی تو پتہ چلا کہ منتخبہ افسانوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے تیس تک پہنچ گئی ہے اور کل متن کے صفحات کی تعداد ۹۰۰ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کی طباعت اور اشاعت آسان کام نہیں ہے۔ مجبوراً طے پایا کہ کتاب کے دو حصے کر دیئے جائیں۔ اولین حصے میں صرف منتخبہ افسانے شائع کئے جائیں اور حصہ دوم میں سوانحی تفصیلات اور تجزئیات دیئے جائیں۔ چنانچہ یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

کوئی انتخاب حرف آخر نہیں ہوتا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ منٹو کے افسانوں کی مکمل رینج قارئین کے سامنے لائی جائے اور منٹو سے دلچسپی رکھنے والے اوسط اور سنجیدہ دونوں طرح کے قارئین کو کسی دوسرے انتخاب یا مجموعے کی کمی یا ضرورت محسوس نہ ہو۔ چنانچہ ان افسانوں کو اس انتخاب میں جگہ دی جا رہی ہے جن میں منٹو کے موضوعات اور کردار اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور جلوہ فشانیوں کے ساتھ قارئین کے روبرو آن موجود ہوتے ہیں اور جن کے ذریعے منٹو کا فکری و فنی وژن روز روشن کی طرح واضح و عیاں ہو جاتا ہے۔

کچھ باتیں منٹو اور ان کے فن کے حوالے سے بھی —— سعادت حسن منٹو ایک متنازعہ فیہ ادیب

رہے ہیں۔ ابتداً باری علیگ کی رہنمائی میں سوشلزم سے متاثر رہے، پھر لاہور، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی میں ترقی پسندوں کے نزدیک رہے۔ پاکستان میں جب فحاشی اور نیا ادب۔ ترقی پسند ادب کے سوالات اٹھے تو کچھ عرصہ محمد حسن عسکری کے نزدیک رہے۔ لیکن چونکہ مزاجاً روایت شکن، کشادہ ذہن اور وسیع النظر تھے اس لئے پھر ترقی پسندی کے غیر تنظیمی فکری پہلو کے پیروکار بن گئے اور تادم آخر اسی فکری نہج پر قائم رہے۔ ترقی پسندوں نے منٹو کے فکر وفن کو غیر مشروط طور پر تسلیم نہیں کیا تو ساتویں دہائی کے جدیدیوں نے منٹو کو اپنے انفرادیت پسند رنگ میں رنگ ڈالا، جو مکمل سچ نہیں، سچ کا ایک پہلو بھر ہے۔ یہ سارے مباحث اس انتخاب کے بعد والی تنقیدی جلد --- '**فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا**' میں تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

سعادت حسن منٹو اپنے عصر کے بڑے کہانی کار تھے سو کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی بھی تھے۔ لیکن منٹو کے فکشن کا ایک وصف ایسا ہے جو ان کو اپنے تمام ہمعصروں میں نمایاں ترین مقام عطا کرتا ہے —— وہ ہے ان کے افسانوں میں پایا جانے والا سچ۔ ہم یہ بات مکمل ذمہ داری اور غیر جانبداری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو کی کہانیوں میں فکشن کا عنصر کم سے کم ہے اور فیکٹ کا عنصر اکثر صدفی تک پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے جو مشاہدہ کیا اور محسوس کیا' نہایت دیانت داری کے ساتھ اور بغیر پردہ ڈالے فکشن کی شکل میں پیش کر دیا۔ منٹو کی سوانحی تفصیلات اور خاکوں وغیرہ کا جائزہ لینے پر یہ سچائی بغیر زیادہ عرق ریزی کے واضح ہو جاتی ہے کہ سعادت حسن منٹو جیسے سچے اور کھرے فنکار اردو دنیا کو کم ہی نصیب ہوئے ہیں۔ انہوں نے تاعمر سچ کہا' سچ لکھا' دوہری قدروں سے عملی اور علمی طور پر ہمیشہ پرہیز کیا اور زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اطراف کی سرکردہ قوتوں سے مفاہمت نہیں کی۔ ان کی ناوقت موت وہ قیمت تھی جو اپنی روشن خیالی اور غیر مفاہمت پرستانہ رویے کی بنا پر ان کو چکانا پڑی۔

میں سعادت حسن منٹو کی انفرادیت پسندی اور غیر مصلحت پرست آزادہ روی کو سات سلام کرتا ہوں اور یہ انتخاب منٹو کی اکیاونویں برسی پر قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ افسانہ 'پھندنے' ضمیمے میں رکھا گیا ہے کیونکہ کچھ لوگ اسے اہم تسلیم کرتے ہیں' میں اسے ایک مبہم تحریر سمجھتا ہوں۔

متن کی فراہمی کے سلسلے میں حاجی محمد مجتبیٰ خاں، روحِ رواں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا شکریہ مجھ پر واجب ہے اور عزیزم اقبال علی صاحب کا بھی، جن کی دلچسپی کی بنا پر یہ کتاب منظر عام پر آ سکی۔

کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی
خالد اشرف
۱۸ر جنوری ۲۰۰۶

مشمولات

سعادت حسن منٹو: کوائف ۱۰

منٹو کا فن اور نظریۂ فن ۱۳

افسانے : ۷۱-۴۸۰

۱۔ بابو گوپی ناتھ ۷۱
۲۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ ۸۷
۳۔ نیا قانون ۹۵
۴۔ خوشیا ۱۰۷
۵۔ ہتک ۱۱۵
۶۔ ۱۹۱۹ کی ایک بات ۱۳۷
۷۔ سوراج کے لئے ۱۴۷
۸۔ بلاؤز ۱۷۵
۹۔ دھواں ۱۸۶
۱۰۔ بو ۱۹۹
۱۱۔ کالی شلوار ۲۰۲
۱۲۔ جانکی ۲۱۸
۱۳۔ شاردا ۲۳۹
۱۴۔ ممی ۲۶۱

۱۵۔ موذیل ۳۰۲
۱۶۔ ٹھنڈا گوشت ۳۲۵
۱۷۔ ننگی آوازیں ۳۳۲
۱۸۔ کھول دو ۳۳۹
۱۹۔ سہائے ۳۴۳
۲۰۔ رام کھلاون ۳۵۱
۲۱۔ آخری سلیوٹ ۳۶۰
۲۲۔ ٹیٹوال کا کتا ۳۷۱
۲۳۔ دو قومیں ۳۸۰
۲۴۔ شاہ دولے کا چوہا ۳۸۹
۲۵۔ نعرہ ۳۹۶
۲۶۔ سیاہ حاشیے ۴۰۸
۲۷۔ کبوتروں والا سائیں ۴۲۶
۲۸۔ ممد بھائی ۴۳۷
۲۹۔ دودا پہلوان ۴۵۲
۳۰۔ پھوجا حرام دا ۴۵۹

ضمیمہ:

پھندنے ۴۶۸

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

پیدائش : ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ (سمرالہ، ضلع لدھیانہ، پنجاب)

نسل : کشمیری

تعلیم : انٹرنس (نامکمل)

قیام : امرتسر، علی گڑھ، لاہور، دہلی، بمبئی

ذریعۂ معاش : صحافت، فلم، ادب، ڈرامہ نویسی

شادی : ۲۶ر اپریل ۱۹۳۹، بیگم صفیہ

ادبی رہنما : باریؔ علیگ

اولین افسانہ : تماشہ (جریدہ 'خلق' امرتسر)

پاکستان ہجرت : جنوری ۱۹۴۸

اولادیں : عارف (فوت) نگہت پٹیل
نزہت ارشد فاروق، نصرت شاہد جلال

افسانوی مجموعے : آتش پارے (۱۹۳۶)، منٹو کے افسانے (۱۹۴۰)
دھواں (۱۹۴۱)، افسانے اور ڈرامے (۱۹۴۳)
چغد (۱۹۴۸)، لذتِ سنگ (۱۹۴۸)
سیاہ حاشیے (۱۹۴۸)، خالی بوتلیں خالی ڈبے (۱۹۵۰)
ٹھنڈا گوشت (۱۹۵۰)، نمرود کی خدائی (۱۹۵۰)
بادشاہت کا خاتمہ (۱۹۵۱)، یزید (۱۹۵۱)
سڑک کے کنارے (۱۹۵۴)

سرکنڈوں کے پیچھے (۱۹۵۴) پھندنے (۱۹۵۵)

برقعے (۱۹۵۵)، شکاری عورتیں (۱۹۵۵)

بغیر اجازت (۱۹۵٦) رتی ماشہ تولہ (۱۹۵٦)

دستیاب افسانوں کی تعداد : ۲۳۳

ڈراموں کے مجموعے : آؤ (۱۹۴۰)، جنازے (۱۹۴۲)

تین عورتیں (۱۹۴۲)، افسانے اور ڈرامے (۱۹۴۳)

منٹو کے ڈرامے (۱۹۴۴)

مضامین : منٹو کے مضامین (۱۹۴۲) تلخ ترش اور شیریں (۱۹۴۸)

اوپر نیچے اور درمیان (۱۹۵۴)

ناولٹ : بغیر عنوان کے (۱۹۵۴)

خاکے : گنجے فرشتے (۱۹۵۲) لاؤڈ اسپیکر (۱۹۵۵)

فلمی کہانیاں : ‘کسان کنیا’ ‘چل چل رے نوجوان’ ‘شکاری’ ‘ٹُد’

‘آٹھ دن’ ‘مرزا غالب’ (ہندوستان)

‘بیلی’ ‘دوسری کوٹھی’ (پاکستان)

وفات : ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵

تدفین : قبرستان میانی صاحب (لاہور)

☆☆☆

Indian/Pakistani Penal Code(XLV of 1860)--Section 292:

' OBSCENE '--Defination :

Outline of story innocuous yet details may be obscene---obscenity to be determined with reference to standards current in society in which words are uttered or published----intention of author---whether material in determining obscenity.

"**ٹھنڈا گوشت**' ایک سچی تصویر ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ بڑی ہی بھیمانہ صاف گوئی ہے۔ اس میں ایک نفسیاتی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اگر اس میں کہیں گندگی اور غلاظت ہے تو اسے مصنف کے ساتھ نہیں، افسانے کے کرداروں کی ذہنی سطح کے ساتھ منسوب کرنا چاہیے ..... کسی تحریر کے چند الفاظ اگر چمٹے سے اٹھا کر لوگوں کو دکھائیں جائیں کہ یہ فحش ہیں تو اس سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو گا۔ ان الفاظ کی جدا گانہ اشاعت قابلِ گرفت ہوسکتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے غالبؔ، میرؔ، ارسٹوفین، چاسر، بوکیشیو، بلکہ کتابِ مقدس تک کے بعض مقامات کو قابل تعزیر گردانا جاسکتا ہے، تاہم کسی تحریر کو سمجھنے کے لیے اسے مجموعی طور ہی سے دیکھنا پڑے گا۔"

(فحاشی کے مقدمے میں منٹو کا دفاعی بیان)

منٹو کا فن اور نظریۂ فن

اردو افسانے کا ارتقائی سفر کلاسیکی نثری و شعری اصناف کی بہ نسبت کافی تیز اور ہنگامہ خیز رہا ہے۔ حالانکہ افسانہ مغرب سے مستعار تھا لیکن ابتدائی غیر پابند تراجم اور رومانوی قسم کے ماخوذ موضوعات کو اگر استثنائی زمرے میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانے کی فضا اور موضوعات، ابتدا ہی سے مقامی عناصر پر مشتمل رہے ہیں۔

پریم چند اردو اور ہندی کے اولین کہانی نویس تھے جنہوں نے افسانے کو حقیقت نگاری قوم پرستی اور دیگر عصری سماجی محرکات سے آشنا کیا۔ ان کے آخری دور کے افسانوں اور ناولوں میں قوم پرستی اور حقیقت پسندی کے رنگ زیادہ گہرے ہوتے گئے تھے۔ پریم چند کے افسانوں میں ایک نیا رجحان جنس کے بارے میں ان کا تبدیل شدہ آزادانہ رویہ بھی واضح ہونے لگا تھا۔

۱۹۳۰ کے آس پاس پروفیسر مجیب، جلیل قدوائی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اپنے روشن خیال نقطہ ہائے نظر کے زیر اثر ٹالسٹائی اور چیخوف وغیرہ کے افسانوں کے تراجم اردو میں شائع کرانے شروع کئے۔ ان مترجمین کا مقصد بہترین روسی فن پاروں کو اردو میں متعارف مائل کرنا تھا۔

۱۹۳۲ میں 'انگارے' کی اشاعت نے بلاشبہ دنیائے شریعت کے علاوہ دنیائے افسانہ میں بھی ایک آگ سی لگادی تھی۔ 'انگارے' کے افسانوں میں لہجے کی جو سرکشی، مفاد پرست مذہبی اداروں کے خلاف جو گستاخانہ تندی اور زبان و بیان کی جو تلخی دہک رہی تھی اس نے اچھا خاصہ طوفان بپا کردیا۔ گو کہ 'انگارے' کی اکثر کہانیاں فنی طور پر پختہ نہیں تھیں لیکن اس مجموعے کی اصل دین مستقبل کے افسانے میں نہایت بنیادی قسم کی تبدیلیاں لانے میں ظاہر ہوئی۔ 'انگارے' سے قبل پریم چند کا افسانہ اپنے سیاسی شعور اور حقائق کی تصویر کشی میں بلند ترین مدارج حاصل کر چکا تھا۔ لیکن ان کی تحریروں پر آخر دم تک قدیم طرز کی اخلاقیات کی چھاپ قائم رہی۔ جب کہ 'انگارے' کے افسانوں نے' جہاں ایک طرف اس کلاسیکل بورژوا اخلاقیات کے ڈھانچے کو منہدم کیا، وہیں دوسری طرف ممنوعہ سمجھے جانے والے جنسی مسائل اور الجھنوں کو بڑے حوصلے اور وضاحت کے ساتھ مرکزِ بحث میں لا کھڑا کیا اور تیسری طرف تکنیک کی سطح پر شعور کی رو اور داخلی خود کلامی کے تجربات سے فکشن کو آشنا کیا۔ یہی وہ جدید ادبی عناصر تھے جن پر ترقی پسند افسانے کی بنیاد قائم ہوئی۔

(۱)

'انگارے' کی اشاعت کے زمانے کے برصغیر میں غلامی کے خلاف نفرت، فاشزم کے پھیلتے ہوئے سایوں کے خلاف فکرمندی اور روشن خیالی کے جذبات ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانش وروں کے درمیان اس قدر عام ہو گئے تھے کہ سجاد ظہیر وغیرہ نے ایک باقاعدہ تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اور پھر اپریل ۱۹۳۶ میں لکھنؤ میں باقاعدہ طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی گئی۔ انجمن کے رہنما اصول کچھ اشتراکی فکر کے حامی ادیب و شاعر وضع کرتے تھے لیکن انجمن میں ان ادیبوں کی شرکت بھی کافی تھی جو اشتراکی تو نہیں تھے لیکن سیاست، ادب ثقافت اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں ایک روشن خیال، اور حساس نظریہ ضرور رکھتے تھے۔ انجمن کے فروغ کے لیے اطراف و جوانب کی فضا اس قدر سازگار تھی کہ ملک کے بڑے حصے میں انجمن کی شاخیں قائم ہونے لگیں، مختلف زبانوں اور فنون سے وابستہ ادیب و فنکار ترقی پسندی کو فطری

طور پر قبول کرتے گئے۔ اس قبولِ عام کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ابتدائی دور کی ترقی پسندی کا تصور کافی وسیع اور لبرل تھا۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال جیسے اسلامی مفکر کے سامنے جب سجاد ظہیر اور کنور محمد اشرف نے ترقی پسند تحریک کے بنیادی تصورات پیش کیے تو انہوں نے ان دونوں اشتراکی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی:

> ”ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے ملتے رہئے۔“

لکھنؤ کے بعد ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کئی کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ ان میں زیادہ تر ملک کی آزادی فاشزم کے خطرے اور ہٹلر کے عروج وغیرہ عصری مسائل پر سامراج مخالف موقف اختیار کیا گیا۔

۱۹۳۹ میں لکھنؤ سے جب ترقی پسند مجلّہ ’نیا ادب‘ جاری کیا گیا تو اس کے اداریے میں نئی تخلیقات میں ’انگارے‘ ’انقلاب‘ ’طوفان‘ ’خون‘ اور ’باغی‘ وغیرہ آتشیں الفاظ کی کثرتِ استعمال پر فکر مندی ظاہر کی گئی اور پرانے شعر و ادب کی صالح روایات کا احترام کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

اس اداریے کی تحریر کا پس منظر یہ تھا کہ ترقی پسند کے نام پر جذباتی ابال اور خام قسم کی انقلابیت کے نمونے تحریروں اور تقریروں میں اکثر دکھائی دے رہے تھے کیونکہ اکثر نئے ترقی پسندوں نے سیاست، ثقافت، روایت، اور تجربے کی اکہری تشریح کو ہی ماویٰ و ملجیٰ سمجھ لیا تھا۔

اس دور کا ایک دوسرا نزاعی سوال ’ترقی پسند ادب‘ اور ’نئے ادب‘ کے درمیان کی حد بندی کا تھا۔ جوش و خروش کی فضا میں بہت سے وہ ادیب بھی ترقی پسندوں کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے جو ترقی پسند نظریے کے اساسی تصورات —— ادب کی افادیت، ادیب کے سیاسی شعور اور ادیبوں کی تنظیم بندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مثلاً حسن عسکری اور میراجی وغیرہ، جو مغرب کے غیر ترقی پسند رجحانات جیسے اشاریت اور اظہاریت کے پیروکار تھے اور ادیبوں کے لیے جاری کیے گئے احکام کو ادیب کی آزادی کے لئے سمِ قاتل سمجھتے تھے۔ اس مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے جعفر علی خاں اثر نے اعلان کیا کہ ”ادب کا اصل مقصد جمالیاتی حظ ہے۔“

اُس وقت جن تخلیقات کو ’نیا ادب‘ کا اعلان دیا جا رہا تھا ان میں ’انگارے‘ کی اشاعت

کے اثرات سے جنسی اظہار کے کچھ واشگاف نمونے بھی سامنے آنے لگے تھے، جن کو کچھ قدامت پرستوں نے عریاں اور فحش قرار دے ڈالا۔ ابتداً سعادت حسن منٹو، میراجی اور ن۔ م۔ راشد وغیرہ کو ترقی پسندوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا، اس لیے کچھ حلقوں نے ان کی تخلیقات کے جنسی عناصر کو متبدل تحریروں کے زمرے میں رکھا۔ احتشام حسین نے پہلی بار 'نیا ادب' اور 'ترقی پسند ادب' کے درمیان تفریق قائم کی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہر نئی تحریر اور تجربے کو ترقی پسندی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہیں سے حسن عسکری، منٹو، ن۔ م۔ راشد، میراجی اور ممتاز مفتی وغیرہ نظریاتی اور عملی طور پر ترقی پسند تحریک اور فکری دھارے سے الگ ہو گئے یا الگ کر دیئے گئے۔ ادب میں فحاشی کے خلاف ۱۹۴۵ کی اردو کانفرنس حیدرآباد میں ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ نے ایک قرارداد پیش کی کہ نئی تخلیقات میں فحاشی اور عریانی کے جو رجحانات سامنے آرہے ہیں وہ ترقی پسند کے ترقی کے فلسفے اور فکر کے منافی ہیں۔ کیونکہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن فحاشی کے خلاف ہے اور ادب میں اس کے اظہار کو غیر صحت مند مضر سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر علیم کی اس تجویز کی مخالفت میں قاضی عبدالغفار نے کہا کہ اس تجویز کو پاس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور انجمن کو محتسب کا کردار ادا کرنے سے بچنا چاہیے۔ جنس کے موضوعات پر بھی فنی تخلیق کی جاسکتی ہے۔ لیکن تخلیق کار کا رویہ تعمیری اور ترقی پسندانہ ہونا چاہیے۔ جو انسانی زندگی کے اہم مسائل میں سے ایک ہے اور ڈاکٹر علیم کی قرارداد سے یہ غلط فہمی پھیل سکتی ہے کہ ترقی پسند ادیب اس موضوع اور زندگی کے اس پہلو کو اپنی تحریروں سے خارج کرلیں۔ حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار وغیرہ کی مخالفت کی بنا پر یہ قرارداد پاس نہیں ہوئی۔ اس موقعے پر حسرت نے دلچسپ اعلان کیا کہ ”ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسناکی کا اظہار کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“

۱۹۴۵ تک آتے آتے فحاشی اور عریانی کے سوال پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا موقف واضح ہو چکا تھا کہ جنس اور جنسی اعضا کا ذکر شعر و ادب میں بذاتِ خود معیوب نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ یہ انسانی فکر اور داستانِ حیات کا ایک لازمی اور قابل قدر باب ہے۔ لیکن یہ بھی ملحوظ نظر رکھا جانا چاہیے کہ جنسی اعمال و افعال کا فن پارے میں ذکر اس وقت ناپسندیدہ ہو جاتا ہے، جب تلذذ کے لیے استعمال کیے جانے کے لائق ہو ترقی پسند ناقدین ______ بالخصوص سردار

جعفری، منٹو کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی صرف ان تحریروں یا ان تحریروں کے ان گوشوں کو 'مریضانہ' قرار دیتے تھے۔ جہاں ان کے مطابق زبان و اظہار کی سطح پر منٹو سے زیادہ معیاری برتاؤ کی امید کی جا سکتی تھی۔ ترقی پسندوں سے منٹو کے ذاتی مراسم تھے اور احمد ندیم قاسمی تو تقریباً ان کے مداح تھے۔ عزیز احمد (ترقی پسند ادب: ۱۹۴۱-۴۲) نے اپنے اخلاق پرستانہ رویے کے تحت منٹو، عصمت چغتائی، حسن عسکری اور ممتاز مفتی وغیرہ کے چند جنسی افسانوں ——— دھواں، بلاؤز، لحاف، پھسلن، اور 'جال' وغیرہ کو فحش اور سستے جذباتی افسانے قرار دیا اور لکھا تھا:

> "ممکن ہے کوئی ادیب یا ادیبہ یہ فرمائیں کہ یہ معاشرت کے ناسور ہیں ہم ان ناسوروں کا دکھا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ناسور کا کوئی علاج آپ کے پاس ہو تو ایک بات بھی ہے، علاج بتائیے ناسور دکھا کے کیا کیجیے گا۔"

ظاہر ہے کہ عزیز احمد کا رویہ کافی قدامت پسندانہ اور تحکمانہ تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب عزیز احمد خود ناول لکھتے ہیں تو جسمانی تلذذ کے بیان اور عریاں نگاری میں عصمت اور منٹو کو میلوں چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ عزیز احمد منٹو کا ذکر ترقی پسندوں کے زمرے ہی میں کرتے ہیں۔ حالانکہ منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ کے افسانوں کی تنقید میں عزیز احمد کا موقف کافی حد تک دقیانوسی تھا لیکن ترقی پسندی اور جنسی اظہار کے سوال پر ان کا موقف کافی معتدل ہے:

> "صحیح ترقی پسندی کے لیے جنس کا موضوع اسی حد تک جائز ہے، جب تک یہ صحت مندانہ اور اصلاحی ہو۔ جب ادب مریضانہ جنس پرستی میں مبتلا ہو جائے تو وہ رجعت پسند ہو جائے گا۔ مریضانہ جنس پرستی کا رجحان ترقی پسند ادب میں بالعموم بڑھتا جا رہا ہے، وہ ایک صحت مضر عنصر ہے اس کی بنیاد راہ گم کردہ رومانویت پر ہے۔"

تاہم عزیز احمد نے منٹو کے ساتھ انتہا پسندانہ رویے سے کام لیتے ہوئے 'ترقی پسند ادب' میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ——— "جنس نے سعادت حسن منٹو کے یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے۔" جو منٹو کے بارے میں جلدی میں کیا گیا غیر ادبی فیصلہ نظر آتا ہے۔ جنس کے بارے میں اپنے طرزِ فکر کی وضاحت کرتے ہوئے منٹو نے اپنے ایک مضمون 'مجھے کچھ کہنا ہے' میں لکھا تھا کہ:

> ''زیادہ تر جنسی مسائل آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں؟' اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ عجیب و غریب قسم کے اضداد کا زمانہ ہے۔ عورت قریب بھی ہے اور دور بھی، کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے کہیں سر سے پیر تک ستر۔ کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے، کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔ دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ہندوستان میں جہاں آزادی کا ننھا منا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے، ایک افراتفری سی مچی ہے۔ اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں، کبھی اس مسئلے سے۔''

یہاں یہ بات اہم ہے کہ عزیز احمد کی طرح سردار جعفری نے بھی منٹو کی کچھ تحریروں کے سلسلے میں کافی متشدد رخ اپنایا تھا، لیکن یہی انتہا پسندی انہوں نے عصمت چغتائی کے ساتھ بھی 'ترقی پسند ادب' (۱۹۵۲) میں برتی تھی:

> ''سعادت حسن منٹو 'گورکی' کے ترجمے کرنے اور 'نیا قانون' جیسی کہانی لکھنے کے بعد بڑی تیزی سے انحطاط کی طرف جا رہے تھے اور سنسنی خیز، فحش اور گندی کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ عصمت چغتائی نے بھی اپنی بغاوت کے لیے جنسیات ہی کا انتخاب کیا اور کبھی 'گیندا' کی طرح کی اچھی اور کبھی 'لحاف' کی طرح بُری کہانیاں لکھیں۔ نئے لکھنے والوں میں اور بھی بہت سے ادیب اس قسم کی مریضانہ جنس نگاری کو حقیقت نگاری سمجھ کر پیش کر رہے تھے یہ تمام چیزیں ترقی پسند ادب کے ساتھ کچھ اس طرح مل گئیں کہ ہر نیا ادب ترقی پسند قرار پا گیا اور ہر نئی تحریر ترقی پسند ادب کا نمونہ۔''

منٹو کی تحریروں کے ضمن میں حیدر آباد اردو کانفرنس (۱۹۴۵) سجاد ظہیر نے کہا تھا کہ ''ہمیں ہر ادیب پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے اور کھوٹے کھرے کو الگ الگ کرنا چاہیے اور اس ادبی بددیانتی سے بچنا چاہیے جو صرف چند لچر چیزوں کا انتخاب کرکے کسی ادیب یا شاعر کو قابلِ ملامت قرار دے دیتی ہے۔ بعض ایسے افسانہ نگار اور شاعر ہیں جن کی تحریروں میں بیک وقت کئی رجحانات ملتے ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو یہ اردو کے ایک نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں اور

جب کہوں گا کہ ان کے چند افسانے ہمارے ادب کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے بعض افسانے خراب ہیں بعض رجعت پسند تک ہیں۔" (ترقی پسند ادب، ۱۹۵۲، ص ۱۹۶)

شہزاد منظر نے منٹو کو 'غیر شعوری ترقی پسند' اور کرشن چندر کو 'شعوری ترقی پسند' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ شعوری ترقی پسندی وہ ہے جس کے تحت ترقی پسند ادیب انقلابی نظریے کو قبول کرتا ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے کو تبدیل کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف غیر شعوری ترقی پسندی وہ ہے جس کے تحت ادیب معاشرتی برائیوں، ظلم، استحصال اور سماجی ناانصافیوں کو محسوس کرتا اور اس کی عکاسی کرتا ہے لیکن وہ سماجی ارتقا اور تبدیلی کے قانون سے واقف نہیں ہوتا۔

عزیز احمد اور سردار جعفری وغیرہ کی انتہا پسند ترقی پسندی کے جواب میں سعادت حسن منٹو بھی نچلے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ جب عزیز احمد کی کتاب 'ترقی پسند ادب' شائع ہوئی اس زمانے میں منٹو فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے، بطور افسانہ نگار معروف ہو چکے تھے اور معاشی طور پر کافی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ 'ادب جدید' کے موضوع پر بمبئی کے ایک کالج میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۴۴ میں انھوں نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے، کچھ ترقی پسندوں پر طنز و تعریض کی تھی:

> "آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ وہ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غیر مطمئن ہے۔ اس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے۔ اور کیوں نہ رہے؟ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے؟"

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو کے ذہن میں نہ ترقی پسندی کا مفہوم واضح تھا اور نہ ہی ترقی پسند ادب اور نئے ادب کے درمیان کے فرق کو وہ پوری طرح سمجھ پائے تھے۔ تاہم

ان کا یہ قول کافی درست تھا کہ اس دور کا ادب اپنے اطراف و جوانب سے کافی غیر مطمئن تھا۔ اسی غیر اطمینان بخش صورت حال نے ترقی پسندی اور نئے ادب کی تحریکات کو جنم دیا تھا۔

(۲)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منٹو کا ادبی نظریہ کیا تھا؟ یہ حقیقت ہے کہ وہ ابتداً سوشلزم کی طرف مائل تھے۔ باری کے اثرات سے خود کو 'کامریڈ' اور 'مفکر' بھی لکھنے لگے تھے، لیکن یہ سلسلہ صرف ان کی تحریروں کے ابتدائی دور تک محدود رہا۔ منٹو کی زندگی کا علمی پہلو زیادہ وسیع نہیں تھا، ادب عالیہ کے بہت زیادہ نمونے ان کی نظر سے نہیں گزرے تھے، عالمی و قومی سیاست کا ان کا مشاہدہ عمیق نہیں تھا، خود پرست اس حد تک تھے کہ نئے رجحانات اور جدید ترین تصورات سے تاثر قبول کرنا ان کے مزاج کے منافی تھا۔ چنانچہ ان کا جو نظریۂ ادب تشکیل ہوا وہ بہت واضح نہیں تھا۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ اول تا آخر وہ ایک ادیب تھے، عمل اور نظریے کی سطح پر قدامت پسندی اور روایت پرستی سے بہت دور تھے۔ انسانوں کے درمیان متعصبانہ تفریق کرنے والے کسی بھی فلسفے یا ازم کا ماننا ان کی سرشت کے خلاف تھا۔ اسی لیے ان کا جو سیاسی۔ ادبی نظریہ مرتب ہوتا ہے وہ ایک روشن خیال، انسان دوست اور روایت شکن ادیب کا ہے۔ وہ باقاعدہ ترقی پسند بھی نہیں رہے، بلکہ کئی بار ترقی پسند اکابرین سے صف آرا بھی ہوئے۔ انفرادیت پسندی اور خود پرستی مزاج میں ہمیشہ شامل رہی۔ اسی لیے اس طرح کے بیانات بھی بلا تکلف دے دیا کرتے تھے:

> ''مجھ سے کوئی پوچھے منٹو تم کس جماعت میں سے ہو، تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہوگا، میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔''

لیکن اس طرح کی مبالغہ آرائی اور خود پرستی کے باوجود منٹو ادب کو اپنے اطراف و جوانب کے معاشرتی عوامل کی پیداوار مانتے تھے اوور اپنے عہد میں ہونے والے منفی و مثبت سماجی تغیرات سے مکمل طور پر باخبر بھی تھے۔ مضمون بعنوان 'ادب جدید' (۱۹۴۴) میں لکھا تھا:

> ''زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ آج اُس نے جو کروٹ بدلی ہے، اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اگلنا بالکل بیکار ہے۔ وہ لوگ جو ادب جدید کا، ترقی پسند ادب کا، فحش ادب کا، یا جو

> کچھ بھی یہ ہے، خاتمہ کردینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کردیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں...... زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کرسکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔“

منٹو کے تخلیقی سفر میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ وہ محمد حسن عسکری کے ترقی پسند مخالف خیمے میں شامل ہو گئے۔ عسکری کی فرانسیسی طرز کی رمزیت اور اسلامی طرز کی مذہبیت منٹو کے لبرل طرزِ فکر اور آزاد مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ عسکری ’ساقی‘ میں کئی دفعہ پاکستان میں صرف اور صرف اسلامی ادب کی گنجائش کا فتویٰ دے چکے تھے۔ پاکستان میں جب محمد حسن عسکری، صمد شاہین، محمد دین تاثیر الطاف حسین اور شورش کاشمیری وغیرہ مملکتِ پاکستان سے ادیبوں کی وفاداری کا شرانگیز سوال اچھال رہے تھے، اس وقت بھی منٹو، ذہنی اور نظریاتی طور پر اس قسم کے عصبیت آمیز نظریات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، حالانکہ ترقی پسندوں سے ان دنوں منٹو کے مراسم خوشگوار نہیں تھے۔ اپنے مضمون ’زحمتِ مہرِ درخشاں‘ میں انہوں نے سوال اٹھایا تھا:

> ”کیا پاکستان کا ادب علیحدہ ہوگا؟ اگر ہوگا تو کیسے ہوگا؟ وہ سب کچھ جو سالم ہندوستان میں لکھا گیا تھا اس کا مالک کون ہے؟ کیا اس کو بھی تقسیم کیا جائے گا؟ کیا ہندوستان اور پاکستان کے بنیادی مسائل ایک جیسے نہیں؟ کیا اُدھر اردو بالکل ناپید ہو جائے گی؟ یہاں پاکستان میں اردو کیا شکل اختیار کرے گی؟ کیا ہماری اسٹیٹ مذہبی اسٹیٹ ہے؟ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت مین وفادار رہیں گے۔ مگر کیا ہمیں حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی؟ آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہدِ حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے؟“

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ منٹو ادب کی کسی جغرافیائی، مذہبی یا سیاسی توضیح سے بطور تصور ہی متفق نہیں تھے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ان کے لیے ایک بڑی اور تاریخی ثقافتی

وحدت کا حصہ تھے۔ دونوں خطوں کے معاشی وثقافتی معاملات وامور بھی بنیادی طور پر مماثل تھے اور خود ان کی تخلیقی زبان، یعنی اردو کے بہترین ادیب اور شاعر، سرحد کے دونوں جانب موجود تھے جن کو ایک مصنوعی سیاسی نظریے نے زبردستی دو نیم کردیا تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے ۱۹۴۷ کا ذکر کہیں بھی آزادی کے عنوان سے نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ تقسیم اور فسادات کے حوالے سے کیا ہے۔ تقسیم نے ان کے احباب کو دو متصادم جغرافیائی وحدتوں میں منقسم کردیا، لیکن یہ جغرافیائی تفریق منٹو کو ذہنی وجذباتی طور پر قبول نہیں تھیں۔ ان کے دوست باریؔ، احمد ندیم قاسمی، حسن عباس، ابوسعید قریشی، نصیر انور اور محمد طفیل اگر سرحد کے اُدھر تھے تو شیام، عصمت چغتائی اور اشوک کمار وغیرہ سرحد کے اِدھر رہ گئے تھے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ منٹو ایک سیاسی آدمی نہیں تھے۔ ترقی پسندی کی آزادیٔ فکر، روشن خیالی اور ہم مشربی نے ان کو ابتداً راغب کیا۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کے رہنماؤں کے عائد کردہ REGIMENTATION سے اکتا کر وہ غیر سیاسی ادیبوں کی طرف مائل ہونے لگے۔

پاکستان میں جب مذہب نواز گروپوں نے ترقی پسندوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کی تو حکومت کے احتسابی ادارے ذرائع ابلاغ سے وابستہ بہت سے افراد اور نوزائیدہ مملکت خداداد کے اسلامی تشخص کے حامی چند ادیب بھی اس مہم میں شامل ہوگئے، ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۴ تک انجمن سے وابستہ ادیبوں کی گرفتاریوں، سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعے بائیکاٹ اور مذہبی رہنماؤں کے مخالفانہ فتوؤں کا سلسلہ جاری رہا، جو آخرکار وسط ۱۹۵۴ میں ترقی پسند انجمن پر باقاعدہ پابندی کی شکل پر منتج ہوا۔

جب ۱۹۴۷ میں محمد حسن عسکری نے 'اسلامی ادب' کا نعرہ لگایا تو منٹو جیسا کشادہ ذہن اور وسیع المشرب ادیب بھی اس کا شکار ہوگیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرکاری وغیر سرکاری گھیرابندی کے ردعمل کے طور پر نومبر ۱۹۴۹ کی لاہور کانفرنس میں کچھ حکومت نواز رسائل اور ادیبوں کے بائیکاٹ کی قرارداد پاس کی گئی اور اس میں منٹو کو رجعت پسند مصنفین کی صف میں شامل کردیا گیا۔ کیونکہ منٹو کے 'سیاہ حاشیے' (۱۹۴۷) کو پاکستان اور ہندوستان، ہر دو ممالک کے ترقی پسند اکابرین نے بے دردانہ اور بہیمیت آمیز لطیفے قرار دیا تھا —— ہندوستان

میں بھی اس زمانے میں سرکردہ ترقی پسندوں کی گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں، جن کے پس منظر میں مئی ۱۹۴۹ میں بھیمڑی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں لاہور کانفرنس کی طرز کے انتہا پسندانہ فیصلے کیے گئے تھے۔

'اسلامی ادب' کی مہم کو فروغ دینے اور ترقی پسندوں کے خلاف تحریری محاذ بنانے کے لیے محمد حسن عسکری نے جولائی ۱۹۴۷ میں دو ماہی 'اردو ادب' جاری کرنے کا اعلان کیا تو مدیروں میں منٹو کا نام بھی شامل تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''میں ۱۹۴۷ میں انجمن ترقی پسند مصنفین، پنجاب کا سکریٹری تھا۔ منٹو کے ہاں میں جب بھی گیا وہاں محمد حسن عسکری کو موجود پایا۔ عسکری ترقی پسند ادب کی تحریک کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ روشن خیال منٹو کو فرانس کے منفیت پسندوں اور لایعنیت نوازوں سے متاثر کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ میں نے پشاور سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے 'سنگِ میل' میں منٹو کے نام ایک کھلا خط لکھا۔''

۱۵؍ستمبر ۱۹۴۸ کو لکھے گئے اس کھلے خط میں احمد ندیم قاسمی نے 'اردو ادب' کی ادارت میں منٹو کی شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اردو کے تمام زندہ افسانہ نگاروں میں منٹو کی فنی اور شخصی انفرادیت نمایاں ترین ہے۔ اس کی شخصیت کا کسی دوسرے پیکر میں مدغم ہونا غیر ممکن ہے، اور اس کے فنی نظریات کچھ ایسے کٹیلے اور جاندار ہیں کہ محمد حسن عسکری کی ماورائیت انہیں ہضم کرنے کے لیے ترقی پسندی ہی کا چورن استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔''

قاسمی کے مطابق یکم اگست ۱۹۴۸ کو ہاجرہ مسرور کے نام منٹو کا ایک خط آیا تھا جس میں اردو ادب میں اشاعت کے لیے ان سے ان کی نگارشات طلب کی گئی تھیں اسی خط میں اردو ادب کی پالیسی ان الفاظ میں بیان کی گئی تھی:

> ''یہ رسالہ کسی مخصوص مدرسۂ فکر کا پابند نہیں ہے۔''

لیکن حسن عسکری کا ترقی پسندی دشمن رویہ اور ان پر منٹو کی فنی عظمت کا یک بیک

انکشاف، ظاہر کرتا تھا کہ اردو ادب کی پالیسی ترقی پسندی کے موافق نہیں رہے گی۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ منٹو کو اپنی مہم میں شامل کرنے کے لیے محمد حسن عسکری نے ۱۵ راگست ۱۹۴۸ کے 'امروز' میں تحریر کیا تھا:

> "منٹو کے افسانوں میں پہلے مجھے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اب جب وقت نے کھرا کھوٹا الگ کرنا شروع کر دیا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں منٹو ہی ایک ایسا آدمی تھا جسے براہ راست انسانی دماغ اور اس کی کیفیت سے دلچسپی تھی۔"

عسکری صاحب، صمد شاہین اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ نے جب پاکستان کی ریاست سے ادیبوں کی خودمختاری، کشمیر کی جنگ کے بارے میں ترقی پسندوں کے موقف اور نوزائیدہ مملکت کی ثقافت کے سرچشموں پر بحث اٹھائی تو سب سے پہلے عسکری صاحب نے اعلان کیا کہ:

> "پاکستانی ادیب اب اس مہم کا آغاز کرنے والے ہیں کہ جن اقدار اور تصورات کا نام پاکستان ہے، انہیں افسانے اور نظمیں لکھ کر خود سمجھیں اور دوسروں کو سمجھنے کا موقع دیں۔ ہم صرف اس طرح پاکستان کے استحکام میں مدد دے سکتے ہیں۔"

احمد ندیم قاسمی نے مستقبل کے رجحانات کا اندازہ لگاتے ہوئے جریدہ منٹو کو حسن عسکری وغیرہ کے ہاتھوں استعمال ہونے کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے 'سنگِ میل' میں شائع شدہ کھلے خط میں درخواست کی تھی:

> "آپ کے ہاتھ میں ایک آتشیں قلم اور آپ کے ذہن میں ایک شدید جذبہ ہے۔ اس جذبے اور اس قلم کا خوشگوار تعاون آپ کو جبھی میسر آسکتا ہے جب آپ زندگی کے عکاس اور نباض رہیں (جیسا کہ آپ اب تک ہیں)۔ آپ کی ذات سے پاکستان کو ان گنت توقعات ہیں۔ اس تعمیری دور میں ادب برائے ادب کی افیون سے بچیے۔ 'اردو ادب' ضرور نکالیے مگر ایک معین نظریے کے ساتھ۔ حسن عسکری سے ضرور تعاون کیجیے مگر ان کے نظریات کو مشرف بہ زندگی کرنے کے بعد...... اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی جن سرگرمیوں سے آپ کو شکایت ہے، ان کا برملا اظہار

کیجئے۔ انجمن کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیے۔"

اس خط میں قاسمی مرحوم نے مزید لکھا تھا کہ حسن عسکری کی تنقید کی چٹان سے اچانک منٹو کے فنی کمالات کا جو فوارہ بلند ہوا ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ عسکری کو منٹو سے ایک ضروری کام لینا ہے۔ اور وہ کام ہے ترقی پسندوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کا۔ کیونکہ عسکری کے سیاسی نظریات کمیونسٹ ادیبوں سے مختلف رہے ہیں اور وہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی ان کا ڈھنڈورا پیٹتے چلے آ رہے ہیں!

احمد ندیم قاسمی کے کھلے خط کا ردعمل منٹو کے یہاں ہوا اور اس طرح ہوا:

> "منٹو میرا یہ خط پڑھے بغیر، غصے میں بھرا ہوا میرے ہاں آیا۔ اس نے اندر کمرے میں بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ دروازے پر ہی کھڑے کھڑے اس نے اپنی چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے مجھے کھلا خط لکھا ہے نا احمد ندیم قاسمی، میں تمہارے نام بند چٹھی لکھوں گا۔ میں نے کہا کہ آپ جو چاہیں لکھیں مگر کیا آپ نے میرا یہ خط پڑھا بھی ہے؟ معلوم ہوا کہ اس نے خط تو نہیں پڑھا مگر اسے اس کے بعض دوستوں نے بتایا ہے کہ میں نے اس خط میں اس کے خلاف زہر اگلا ہے۔"

تاہم منٹو کی یہ غلط فہمی عارضی ثابت ہوئی۔ انہوں نے ندیم کا خط پڑھا، جو کافی متوازن اور اس میں جابجا منٹو کی فنی عظمت کا اعتراف کیا گیا تھا۔ پورا خط پڑھنے کے بعد منٹو نے اپنا ردعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا:

> "مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو کہ میں عسکری کی منفعت پسندی کے وعظ یا تمہارے ترقی پسندی کے لیکچر سے متاثر اور مرعوب ہو سکتا ہوں۔ میں وہی لکھتا رہوں گا جو میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ عسکری شریف آدمی ہے۔ دروازے پر آواز آتی ہے۔ "میاؤں" یعنی میں آ جاؤں؟ کچھ دیر وہ میری کسی ننھی بچی سے لاڈ پیار کرتا ہے۔ پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے "میاؤں" "یعنی میں جاؤں! —— اور تم کہہ رہے ہو وہ مجھے بھنکار رہا ہے!"

منٹو اور ترقی پسندوں کے درمیان کی یہ رسہ کشی اور سرد مہری دو تین سال تک چلتی

رہی۔ ۱۹۴۹ کے بعد کے سالوں میں کئی ترقی پسند ادیب گرفتار کیے گئے۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کی گئی، کچھ لوگ راول پنڈی سازش کیس میں چار سال تک نظر بند رہے۔ حکومت کے ان اقدام سے حسن عسکری وغیرہ کا مقصد بھی پورا ہو گیا اور ترقی پسندوں کے مخالفین بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ پرجوش ترقی پسند ادیب رفیق چودھری فحاشی کے الزام میں ملوث ہوئے تو منٹو نے مقدمے کے جج مہدی علی صدیقی سے سفارش کر کے ان کو بری کرایا۔ احمد ندیم قاسمی احمد راہی، فیروز دین منصور، عبداللہ ملک اور حمید اختر وغیرہ ترقی پسندوں سے ان کے دوستانہ مراسم ہمیشہ ہی رہے۔ ویسے بھی منٹو کی فکری ساخت کسی بھی طرح حسن عسکری کے طرز کی 'پاکستانی روحانیت' سے میل نہیں کھاتی تھی۔ ان کے پرانے دوست دیوان سنگھ مفتون نے ان کے عقیدے کے بارے میں لکھا تھا کہ:

> ”منٹو مذہباً مسلمان تھے۔ مگر میں نے اُن سے مذہب کے متعلق بھی کوئی بات نہیں سنی۔ وہ ایسے ہی مسلمان تھے جیسے میں سکھ۔ خیالات کے اعتبار سے وہ نیم کمیونسٹ تھے۔“

یہی نہیں، جب ترقی پسند فکر کے حامی پاکستانی جریدوں 'نقوش' 'سویرا' اور 'ادبِ لطیف' کی طباعت و اشاعت پر پابندی عائد کی گئی اور بہت سے ترقی پسند ادیبوں —— احمد ندیم قاسمی، فیض، سجاد ظہیر، ابرہیم جلیس، ممتاز حسین، سبطِ حسن، عبداللہ ملک، حسن عابدی، ظہیر کاشمیری احمد راہی اور حمید اختر وغیرہ کو گرفتار کیا گیا تو منٹو نے ایک نہایت بے باکانہ طنزیہ مضمون بعنوان 'اللہ کا بڑا فضل ہے' لکھا، جس میں حکومت کی فنکار دشمنی اور آزادیٔ اظہار کا گلا گھونٹنے والی پالیسیوں کی واشگاف نکتہ چینی کی گئی تھی:

> ”شاعری کے آخری دور میں کچھ شاعر ایسے بھی پیدا ہو گئے تھے جو معشوقوں کے بجائے مزدوروں پر شعر کہتے تھے۔ زلفوں اور عارضوں کی جگہ ہتھوڑوں اور درانتیوں کی تعریف کرتے تھے —— اللہ کا بڑا فضل ہے صاحبان، کہ ان مزدوروں سے نجات ملی۔ کمبخت انقلاب چاہتے تھے۔ سنا آپ نے! تختہ الٹنا چاہتے تھے حکومت کا، نظام معاشرت کا، سرمایہ داری کا اور نعوذ باللہ ملاؤں کا۔ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ ان

> شیطانوں سے ہم انسانوں کو نجات ملی —— عوام بہت گمراہ ہو گئے تھے۔ اپنے حقوق کا ناجائز مطالبہ کرنے لگے تھے۔ جھنڈے ہاتھ میں لے کر لادینی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے......
>
> کوئی زمانہ تھا کہ سیکڑوں پرچے ادب کے نام پر شائع ہوتے تھے۔ ان میں لوگوں کا اخلاق بگاڑنے والی ہزاروں تحریریں آئے دن چھپتی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، ادب کیا بلا تھی —— ادب آداب سکھانے کی کوئی چیز ہوتی تو ٹھیک تھا، جو کہانیاں، افسانے، مضمون، نظمیں، غزلیں ادب کا نام لے کر چھاپی جاتی تھیں، ان میں نہ تو چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ مغرب زدہ لوگوں کو ڈھیلا لگانے کی ترکیب ہی بتائی جاتی تھی۔ یہ تو ایک بہت بڑا اور پاکیزہ فن ہے کہ آتے آتے ہی آتا ہے۔ لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ عوام کو داڑھی رکھنے لبیں کتروانے ہی کی طرف مائل کیا جاتا۔"

محولہ تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ادب وفن میں کسی طرح کی خارجی یا ریاستی دخل اندازی کو ناقابلِ قبول سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی غیر ملکیوں کی حکومت اور ہم وطنوں کی حکومت دونوں ہی کے ہاتھوں جبر اور احتساب کا شکار ہوتے رہے تھے۔ جن جرائد پر پابندیاں عائد کی گئیں ان میں خود ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی تھیں۔ جو ادیب اور شاعر زندانوں کی بھینٹ چڑھائے گئے تھے، ان میں سے زیادہ تر منٹو کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ شعر وادب میں نئے تجربات اور جدید اسالیب کا استعمال کرتے تھے، نظریاتی طور پر ہر طرح کی عصبیت اور تنگ ذہنی ان کی آزاد طبع کے منافی تھی اور فنکار کی آزادیٔ تحریر کے باب میں ہر طرح کی مداخلت کے مخالف تھے۔ مزید برآں وہ اپنے ملک میں موجود رجعت پسند گروپوں، دقیانوسی نظریات کے حامیوں اور مذہب کی آڑ میں شعر وادب کا محاسبہ کرنے والوں کو نہ صرف ادب اور ادیب کے لیے، بلکہ تمام معاشرے کی فطری اور آزادانہ نشوونما کے لیے مہلک سمجھتے تھے۔

ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ بہت طرح کے دباؤں کے درمیان جینے کے باوجود منٹو، اپنی فکر اور اپنے نظریات کو تحریر میں لانے سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے

کہ برسرِ اقتدار جمہوریت کش قوتوں سے نظریاتی طور پر غیر متفق ہونے سے جتنا بڑا خسارہ سعادت حسن منٹو نے اٹھایا، اتنا بہت سے ترقی پسند کہلائے جانے والے شاعروں اور ادیبوں نے نہیں اٹھایا —— مثلاً ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور اختر حسین رائے پوری، انجمن ترقی پسند مصنفین کی صف اول سے وابستہ رہ چکے وہ ادیب تھے جنہوں نے ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے، نہ صرف آئے دن تبدیل ہوتی ہوئی برسرِ اقتدار قوتوں کی حاشیہ برداری کی، بلکہ پروفیسر عتیق احمد کے الفاظ میں 'شاہ سے زیادہ وفادار شاہ' بننے کے چکر میں اپنے پرانے دوستوں اور نظریاتی پیروکاروں پر شخصی وذاتی حملے بھی کیے۔ دوسری طرف سعادت حسن منٹو تھے —— دوست داری اور وفاداری بشرطِ استواری جن کی سرشت کا حصہ تھیں اور جن کے ضمیر کا آئینہ بے داغ تھا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے بے خوف ہو کر لکھا اور کسی برسرِ اقتدار قوت یا حکومتی ادارے سے کسی قسم کی مالی منفعت حاصل نہیں کی۔

(۳)

منٹو کا بچپن اور نوجوانی خانگی دباؤں میں گزرے، لیکن اپنے ہم عصری کے معاشرتی نظامِ اقدار کے لحاظ سے یہ دباؤ کوئی غیر معمولی یا بہت زیادہ شخصیت کش نہیں تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ منٹو کا مزاج ہی بنیادی طور پر غیر مفاہمت پرستانہ روایت شکن اور باغیانہ تھا۔ جوئے خانے کی بیٹھک، بدنام لوگوں کی سنگت، شراب نوشی کا اولین تجربہ، نظامِ تعلیم سے عدم دلچسپی، مذہبی اداروں سے لاتعلقی، باغیوں اور انقلابیوں کی شخصیت پرستی اور روایتی گھریلو سانچوں میں جذب نہ ہونے کی ارادی کوشش وغیرہ سعادت حسن منٹو کی شخصیت کے وہ عناصرِ ترکیبی تھے جو واضح طور پر نشاندہی کر رہے تھے کہ ہندوستانی ادبیات کے افق پر ایک نیا اور روایت شکن نام اپنا مقام بنانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ اپنی ذہنی حالت کے بارے میں منٹو نے خود لکھا ہے:

> ''یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آوارہ گردی شروع کر رکھی تھی۔ طبیعت ہر وقت اچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھد بد ہر وقت دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے اسے چکھوں، خواہ وہ انتہائی درجہ کی کڑوی کیوں نہ ہو۔''

نئے پن کی تلاش اور روایت سے انحراف تا عمر منٹو کی فکر اور تخلیقی عمل کا خاصہ رہے ویسے بھی شعر و ادب کی دنیا روایت زدہ، مروجہ رسوم و آداب کے مقلد اور عرفِ عام میں مہذب، متشرع اور نجیب الطرفین قسم کے لوگوں کو مقاماتِ بلند عطا نہیں کرتی ہے۔ اپنے انہیں 'اوصافِ حمیدہ' کی فراوانی کی بنا پر حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال، کبھی سعادت حسن منٹو کے آئیڈیل نہ بن سکے۔ ماضی بعید کے بزرگوں میں ان کے آئیڈیل مرزا غالب اور ماضی قریب کے ادیبوں میں ان کے آئیڈیل آغا حشر کاشمیری اور اختر شیرانی تھے اور ہم عمروں میں منٹو کے پسندیدہ کردار تھے کوچوان، دلال، جسم فروش، چاقو باز، شرابی اور غنڈے وغیرہ جو اپنے زمانے کی سماجی تلچھٹ سمجھے جاتے تھے۔

سماج کے ناپسندیدہ عناصر کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنانے کے علاوہ، منٹو ترقی پسند تحریک کے اہم MOTTO —— حقیقت نگاری کو فن کی بنیادی شناخت بنانے پر اصرار کرتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو لکھا تھا:

"زندگی کو اسی شکل میں پیش کرنا چاہیے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ جیسی تھی یا جیسی ہوگی اور جیسی ہونی چاہیے۔"

تاہم سعادت حسن منٹو، عام ترقی پسندوں کی طرح ادب کو معاشرتی تبدیلی کو آلۂ کار بنانے یا اپنے اطراف و جوانب میں کارفرما استحصالی قوتوں اور رجعت پسند اداروں سے مجادلہ کرنے کے وژن سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا فن فرانس کے فطرت نگاروں —— فلابیئر، ژولا اور موپاساں کے وژن کے زیادہ نزدیک پہنچ جاتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کے تھیم کافی متنوع ہیں۔ تاہم ان کے موضوعات اور ان کے TREATMENT کچھ حدود ہیں، جن سے ایک ہوشیار فنکار کی طرح وہ باہر نہیں جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انجانی زمینوں اور نامونوس کرداروں کے درمیان بھٹکنے سے انہیں وہ فنیش بلندی نصیب نہیں ہوسکتی جس کے وہ جائز طور پر طلب گار تھے۔ منٹو کے فنی نظام کی اولین حد اس کی مدنی URBAN ساخت ہے۔ گاؤں دیہات، کاشتکاروں کے مسائل زمینداروں اور مزارعوں کے سماجی انسلاکات اور ذہنی و اقتصادی پسماندگی کے مضمرات وغیرہ ان کے تجربات کا حصہ نہیں ہیں۔ اسی لیے وہ چند افسانوں —— 'کبوتروں والا سائیں، یزید، صاحب کرامات،

ہرنام کور، آمنہ، وغیرہ کے علاوہ اپنے موضوعات، واقعات اور کرداروں کو شہری فضا تک ہی محدود رکھتے ہیں، شہروں میں بھی دو شہر —— بمبئی اور لاہور، جہاں منٹو نے اپنی عمر کے تقریباً اٹھارہ سال بسر کیے تھے، منٹو کی کہانیوں کے LOCALE کے طور پر بار بار ابھرتے ہیں۔ ان دو شہروں کے علاوہ ان کا آبائی شہر امرتسر اور دہلی، جہاں انہوں نے ڈیڑھ برس ریڈیو پر ملازمت کی تھی، بھی منٹو کی کچھ کہانیوں کا پس منظر بنتے ہیں۔

(۴)

تقسیم وطن منٹو کے فنی سروکاروں میں سے سب سے زیادہ بنیادی سروکار ہے۔ یہ کہنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ برِ صغیر کی سبھی زبانوں میں تقسیم سے متعلق جو تخلیقات نثر اور شعر میں لکھی گئیں، منٹو کے فن پارے ان میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام رکھتے ہیں۔ منٹو نے تقسیم پر جو افسانوی شہ پارے تحریر کیے ان میں 'ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، سہائے، رام کھلاون، گورمکھ سنگھ کی وصیت، یزید، شریفن، ہرنام کور، ڈارلنگ، عزت کے لیے، وہ لڑکی، انجام بخیر، اور 'اللہ دتا' کو اہم افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی افسانوں کی ایک بڑی تعداد ہے، جن میں تقسیم کا ذکر اور اس کے اثرات کی نشاندہی کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا بنیادی تھیم پاگل خانے کے اندر اور باہر کی دنیاؤں کی مماثلت ہے۔ اس تقابل کے ذریعے منٹو نہایت سرد مہری سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں کہ فرقہ واریت کے وحشیانہ اور غیر انسانی منظر نامے میں تمام برِ صغیر ایک وسیع پاگل خانہ بن گیا تھا اور پاگل خانہ کہلائی جانے والی ایک محدود عمارت باہر کی نام نہاد شائستہ دنیا کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور مامون جگہ بن گئی تھی۔ افسانے میں کچھ مقامات نہایت دردانگیز اور گہری دردمندی کے حامل ہیں۔ مثلاً ایک پاگل کا یہ اصرار کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتا ہے اور نہ پاکستان میں، بلکہ پاگل خانہ کے احاطے میں پھل پھول رہے ایک درخت پر رہنے کا خواہش مند ہے —— ظاہر کرتا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر تشکیل دی گئی سیاسی وحدتوں کی بہ نسبت فطرت کی خلاقی اور قوت نمو کی علامت —— ایک سرسبز درخت اس انسان کے لیے زیادہ بہتر مسکن ثابت ہوسکتا ہے۔ بشن سنگھ کا اپنے کھیتوں، اپنے گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں اور اپنے پالتو مویشیوں کو یاد کرتا پھر اسی

ٹریجک صورت حال کی طرف لے جاتا ہے، جہاں تہذیب اور شائستگی کے مراکز سمجھے جانے والے مراکز کے بجائے کھیت، باغ، دھول بھرے راستے اور غریب کسانوں کے خدمت گار جانور افضل تر قرار پاتے ہیں۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کی طرح 'موذیل' میں بھی سعادت حسن منٹو، مذہب کے متشدد اور غیر انسانی پہلو کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ افسانہ بمبئی شہر کے کچھ علاقوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے، جہاں تقسیم نے فرقہ وارانہ منافرت کو نہایت جان لیوا شکل دے دی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ منافرت کے اس موڑ پر ایک عجیب و غریب نوعیت کی عشقیہ EQUATION بھی مرتب ہو رہی ہے جس کا مرکزی کردار ایک آزاد رو، بلکہ ایک حد تک بے راہ رو یہودی عورت نما لڑکی موذیل ہے۔ وہ ایک نوجوان سکھ ترلوچن کے 'گوڈے گوڈے عشق' کا موضوع بنی ہوتی ہے۔ افسانے میں جہاں ایک طرف ظاہر پرستانہ مذہبی علامات کو حقارت آمیز نظریے سے دیکھا گیا ہے وہیں خود مذاہب کی ناپسندیدگی 'موذیل' میں قدر نمایاں اور تیکھی ہے کہ افسانہ کہیں کہیں اہانت مذہبی کی حدود میں آجاتا ہے۔

'ٹھنڈا گوشت' فرقہ وارانہ تشدد کے نفسیاتی عمل ورد عمل کی دھوپ چھاؤں کو موضوع بناتا ہے۔ ایشر سنگھ اور کلونت کور دو ایسے ناتراشیدہ مرد و عورت ہیں جو ذہن کے بجائے جسم کی دنیا میں شب و روز بسر کرتے ہیں۔ دونوں کو فرقہ وارانہ سیاست کی باریکیوں کی نہ کوئی فہم ہے اور نہ ہی اس سے ان کو کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ دلچسپی ہے۔ لیکن ان کو فرقہ واریت کے جنسی پہلو سے، بالخصوص ایشر سنگھ کو ایک حیوانی قسم کا سروکار ضرور ہے۔ وہ سروکار یہ ہے کہ فسادات کے دوران بے سہارا عورتوں کی شکل میں ایشر سنگھ کی جسمانی اشتہا مٹانے کے وافر مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایشر سنگھ کا یہ شغل ایک نفسیاتی عارضے میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب اس کا جسمانی مجادلہ ایک دوشیزہ کے مردہ جسم سے ہوتا ہے۔

'کھول دو' میں بھی تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کے جنسی و نفسیاتی پہلوؤں کے باہم مدغم ہو جانے کو آشکار کیا گیا ہے۔ اس مختصر افسانے میں تہذیب و تمدن اور متوسط طبقے کی قدروں میں شگاف ڈالتی ہوئی زندگی کی للک ہے جو ہر قدر اور ہر قانون پر غالب آجاتی

ہے۔ اپنی جوان بیٹی کے عریاں جسم کو زندہ دیکھ کر ہارے پڑے باپ سراج الدین کا یک بیک خوشی سے چیخ پڑنا، ایک تہذیبی و مذہبی سانحہ تو ہے، لیکن یہی واقعہ موت پر زندگی کے غالب آنے والی قوت کا اعلان بھی کرتا ہے۔

‘سہائے’ میں ممتاز کی پاکستان ہجرت خود منٹو کی بمبئی سے پاکستان ہجرت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ جگل کا کردار منٹو کے اداکار دوست شیام سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ افسانے کا کلیدی کردار ایک دلال ہے، جو جسم فروشی کے ذلیل پیشے سے نکل کر ایک شریف آدمی بننے کے خواب رکھتا ہے۔ لیکن جب ہندو مسلم تشدد اس کے خواب کو اس کے جسم کے ساتھ ساتھ پامال کر دیتا ہے تو وہ دنیا سے جاتے جاتے ایک ایسا کارنامہ انجام دے جاتا ہے جو اس کو معمولی آدمی کی صفوں سے اٹھا کر دیوتاؤں کے زمرے میں پہنچا دیتا ہے۔

‘**رام کھلاون**’ ایک بے چہرہ و بے شناخت شخص ہے جو متوسط طبقے کے لوگوں کی خدمت کر کے اپنا رزق پیدا کرتا ہے۔ وہ اس سماجی تلچھٹ کا حصہ ہے جو سفید پوشوں کے ہاتھوں قدم قدم پر توہین اور غیر مہذب برتاؤ کا شکار ہوتا ہے۔ شہر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہونے پر رام کھلاون کے طبقے کے ہاتھ ایک موقعہ آتا ہے کہ وہ اپنی طبقاتی تذلیل کا انتقام ان سفید پوشوں سے لے سکیں۔ لیکن اس انتقام کی بنیاد طبقاتی نہیں مذہبی بنتی ہے۔ تاہم مذہبی جنون کی اس فضا میں ذاتی مہربانیاں اور چھوٹے چھوٹے احسانات انسانیت کے روشن چراغ بنتے ہیں۔

‘**گورمکھ سنگھ کی وصیت**’ میں ایک مسلم اور سکھ کے دیرینہ مراسم کو اس وقت گزند پہنچتی ہے جب مسلم بزرگ کو مخالف فرقے کے لوگ قتل کرنے آتے ہیں اور سکھ دوست کا نوجوان بیٹا کسی قسم کا افسوس بھی ظاہر نہیں کرتا۔ دراصل تقسیم کے زمانے میں فضا اس قدر زہرناک ہو گئی تھی کہ اچھے اچھے کشادہ ذہن لوگ مذہبی منافرت کے سفلی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکے تھے۔

‘یزید’ میں تقسیمِ ہند اور اس کے فوراً بعد ہونے والی کشمیر کی جنگ کو پاکستانی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ رحیم داد فرقہ وارانہ منافرت کی بنا پر قتل ہو جاتا ہے لیکن صرف اس بنا پر اس کا بیٹا کریم داد، ہندوستان کی کورانہ مخالفت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ گاؤں میں افواہ گرم ہے کہ ہندوستان ان کے ذرائع آب پاشی کو مسدود کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ کریم اس سلسلے میں

کوئی اخلاقی موقف اختیار کرنے کے لیے بھی راضی نہیں ہے کیونکہ حالات پرامن نہیں، بلکہ انتہائی بحرانی ہیں۔

‘شریفن’ میں ہندو۔ مسلم منافرت کا تاریک ترین پہلو سامنے آتا ہے، جب دو باپ اپنی جوان بیٹیوں کے قتل کا انتقام لینے کے دو غیر مذہب کی بے گناہ لڑکیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

‘ہرنام کور’ پنجاب کے ایک سکھ اکثریت والے گاؤں کی کہانی ہے۔ جس کے باشندے ہجرت کرنے والے مسلم قافلوں پر حملے کر کے مال مویشی اور عورتیں لوٹنے کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ ناجائز لوٹ کھسوٹ کی اس لہر میں وہ لوگ بھی شناور بن جاتے ہیں جنہوں نے کبھی دریا کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔ افسانے میں ایک باپ اپنے جوان بیٹے کو جنسی طور پر متحرک کرنے کے لیے مہاجر قافلے سے ایک دوشیزہ کو اغوا کر کے لے آتا ہے۔

‘ڈارلنگ’ میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک ایسی عورت کا ایک نوجوان سے ناکام جنسی ارتباط پیش کیا گیا ہے، جو ایک نامور فنکارہ ہے اور شکلاً پُرکشش نہیں ہے۔ افسانے میں منٹو نے انسانی ٹریجڈی سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے اس مردانہ ذہن کی عکاسی کی ہے جو عورت کو سامانِ تعیش سمجھتا ہے۔

‘عزت کے لیے’ کا مرکزی کردار ایک دلال قسم کا تاجر ہے، جو شہر میں خوشحالی اور وقار حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی جائز و ناجائز حرکات میں ملوث رہتا ہے۔ فسادات کے دوران اس کو اپنے کاروبار کے فروغ کے لیے مظلوم عورتیں دستیاب ہو جاتی ہیں، لیکن قدرت اس کی بہن کی آبرو ریزی کی شکل میں اس سے انتقام لیتی ہے۔

‘وہ لڑکی’ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ اس ہندو نوجوان سے لیتی ہے جو بیک وقت فرقہ پرست بھی تھا اور جنسی شکاری بھی۔ وہ آفت رسیدہ عورت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا جسمانی استحصال کرنا چاہتا ہے، لیکن اسے اپنی بداعمالیوں کی قیمت جان دے کر چکانا پڑتی ہے۔

‘انجام بخیر’ کی طوائف فرقہ وارانہ فسادات شروع ہونے کے باوجود دہلی سے مہاجرت کے حق میں نہیں ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے قتل وخون کے واقعات بڑھنے لگتے ہیں تو اس کی قوتِ ارادی متزلزل ہو جاتی ہے۔ لاہور پہنچ کر نسیم اپنے ذلت آمیز پیشے کو ترک کرنا چاہتی

ہے۔ لیکن اسلامی ریاست میں بھی سازشی لوگ اسے شریفانہ زندگی بسر نہیں کرنے دیتے۔ وہ مجبوراً دوبارہ اپنے خاندانی پیشے کو اپنا لیتی ہے۔

'**اللہ دتا**' میں فسادات کے دوران ہوئی اتھل پتھل کا ایک باپ یہ شرم ناک فائدہ اٹھاتا ہے کہ اپنی بیوی کے قتل ہو جانے کے بعد اپنی بیٹی سے جنسی تعلق قائم کر لیتا ہے۔ گو اس قسم کی بے راہ روی مشرقی معاشرے میں عام طور پر مشاہدہ میں نہیں آتی ہے، لیکن ناممکنات میں نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ میں جب ایک ملک میں صدیوں سے جمے جمائے لوگ اپنی زمینوں سے اکھڑ کر دوسرے ملک کے نو آباد اور اجنبی علاقوں میں ہجرت کر کے آباد ہوئے تو سماجی بندھنوں کا پرانا تانا بانا بڑی حد تک ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ نئی آزادیوں کی اس فضا میں بہت سے کج ذہن لوگوں نے اپنی منفی خواہشات کی تکمیل کے چور راستے دریافت کر لیے تھے۔

(۵)

منٹو کے فکشن کا دوسرا اہم تھیم جسم فروشوں کا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے اردو میں پہلی بار بڑے پیمانے پر اور بڑے پہلوؤں پر افسانے لکھے۔ ان سے قبل سرفراز حسین عزمی دہلوی، مرزا رسوا، پریم چند اور قاضی عبدالغفار وغیرہ بھی ناول اور افسانے تخلیق کر چکے تھے۔ لیکن منٹو کے یہاں ذاتی تجربے کی جو شدت اور مشاہدے کی جو قوت نظر آتی ہے، ان سے پہلے اور بعد کے مصنفین اس سطح اور پیمانے تک نہیں پہنچ پاتے۔ بابو گوپی ناتھ، کالی شلوار، ہتک، ممی، سو کینڈل پاور کا بلب، لائسنس، سراج، شاردا، فوبھا بائی، دودا پہلوان، بری لڑکی، نطفہ، سرکنڈوں کے پیچھے، قادرا، قصائی، پہچان، شانتی، محمودہ، ہارتا چلا گیا، شادی، ڈرپوک، پشاور سے لاہور تک، پھسپھسی کہانی، پریشانی کا سبب، بسم اللہ، بارش، حامد کا بچہ، مائی جنتے، اور 'دس روپے' وغیرہ منٹو کے وہ افسانے ہیں جہاں طوائف ایک بنیادی موضوع یا کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔

'**بابو گوپی ناتھ**' منٹو کا واحد افسانہ ہے، جس میں انہوں نے ایک عیاش اور قماش بین قسم کی ذات کے آگے خود اپنے کردار کی تحقیر کی ہے۔ گوپی ناتھ ایک درویش صفت طوائف باز ہے۔ وہ ورثہ میں ملے ہوئے مال مفت کو بے رحمی سے پھونکتا ہے اور صرف چند برسوں کے ایک

ایسے رومان زدہ MAKE-BELIEVE میں جینا چاہتا ہے۔ جس میں وہ ایک انسان کے بجائے دیوتا کا مقام رکھتا ہو۔ گوپی ناتھ اپنے اطراف کے فریب اور ملمعے کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا ، بلکہ جان بوجھ کر خود فریبی کا شکار بنتا ہے۔ اس کا تجاہلِ عارفانہ اسے ایک ایسی معصومیت عطا کرتا ہے، جس کے آگے بڑے بڑے ادیب، دانش ور اور پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیچ نظر آتے ہیں۔ گوپی ناتھ کے لیے طوائف، دلال، مفت خورے، شرابی، صوفی، ادیب سبھی ہم پلہ ہیں کیونکہ یہ بھی نیک وبد مل کر زندگی کی وسیع تر وحدت کو تشکیل دیتے ہیں۔ اسی لیے اس کے نظامِ فکر میں اچھے بُرے ، کوٹے کھرے، صاحب کردار اور سفید وسیاہ کے مابین وہ تضاد نہیں ہے جو نام نہاد شرفا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ نہ ہی بابو گوپی ناتھ کسی قسم کے مذہبی یا ثقافتی نظامِ اخلاق کا پابند نہیں ہے۔ وہ زندگی کو خالصتاً انسانی سطح پر گزارتا ہے اور مستقبل کے خوف یا تفکر سے کاملاً آزاد ہے۔

'کالی شلوار' بیک وقت ایک طوائف سلطانہ کے داخلی سفر کی بھی داستان ہے اور انگریزی غلامی کے زیرِ اثر مرتب ہونے والے اثرات کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی لیے سلطانہ اپنے گورے تماش بین موجیوں کو بوقتِ ضرورت مادری زبان میں گالیوں سے نواز کر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام بھی لیا کرتی تھی، گو کہ سیاسی غلامی کے اس دور میں اس کی معاشی زندگی ایسی بُری نہیں تھی۔

لیکن بڑے لاٹ صاحب کی شہر دہلی کو ہجرت سلطانہ کو اس معنی میں راس نہیں آئی کہ اتنے بڑے شہر میں بھی اس کا دھندا جڑ نہیں پکڑتا۔ سلطانہ کے کار پرداز اللہ بخش کو خدائی کارسازی پر کامل اعتماد ہے۔ اسی لیے سلطانہ زیور بیچ بیچ کر کھاتی رہتی ہے۔ —— جس طرح کہ مرزا غالب کپڑے کھاتے تھے۔ یہ عام کلیہ ہے کہ بدحالی کے زمانے میں انسان یا تو مذہب کی پناہ میں چلا جاتا ہے یا کبھی کبھی خدا کی ذات ہی سے روگرداں ہو جاتا ہے۔ سلطانہ اولین اور پیش پا افتادہ راستہ اپناتی ہے، ایسے میں اس کی زندگی میں ایک بانکا تماش بین آتا ہے۔ جو اس کی طرح قلاش ہونے کے باوجود بھی کافی خوش تدبیر ہے۔ ایسی بدحالی اور کس مپرسی کے زمانے میں شنکر، سلطانہ کی صرف جذباتی ضروریات پوری کرتا ہے۔ جو ایک بڑے شہر نما جنگل میں کم اہم نہیں ہے۔

'ہتک' کو کرشن چندر نے اپنی جگہ اردو کی بہترین کہانی قرار دیا تھا۔ سوگندھی ایک

طوائف ہے۔ ایک طرف مادھوا سے محبت کا فریب دے کر لوٹتا ہے دوسری طرف وہ اہلِ دول ہیں جو چند سکوں کے عوض اپنی شرائط پر اس کو پامال کرتے ہیں۔ سوگندھی ایک بے جان وجود کی طرح ہر قسم کی فریب کاریاں اور بے عزتیاں برداشت کرتی ہے، اس لیے کہ وہ ایک بے یار و مددگار عورت ہے اور جسمانی تذلیل ہی اس کے لیے حصولِ رزق کا ذریعہ ہے۔ تاہم معاملہ صرف جسمانی تذلیل تک محدود نہیں تھا۔ اس میں ذہنی اور روحانی ذلت انگیزی بھی پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ لیکن سوگندھی کی برداشت کا پیالہ اس وقت چکنا چور ہو جاتا ہے، جب ایک رات کو دو بجے نیم خوابیدہ سی سوگندھی کو اٹھا کر رام لعل دلال، ایک سیٹھ کو پسند کرانے لے جاتا ہے۔ اور وہ سیٹھ ایک نظر میں سوگندھی کو ناپسندیدہ قرار دے کر چشم زدن میں غائب ہو جاتا ہے۔ یہ لمحہ سوگندھی کی ذات کی نفی کا ہے اس موڑ پر انسانوں سے زیادہ قابلِ انحصار وہ ایک کتے کو سمجھتی ہے۔

'ممی' سعادت حسن منٹو کا طویل ترین افسانہ ہے اور یہ پونہ میں ان کے قیام کے تجربات سے ماخوذ ہے۔ دیگر متعدد کہانیوں کی طرح، یہاں بھی منٹو واحد متکلم کے طور پر موجود ہیں کہانی کا مرکزی کردار اسٹیلا جیکسن، شاید اینگلو انڈین طبقے سے تعلق رکھنے والی بیوہ عورت تھی جو پونے شہر کے ہر کوچے سے آگاہ تھی۔ تماش بینوں کو سامانِ تعیش فراہم کرنا اس کا پیشہ تھا۔ افسانے کا دوسرا کلیدی کردار چڈہ اداکار و مغنی شیام کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ کہانی کی تمام تر فضا نیم تفریحی اور نیم جنسی ہے۔ ممی اپنے فلم اداکار، بچوں کو خوش رکھنے کے لیے شراب اور لڑکیاں کھلے دل سے فراہم کرتی ہے لیکن ان نفسیاتی قسم کی شور انگیز رفاقتوں کے درمیان ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے جب اسٹیلا جیکسن واقعی ایک حقیقی ماں کا کردار ادا کرتی ہے اور ایک کمسن دوشیزہ کو اپنے بیٹے چڈہ کی دستبرد سے محفوظ کر لیتی ہے۔ اسٹیلا جیسی "لال لگامی اور گھسی ہوئی میم" سے کسی طرح کی گہری انسانی اخلاقیات کی امید کرنا، جوئے خانے میں نمازیوں کی تلاش جیسا بے سود معلوم ہوتا ہے۔ لیکن منٹو دکھاتے ہیں کہ بد سے بدانسان کا بھی ضمیر صد فی صد مردہ نہیں ہوتا ہے۔ فیلس کا چڈہ کی گرفت سے باہر رہنا اسی زندہ ضمیر کا کارنامہ ہے۔ ممی کی ظاہری شکل و صورت میں ایک طرح کی کراہیت کا احساس ہوتا ہے، تاہم اس کا باطن ایک حد تک خوبصورت ہے۔ جس کو فیلس کی عصمت کا تحفظ کر کے وہ روشن بنالیتی ہے۔ افسانے کا ایک اور اہم کردار اس کی مکمل طور پر سیکولر فضا

ہے جہاں کئی طرح کی انسانی کمزوریاں تو انسانی اعمال میں جھلک دکھاتی ہیں، لیکن تقسیم سے قبل کے اس فلمی ماحول میں فرقہ پرستی کا زہر ابھی ان چھوٹے بڑے فنکاروں کے رگ و پے میں نہیں اتر سکا ہے۔

‘سو کینڈل پاور کا بلب’ کی طوائف جسمانی پامالی کی بنا پر اس قدر ٹوٹ چکی ہے کہ اس کو نیند جیسی بنیادی سہولت بھی بآسانی میسر نہیں ہوتی۔ اس بے نام طوائف کو شاید تقسیم ملک نے اپنے گھر اور وطن سے اکھاڑ کر نئے شہر میں لا پھینکا ہے۔ یہ عورت عمر کے اس موڑ پر اتنی بری طرح تھک چکی ہے کہ ہمدردی کے دو بول تک برداشت کرنے کی روادار نہیں ہے۔ اس عورت کی جھنجھلاہٹ اور تذلیل جب برداشت کی حدود کو پار کر جاتی ہے تو وہ اپنے دلال کا قتل کر ڈالتی ہے۔

‘لائسنس’ کی نیتی ایک الہڑ دوشیزہ ہے۔ جس کا شوہر ابو یکہ بان ہے جو اتفاقاً ایک دن اسے مل گیا تھا۔ ابو کی اچانک وفات کے بعد گزر اوقات کے لیے نیتی کو تانگہ سنبھالنے کے علاوہ کوئی متبادل نظر نہیں آتا۔ لیکن جب وہ میونسپلٹی سے تانگے کا لائسنس حاصل کرنا چاہتی ہے تو عورت ہونے کی بنا پر اس کی درخواست مسترد کر دی جاتی ہے۔ مجبوراً نیتی قحبہ گری شروع کر دیتی ہے کیونکہ اب اس کا جوان جسم ہی اس کا واحد سہارا تھا۔

‘سراج’ ایک نوعمر طوائف ہے جو کسی تماش بین کو اپنا جسم پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ دراصل اس کا عاشق اس کو گھر سے بھگا لانے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ سراج اپنے فریبی عاشق کو آگاہ کر دیتی ہے کہ وہ اب خود کفیل ہو گئی ہے، یعنی اپنے جسم کا کاروبار کرنے لگی ہے۔ یہ سراج کا نہایت منفی قسم کا انتقام ہے۔

‘شاردا’ بمبئی کے ایک تماش بین کے کرداری سفر کی کہانی ہے۔ نذیر ایک گھریلو قسم کا اوباش ہے جو اپنی سہرے جلوے کی بیاہی ہوئی بیوی کے ساتھ بددیانتی کر کے بازاری عورتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن نذیر کا طرزِ تعیش مہذب و شائستہ قسم کا ہے، اس لیے وہ اپنی سرگرمیوں میں صرف تجربہ کار خواتین کو شریک کرنے کا قائل ہے۔ گھریلو مزاج کی شاردا جب اس سے بازاری وسیلے سے ٹکرا جاتی ہے تو وہ اس سے ایک شوہر کا سا جعلی برتاؤ کرنے لگتا ہے۔ شاردا

طبعاً جسم فروش نہیں ہے بلکہ ضرورتاً بھی پیشے میں نہیں آتی ہے، جبراً اس غلاظت میں دھکیلی گئی ہے۔ وہ نذیر کی خانگی قسم کی اداکاری کو سچ سمجھ بیٹھتی ہے۔ شاردا بنیادی طور پر اپنی بچی کی ماں ہے۔ اپنے شوہر کی ٹھکرائی ہوئی بیوی ہے اور گھر کی چہار دیواری میں محفوظ و مامون دیوی کا کھویا ہوا رتبہ حاصل کرنے کی متمنی ہے۔ پیسے سے اس کو صرف اس قدر انس ہے جتنا کہ اس کی محدود ضرورتوں کی کفالت کے لیے کافی ہو۔ زائد کو وہ ایک بوجھ سمجھ کر اتار دیتی ہے۔ شاردا کو اپنی ذلت آمیز حیثیت کا شدید اس لیے وہ خود کو بآسانی نذیر کے سپرد کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان بحران تب پیدا ہوتا ہے جب نذیر اس کو پھر بازار بھیج کر اپنی گرہستی کا بہروپ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک بے رحم مرد کی طرح شاردا کی تحقیر شروع کر دیتا ہے، لیکن وہ وفا کی دیوی بنی رہتی ہے۔ لیکن جب شاردا کا وجود نذیر کے لیے ایک مکمل بوجھ بن جاتا ہے تو وہ خود ہی اپنی نامراد دنیا میں واپس لوٹ کر نذیر کے ضمیر پر ایک طمانچہ مار جاتی ہے۔ منٹو نے شاردا کو ایک ازلی ماں کی شکل میں پیش کیا ہے، جسم فروشی جس کے لیے اپنا گمشدہ وقار حاصل کرنے کی ناکام کوشش ثابت ہوتی ہے۔

'شوبھا بائی' شاردا ہی کے وطن جے پور سے بھاگ کر بمبئی میں وارد ہوئی تھی اور نہایت عدم توجہی سے طوائف پیشہ کرتی تھی۔ لیکن وہ گاہکوں سے اس درجہ خلوص و محبت سے پیش آتی ہے کہ لگتا ہے کہ وہ اس کے عزیز و اقارب ہیں۔ مگر جب اس کا اکلوتا بچہ مر جاتا ہے تو شوبھا ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔ دراصل اس کے اندر ممتا کا جذبہ اس درجہ شدید تھا کہ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیاں صرف اپنی اولاد کے وجود کی بنا پر تھیں۔

'دودا پہلوان' کی فضا ایک ایسے زمانے کی یاد تازہ کرتی ہے جب دوستیاں اور رفاقتیں اس قدر مستحکم ہوا کرتی تھیں کہ رشتوں کی عظمت کے تحفظ کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینا نارمل معلوم ہوتا تھا۔ صلاحو اور دودا پہلوان، مالک و ملازم ہوتے ہوئے بھی محمود و ایاز کے طرز کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ دودا پہلوان بات کا دھنی جان دینے اور لینے کے موقعے پر صفِ اول کا مجاہد اور لنگوٹ کا اس قدر پکا ہے کہ کرداری پاکیزگی کے بلند مدارج کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن صلاحو سے وفاداری نباہنے کے لیے اسے اپنی پاکیزگی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس کے بعد وہ زندہ تو رہتا ہے، لیکن اپنی شخصیت کی تاب و توانائی کھو کر۔

‘**برمی لڑکی**’ ایک معصوم سی عورت ہے جو بغیر ذاتی مفاد کو مدنظر رکھے اپنے گاہکوں کو جسمانی تلذذ بھی فراہم کرتی ہے اور خانگی سکون بھی پہنچاتی ہے۔ اس کو اپنے نزدیک آنے والے مردوں کے ماضی یا حال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جب تک وہ چاہتے ہیں برمی لڑکی ان کی خدمت کرتی ہے اور ضرورت ختم ہونے پر اپنی دنیا میں واپس چلی جاتی ہے۔

‘**نطفہ**’ کے دو کردار —— خان اور صادق زندگی کے مختلف مرحلوں پر ہیرا منڈی کی طوائفوں کے رابطے میں آتے ہیں اور ان سے مختلف نوعیات کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ خان، سرحد سے سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر صوبہ بدر کیا گیا تھا اور صادق ایک غیر شادی شدہ تو دولتمند تھا۔ دونوں کی زندگی کچھ اس طرح سے کٹتی ہے کہ خانگی بکھیڑوں کے بجائے انہیں جسم فروشوں کے بالا خانے زیادہ راس آتے ہیں۔ منکوحہ طوائف کے بطن سے اپنی بیٹی کی ولادت ہونے پر صادق دونوں کو کوٹھے پر چھوڑ کر اپنی کاروباری دنیا میں لوٹ آتا ہے۔ خاں کوٹھے پر ہی رہائش برقرار رکھتا ہے۔

‘**سرکنڈوں کے پیچھے**’ کی نوعمر طوائف پہلی بار ایک دولتمند آشنا ہیبت خاں سے محبت کے معنی سیکھتی ہے۔ لیکن خان کی آشنا عورت نہایت بے رحمی سے طوائف کو ہلاک کر دیتی ہے۔

‘**قادرا قصائی**’ ایک پہلوان نما شخص ہے جو دودا پہلوان کی طرح لنگوٹ کا پکا ہے۔ عیدن لاہور کی ایک سرکردہ اور خوبصورت جسم فروش ہے، جو قادرا کے کھردرے پن کے دام میں گرفتار ہو کر اس سے کنیزوں جیسا برتاؤ کرنے لگتی ہے۔ لیکن قادرا قصائی نہ صرف خود کو طوائف سے دور رکھتا ہے بلکہ اس کے ساتھ بدسلوکی بھی کرتا ہے۔

‘**پہچان**’ میں دہلی کے تین نوجوان ایک دن خوبصورت ارباب نشاط کی جستجو میں نکلتے ہیں۔ اس دوران ان کو عجیب وغریب تجربات کا سامنا ہوتا ہے۔ اپنے مقصد میں ناکام رہنے کے باوجود وہ ان واقعات سے محظوظ ہوتے ہیں۔

‘**شانتی**’ اپنے محبوب کے ہاتھوں زخم کھا کر پیشہ ور بنی ہے۔ وہ پیسہ کماتی لیکن بیدردی سے لٹاتی رہتی تھی۔ بمبئی آ کر وہ ایک گاہک کی محبت میں دوبارہ گرفتار ہو جاتی ہے۔ جو اس کو پسند کرنے لگا تھا۔

‘**محمودہ**’ کا مرکزی کردار ایک خوبصورت گھریلو دوشیزہ ہے، جو اپنے شوہر سے آسودگی نہ ملنے پر جسم فروش بن جاتی ہے۔

‘**ہارتا چلا گیا**’ کا مرکزی کردار فلم انڈسٹری سے وابستہ ایک دولت مند ہے۔ وہ قحبہ خانوں اور قمار خانوں میں بابو گوپی ناتھ کی طرح رقمیں لٹاتا ہے، لیکن ایک معمولی سی طوائف کو راہِ راست پر لانے میں ناکام رہتا ہے۔ گنگو بائی اسے آگاہ کرتی ہے کہ اگر وہ اکیلی گناہ کی زندگی سے توبہ کر بھی لے گی تو اس سے کوئی سماجی تبدیلی نہیں آئے گی، کیونکہ دنیا میں اس کی ہم پیشہ لاتعداد عورتیں ہیں، جو اسی کی طرح ناجائز طور پر رزق حاصل کرتی ہیں۔

‘**شادی**’ کا نوجوان کردار جمیل نکاح کی منزل سے گزر چکا ہے لیکن شراب پی کر بازاری عورتوں سے لطف اندوز ہونے کو برا نہیں سمجھتا ہے۔ وہ ایک طوائف کے پاس دوبارہ جاتا ہے تو، علم ہونے پر کہ خود اسی کی طرح طوائف کی بھی شادی ہونے والی ہے، اپنی حالت پر شرمندہ ہوتا ہے۔

‘**ڈرپوک**’ کا جاوید ایک کمزور شخصیت والا سیدھا سادہ نوجوان ہے، اس کے دل میں نسوانی لطافتوں کے حاصل کرنے کی فطری خواہش ہے۔ لیکن وہ اپنے اطراف میں کسی دوشیزہ کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ انتقاماً وہ ایک دن زنانِ بازاری کے کوچے کا رُخ کرتا ہے لیکن وہاں کا کراہیت آمیز ماحول دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

‘**پشاور سے لاہور تک**’ کی طوائف کو ایک گھریلو دوشیزہ سمجھ کر نوجوان جاوید اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی اصلیت سے واقف ہونے پر وہ ایک بزدل دنیادار کی طرح روپوش ہو جاتا ہے۔

‘**پھسپھسی کہانی**’ کے دو بھائی ایسے کردار ہیں جو دنیا کا ہر عیب بلا تکلف ایک ساتھ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تقسیم کی افراتفری کے دوران فسادات میں نابینا ہوئی ایک دوشیزہ پر بھی رحم نہیں کھاتے ہیں۔ لیکن طوائفوں کے کوٹھوں پر انہیں کامیابی نہیں ملتی ہے۔

‘**پریشانی کا سبب**’ کا نعیم ایک سیدھا نوجوان ہے، جو پرائے جھگڑے میں الجھ کر ایک طوائف کے ذریعے ایک مقدمے میں ماخوذ کر لیا جاتا ہے۔ نعیم اس بنا پر خود کو بے عزت

محسوس کرتا ہے لیکن تماش بینوں اور دولتمندوں کے طبقے میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو نعیم کو اس کے ناکردہ گناہوں کی بنا پر اپنا ہم پلہ اور ہم پیالہ سمجھنے لگتے ہیں۔

’بسم اللہ‘ فلم انڈسٹری کے گلیمر کے پسِ پشت موجود غلاظت کو آشکار کرتا ہے۔ یہاں لاہور کی فلمی نگری میں قدم جمانے والا ظہیر تقسیم کے دوران ہاتھ لگی ایک ہندو لڑکی کو مسلم نام دے کر اداکاری کی آڑ میں اس سے قحبہ گری کراتا ہے۔

’بارش‘ میں ایک شریف نوجوان ایک دوشیزہ کی الفت میں گرفتار ہو جاتا ہے جو ایک طوائف نکلتی ہے۔ افسانہ ’مائی جنتے‘ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔

’حامد کا بچہ‘ میں ایک طوائف کے مراسم ایک شادی شدہ مرد حامد سے ہیں۔ جب طوائف لتا حاملہ ہو جاتی ہے تو حامد کو وہم ہو جاتا ہے کہ یہ ناجائز اولاد اسی کی ہوگی۔ حامد ناجائز تعلقات میں کوئی عار نہیں رکھتا لیکن ناجائز بچے کو راہ سے ہٹانے کے لیے وہ طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے، لیکن بچے کی شکل ایک دوسرے مرد سے مل جاتی ہے تو گویا وہ سرخ رو ہو جاتا ہے اور گناہ کا بوجھ گویا اس کے سر سے اتر جاتا ہے۔

’دس روپے‘ کی الھڑ دوشیزہ سریتا کی ماں مفلسی کی بنا پر اس سے پیشہ کراتی ہے لیکن ابھی سریتا کے مزاج میں پیشہ وروں کا گھناؤنا پن اور چہرے پر بازاری قسم کی کرختگی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس کے نوعمر شائقین بھی بازاری رشتوں کا کم تجربہ رکھتے ہیں۔ بردہ فروشی کی اس فضا میں کچھ دیر کے لیے ایک الوہی قسم کا رومان پیدا ہوتا ہے اور ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح ختم ہو جاتا ہے۔

(۶)

منٹو سے قبل کے اردو افسانے میں جنسی تفصیلات اور جسمانی تعلقات کے مختلف ابعاد کا ذکر برائے نام ملتا تھا۔ پریم چند نے اپنے آخری دور کی چند کہانیوں —— ’نئی بیوی‘ اور ’مس پدما‘ وغیرہ میں جنس کو کسی حد تک موضوع بنایا تھا۔ لیکن ان کی فکر پر شریفانہ قسم کا آئیڈیلزم اس قدر غالب تھا کہ وہ جنسی امور و مسائل پر بہت دور تک نہ جا سکے۔ ۱۹۳۲ میں ’انگارے‘ کی اشاعت فکشن میں نئے اور واشگاف قسم کے طرزِ تحریر کی آمد کا اعلانیہ تھی۔ اس کے فوراً بعد منٹو نے

اس طرز کو نہ صرف اپنایا، بلکہ اسے اعتبار و استناد بھی عطا کیا۔ منٹو اردو افسانے کا وہ سنگِ میل ہے جس نے جنسی اظہار کو وسیع پیمانے پر مرکزِ بحث بنایا بلکہ جنس کو ادب میں اس کے جائز مقام پر پہنچا کر ایک تاریخی کارنامہ بھی انجام دیا۔ یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ لازم ہے کہ منٹو کا ذہن بیمار تھا یا جنس ان کے اعصاب پر سوار تھی۔ سعادت حسن منٹو نے تقریباً ۲۳۰ افسانے تخلیق کیے تھے۔ اگر تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان افسانوں کی تعداد پچاس سے زائد نہیں ہے جن میں جنس کو بنیادی موضوع کے طور پر برتا گیا ہے یا جن میں طوائف قصے کا اہم کردار بنتی ہے۔ چنانچہ منٹو کو فحش نگار جنس زدہ یا رجعت پسند قرار دینا غیر منصفانہ اور غیر تنقیدی رویہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے، جو اکثر منٹو کے فن پاروں کا گہرا مطالعہ نہ کرنے کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ منٹو کی تحریروں کا محاکمہ ان کے عہد کے معاشرتی حقائق اور جدید ادبی رجحانات کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

منٹو کے پانچ افسانوں —— 'کالی شلوار' 'دھواں' 'بو' 'ٹھنڈا گوشت' 'کھول دو' اور ایک ڈرامے —— 'اوپر، نیچے اور درمیان' پر فحاشی کے الزام کے تحت فوجداری مقدمے چلائے گئے۔ ان میں سے ابتدائی تین کہانیوں پر مقدمات برطانوی دورِ حکومت میں قائم ہوئے تھے اور بقیہ تین تحریروں پر مملکتِ پاکستان میں، جہاں منٹو تقسیم کے بعد آباد ہوئے تھے۔

متذکرہ چھ فن پاروں کے علاوہ 'ننگی آوازیں' 'بلاؤز' 'پھاتا' 'خالی ڈبے خالی بوتلیں' 'شاردا' 'محمودہ' 'عورت ذات' 'ڈارلنگ' 'بدتمیز' 'پری' 'سوراج کے لیے' 'نفسیاتی مطالعہ' 'چغد' 'میرا نام رادھا ہے' 'پڑھیے کلمہ' 'پانچ دن' 'وہ لڑکی' 'شوشو' 'شیرو' 'مس فریا' اور 'غسل خانہ' وغیرہ وہ افسانے ہیں جہاں پلاٹ جنسی تعلقات اور شہوانی جذبات پر مرکوز ہے۔ تاہم ان افسانوں میں بھی منٹو الفاظ کو نہایت ذمہ داری سے استعمال کرتے ہیں گو کہ کہیں کہیں قاری کو چونکا دیتے ہیں۔

'کالی شلوار' میں جسم فروش عورت سلطانہ کی جنسی زندگی کو مکمل طور پر پسِ پردہ رکھ کر اس کی جذباتی باز آبادکاری کو موضوع بنایا گیا ہے، انبالہ سے دہلی ہجرت کرنے پر جہاں ایک طرف سلطانہ کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو جاتے ہیں۔ وہیں ایک بڑے و اجنبی شہر میں اس کے لیے تنہائی کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ شنکر کو اپنی جنسی زندگی میں اسی مجبوری کے تحت شریک کرتی ہے کہ اس کو ایک جذباتی پناہ گاہ میسر آسکے۔ اس کا دیرینہ رفیق خدا بخش، دہلی میں بھی اس کے

پاس تھا۔ لیکن سلطانہ کا ذہنی شریک بننے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔

'دھواں' ایک ایسی کہانی ہے، جس میں نوبلوغیت کے دو بھائی بہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کی نشاندہی انتہائی نزاکت کے ساتھ کی گئی ہے۔ مسعود، کلثوم کا چھوٹا بھائی ہے، دونوں ابھی عنفوانِ شباب کے دوران چپکے چپکے ہونے والی پراسرار جسمانی تبدیلیوں کے ابعاد سے بڑی حد تک بے خبر ہیں۔ ابھی یہ اس عمر سے بہت زیادہ دور نہیں نکلے ہیں جب ان کے یہاں مردانہ اور زنانہ جنسی تفریق کا احساس ہی نہیں تھا۔ یہ دونوں جنسی ابھار کی بیداری اور ثانوی جنسی خصائص کے ارتقائی سفر پر روانہ ہو گئے ہیں۔ لیکن ہنوز اس مرحلے پر نہیں پہنچے ہیں جہاں جنس ایک مکمل اور واشگاف جسمانی تجربہ بن جاتی ہے اور کئی قبیل کے جنسی مراسم ممانعاتی بن جاتے ہیں۔ عمر کے اس موڑ پر یہ بھائی بہن دو مختلف جنسی دھاروں میں منقسم ہونے ہی والے ہیں۔ فی الحال یہ ایک مبہم مگر لطیف قسم کے نیم جنسی تعلق کے لہر جال میں تیر رہے ہیں، مگر اپنے درون کی کیمیائی تبدیلیوں کی تفہیم سے قاصر ہیں۔ 'دھواں' ایک غنائیہ افسانہ ہے، جہاں منٹو کا فن اپنی ارفع ترین بلندیوں کو چھو رہا ہے۔

'بو' سعادت حسن منٹو کے متنازعہ افسانوں میں سرفہرست رہا ہے۔ یہاں وہ اپنے فطرت پرستانہ تخلیقی وژن کو نہایت روانی کے ساتھ تخلیق میں ڈھال سکے ہیں۔ عورتوں کی شکل میں یہاں دو کردار ہیں —— ایک میلی کچیلی اور محنت کش گھاٹن لڑکی اور دوسری تعلیم یافتہ، نازک مزاج اور تمام طرح کی آرائشوں سے لیس مجسٹریٹ باپ کی بیٹی۔ رندھیر کی زندگی میں ڈھلی بجی عورتیں تو آتی رہی تھیں، لیکن جنسی طور پر ناتراشیدہ اور انتہائی توانا قسم کی قبائلی لڑکی سے اس کا جسمانی سابقہ تجربہ اولین تھا۔ اور یہ سابقہ اس قدر اور یجنل ثابت ہوا کہ رندھیر کی تمام تر جسمانی ترجیحات کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ رندھیر کے ایک پہلو میں فطرت اپنی خام شکل میں پوری حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے، تو دوسرے پہلو میں شہری نزاکتوں کا ملمع شدہ نسوانی وجود تھا۔ رندھیر نے اپنی جبلی ترجیحات کے دباؤ کے تحت ان دونوں صورتوں میں سے اول الذکر کو منتخب کیا۔ اور یہی رندھیر کی جسمانی و ذہنی صحت کا اعلانیہ تھا۔

'**ٹھنڈا گوشت**' تقسیم پر شائع ہوئے ادب میں اہم درجہ رکھتا ہے۔ یہاں منٹو نے

کافی واشگاف انداز میں جنسی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو بہت سے حلقوں نے مطعون کیا۔ ایشر سنگھ ایک شہ زور قسم کا مرد ہے جو جنسی امور میں کسی طرح کی اخلاقیات کو ماننے کا روادار نہیں ہے۔ تقسیم کے ہنگامے کے دوران جہاں وہ کمزوروں کے مال ومتاع کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیتا ہے وہیں عورتوں کو اغوا کر کے استعمال کرنا بھی اس کے مشاغل میں شامل ہے۔ ایک مردہ دوشیزہ سے مجامعت کرنے کے بعد وہ نفسیاتی طور پر اس قدر منفعل ہوتا ہے کہ قوت مردمی گنوا بیٹھتا ہے۔ شاید یہ قدرت کا انتقام تھا جو ایشر سنگھ اور اس کی مرد مار بیوی کو سہنا پڑتا ہے۔

'کھول دو' فنی طور پر اس قدر اہم نہیں ہے جتنا کہ تاریخی نقطۂ نظر سے ہے۔ بوڑھے سراج الدین کی معصوم بیٹی سکینہ تقسیم کے آشوب میں انہیں رضا کاروں کے ذریعے پامال کی جاتی ہے جو بے یارومددگار عورتوں کے محافظ بن کر فسادزدہ علاقوں میں کام کر رہے تھے۔ منٹو دکھاتے ہیں کہ انسان اور فرشتے، درندے اور محافظ اور رہنما اور رہزن کے درمیان کی لکیر کو حالات کبھی کبھی مٹا دیتے ہیں اور انسانی کردار کی جبلی خباثت، تہذیب اور انسانیت کی دیواروں میں شگاف ڈال دیتی ہے۔ سراج الدین جب اپنی گمشدہ بیٹی کو عریاں دیکھتا ہے تو وہ شرم وحیا کی سماجی اقدار کو پھلانگ کر خوشی سے چیخ پڑتا ہے۔ اس عالمِ حشر میں زندگی سب سے اولین انسانی قدر قرار پاتی ہے اور شرم وحیا اور پردہ وذلت وغیرہ ثانوی ثابت ہوتے ہیں۔

'اوپر نیچے اور درمیان' ڈرامائی طرز میں لکھا گیا ہے۔ یہ منٹو کی آخری دور کی تخلیقات میں سے ایک ہے اور فنی طور پر زیادہ اہم نہیں ہے۔ یہاں جنسی تعلق کی تکمیل کے ضمن میں سماج کے تین طبقوں کے رویوں کے فرق کو موضوعِ مزاح بنایا گیا ہے۔ اعلیٰ طبقے کا رویہ جنس کے بارے میں نہایت پر تصنع ہے، متوسط طبقے کے مرد اور عورت کا رویہ نارمل ہے اور نچلے طبقے کے زن وشوہر کا رویہ نہایت فطری اور پرزور ہے۔

'ننگی آوازیں' میں ایک غریب نوجوان کے جنسی فرسٹریشن کی عکاسی کی گئی ہے۔ تقسیم کے زمانے میں دو بھائی ایک کوارٹر پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس تنگ جگہ میں خلوت حاصل کرنے کے لیے دوسرے لوگوں کی طرح شادی شدہ بھائی چھت پر ٹاٹ کے پردے تان لیتا ہے۔ چھوٹا بھائی بھولو جو ابھی جنسی تلذذ سے نا آشنا ہے۔ آس پاس کے جنسی مناظر کو دیکھ کر خواہشات

سے مجبور ہوتا ہے اور شادی کر ڈالتا ہے —— لیکن شبِ زفاف کو جب وہ اپنی بیوی کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے آس پاس کی درجنوں آنکھیں ان کو پردوں کے پیچھے سے تاک رہی ہیں۔ اپنی فطری جذباتی و جسمانی آرزوؤں کی تکمیل نہ ہونے کی بنا پر بھولو اس قدر متزلزل ہوتا ہے کہ ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔

'بلاؤز' میں متوسط طبقے کی جنسی لاپرواہی اور اس کے نتیجے میں گھریلو ملازموں کے درون میں ہونے والی نفسیاتی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مومن ایک خانگی ملازم ہے جو ابھی جوانی کے عمل سے گزر رہا ہے اور اس کے خارج اور باطن میں کئی نوعیتوں کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اس کے آس پاس اسی کی ہم عمر لڑکی شکیلہ ہے جو مومن ہی کی طرح کی تبدیلیوں اور محسوسات سے گزر رہی ہے —— یہ اور بات ہے کہ دونوں کے درمیان ملازم اور مالکہ کی طبقاتی خلیج حائل ہے۔ ان تمام تبدیلیوں کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ نوجوان مومن کے لطیف احساسات اور جذباتی ضروریات کو سمجھنے کے لیے کوئی ہم خیال موجود نہیں ہے۔

'پھاہا' نوبلوغیت کی تبدیلیوں کو ایک نازک جسمانی تبدیلی کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ گوپال اور اس کی بہن ابھی بچپن کی منزل سے نکل کر جوانی کی دہلیز تک ہی پہنچے ہیں، اس اسی لیے اپنے جسموں میں ہونے والی تبدیلیوں سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں۔

'خالی ڈبے خالی بوتلیں' کا فلمی ہیرو رام سروپ عورتوں کے قرب سے کتراتا ہے لیکن خالی ڈبے خالی بوتلیں ذخیرہ کرنے کے معاملے میں نہایت جذباتی ہے۔ رام سروپ کی زندگی میں ایک دن ایسا آتا ہے جب وہ اپنی زندگی کے سونے پن کو دور کرنے کے لیے شادی کر لیتا ہے۔ اب خالی ڈبوں و بوتلوں کی جگہ اس کی بیوی لے لیتی ہے۔

'شاردا' ایک گھریلو عورت تھی، اس کا شوہر اس کو چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا تھا وہ ایک عورت باز شخص نذیر کے ہاتھ لگ جاتی ہے، جو نہایت چالاکی سے اس کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ نذیر شادی شدہ تھا لیکن اپنی کم گوئی اور جسمانی وفاداری کی بنا پر شاردا اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔ نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ جسمانی طور پر نہایت پرگو یہ عورت نذیر کی ازدواجی زندگی میں رخنہ ڈالنے کی حالت میں آجاتی ہے۔ تب نذیر ایک عام مرد کی طرح شاردا کو اپنے اطراف

سے باہر نکال پھینکتا ہے۔

‘**محمودہ**’ ایک شریف، متوسط طبقے کی عورت ہے۔ جب اس کا شوہر اس کی جنسی واقتصادی کفالت میں ناکام رہتا ہے تو پہلے وہ جسم فروشی کرتی ہے اور پھر تقسیم کے ہنگامے میں بہتی ہوئی کراچی پہنچ جاتی ہے۔ کراچی میں بھی وہ قحبہ گری ہی کرتی ہے۔

‘**عورت ذات**’ میں متوسط طبقے کی عورتوں کی خفتہ جنسی تشنگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شریف گھرانوں کی یہ عورتیں بظاہر عریانی اور فحاشی سے پرہیز کرتی ہیں، لیکن جنسی کھیل کود کے تماشے اور عریاں تصاویر پس پردہ ان کو بھی لبھاتی ہیں۔ اسی طرح ‘پری’ میں ایک شریف گھرانے کی عورت، جو جنسی طور پر غیر دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ تشنہ کام بھی ہے، اپنے شوہر کی موجودگی میں غیر اور نامحرم سمجھے جانے والے مردوں کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

‘**ڈارلنگ**’ کی عورت کافی سخت گیر اور باکردار سمجھی جاتی ہے۔ وہ آرٹ کالج کی پرنسپل ہے جہاں وہ طالبات کو صرف عورتوں اور پھولوں کی مصوری کا درس دیتی ہے۔ بظاہر وہ مرد ذات سے متنفر ہے، لیکن تقسیم کے ہنگامے میں وہ ایک اوباش کے ہاتھ لگ جاتی ہے، جہاں اسے اپنے پہچانے جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ عورت نہایت فطری انداز میں اپنے پناہ دینے والے مرد کو اپنا وجود سونپنے کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔ گو کہ اس کی بدصورتی کی بنا پر عین وقت پر مرد اسے مسترد کر دیتا ہے۔

‘بدتمیز’ ایک ایسا افسانہ ہے جس میں سیاسی نظریے اور ذاتی روّیوں کی کشمکش کو بطور موضوع اپنایا گیا ہے۔ عزت جہاں ایک تعلیم یافتہ عورت ہے، جو سیاست، معاشرت معیشت اور سماجیات پر نہایت عالمانہ نقطہ ہائے نظر رکھتی ہے۔ لیکن وہ جنس کو ضروریات انسانی میں شمار نہیں کرتی۔ عزت جہاں کا باطنی کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ ایک دوست کے گھر اپنی جسمانی ضرورت کی چھپ کر تکمیل کرتی ہے۔

‘**سوراج کے لیے**’ کے نوجوان زن و شوہر، نگار اور غلام علی تحریک آزادی کے فعال کارکن ہیں۔ وہ عہد کر لیتے ہیں کہ جب تک ملک کو آزادی نہیں ملے گی وہ جسمانی طور پر غیر وابستہ رہیں گے۔ یہ پرجوش عہد کچھ دنوں بعد دونوں کو گھن کی طرح چاٹنے لگتا ہے کیونکہ وہ

جس راستے پر چل رہے ہیں وہ فطری تقاضوں کے خلاف ہے۔ ادھر سوارج کی منزل بھی دھندلی پڑ جاتی ہے۔ وہ ایک دن اپنا عہد توڑ دیتے ہیں اور آزادی ملنے سے قبل ہی نارمل ازدواجی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

'**نفسیاتی مطالعہ**' عصمت چغتائی کے قبیل کی ایک افسانہ نگار خاتون پر مبنی ہے جو اپنے موضوعات کا جزیاتی مطالعہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ عشق کا کھیل رچاتی ہے اور پھر انہیں فراموش کر دیتی ہے۔ کہانی کے آخر میں وہ ایک مزدور کے جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہے، جب کہ اعلیٰ طبقے کے کئی مرد اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

'**چغد**' ایک شہری نوجوان کی کہانی ہے جو عشق میں تہذیب اور شائستگی کی نزاکتوں کا قائل ہے۔ ایک الھڑ پہاڑی دوشیزہ سے اس کی ملاقات بتدریج محبت میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ لیکن وہ لڑکی ایک ایسے مرد کو اپنا آپ سپرد کر دیتی ہے جو غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہے۔ پڑھا لکھا پرکاش اس غلیظ ڈرائیور کے مقابل خود کو چغد محسوس کرتا ہے۔

'**میرا نام رادھا ہے**' ایک طویل افسانہ ہے، جو بمبئی کی فلم انڈسٹری کے پس منظر میں منٹو نے صیغۂ واحد متکلم میں بیان کیا ہے۔ راج کشور فلم اداکار ہے، جو جنسی طور پر کافی پُرکشش ہے لیکن اپنے ضعفِ مردانگی کو شرافت اور نیک نفسی کے پردوں میں چھپائے رکھتا ہے۔ نیلم عرف رادھا جو ایک طوائف زادی تھی، جب راج کے ساتھ فلم میں کام کرتی ہے تو اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ راج اس سے فاصلہ قائم رکھتا ہے، لیکن ایک دن نیلم زبردستی اس پر جسمانی تسلط قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے تو انکشاف ہوتا ہے کہ راج جنسی طور پر نااہل ہے۔ راج کی چالاکی یہ ہے کہ وہ اپنے چاروں طرف پاکیزگی اور شرافت کا ایک ہالہ بنائے رکھتا ہے۔

'**پڑھیے کلمہ**' تقسیم کے دوران ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھی گئی جنسی ہوس کی کہانی ہے۔ رکمانہ صرف ایک جنس شدہ NYMPHOMANIC عورت ہے، بلکہ ایسی ذہنی بیماری کا شکار بھی ہے کہ مردوں کو جنسی لذت فراہم کرنے کے بعد ان کا قتل بھی کر دیتی ہے۔

'**پانچ دن**' قحط بنگال کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ فاقوں کی ستائی ہوئی

ایک بنگالی دوشیزہ کو ایک پروفیسر اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ ابتداً وہ لڑکی کے ساتھ انسانیت اور شرافت کا ڈھونگ رچاتا ہے، لیکن زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنی دبی کچلی جنسیت حسیت کو آشکار کرتا ہے اور نارمل طریقے سے لڑکی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتا ہے۔ حالانکہ یہ تعلق استحصال اور ریاکاری پر مبنی ہے۔

'وہ لڑکی' ایک ایسے مرد کی کہانی ہے جو فسادات کے دوران ایک بے آسرا لڑکی کو پناہ دے کو اس کا جسمانی استحصال کرنا چاہتا ہے۔ لڑکی سریندر کو چالاکی سے اپنے دام میں پھانس کر اسی کے پستول سے قتل کر دیتی ہے۔ لڑکی کے باپ کو سریندر نے فسادات کے دوران اسی پستول سے ختم کیا تھا۔

'شوشو' دو نوجوان لڑکیوں کا افسانہ ہے، جنہوں نے ابھی ابھی اپنے جسمانی تقاضوں کو سمجھنا شروع کیا ہے۔ شرم وحیا کا دباؤ دونوں پر ہے، اس لیے وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک ابتدائی ہم جنس پرستانہ LESBIAN قسم کے رشتے میں وابستہ ہیں۔

'شیرو' کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ایک کہانی ہے۔ جہاں ایک مزدور لڑکی اور ہیرو کی سرسری ملاقات ہوتی ہے اور یہ ملاقات ایک وقتی جنسی تعلق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ انسانی تعلق کی ادنیٰ اور حیوانی سطح ہے، جہاں عورت اور مرد ایک دوسرے کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہیں۔

'مس فریا' کا نوجوان سہیل خود سے زیادہ عمر کی معمولی شکل والی ڈاکٹر مس فریا کی طرف جسمانی طور پر ملتفت ہوتا ہے کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ اینگلو انڈین اور عیسائی لڑکیاں آسانی سے مردوں کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب سہیل کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ ذہنی وجسمانی طور پر اپنی بیوی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو وہی مس فریا اسے بدشکل اور کمتر نظر آنے لگتی ہے۔

'غسل خانہ' ایک نوجوان کا قصہ ہے جو مرد بننے کے مرحلے میں ہے۔ وہ والدین کے ڈر سے چھپ کر سگریٹ نوشی کرتا ہے اور بیاہ شادی کے موقعے پر مہمان لڑکیوں کو تنگ بھی کرتا ہے۔

(۷)

منٹو باقاعدہ طور پر کسی سیاسی نظریے کے پیروکار نہیں تھے۔ ابتداً وہ ترقی پسندی کی

طرف مائل رہے لیکن پھر انہوں نے آزاد خیالی اور لبرل ازم کو اپنے فن کا محور و مرکز بنایا۔ انہوں نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں اور معاشرے کے مختلف طبقوں کے بارے میں افسانے لکھے، ان سبھی میں ان کے نظریے کی کشادگی اور روشن خیالی برقرار رہی۔ منٹو جس دور میں لکھ رہے تھے وہ برصغیر کی تاریخ کا بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے لے کر چھٹی دہائی تک تحریک آزادی کی صورتوں میں کئی انقلاب رونما ہوئے، دو بڑی جنگیں ہوئیں، انقلابی تحریک چلی، تحریک پاکستان وجود میں آئی۔ ملک تقسیم ہوا اور تقسیم کے سانحے سے بہت طرح کے نتائج برآمد ہوئے۔ منٹو ان سارے انقلابات کو نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ ان سے ذاتی سطح پر متاثر بھی ہو رہے تھے۔ ان تمام واقعات اور تبدیلیوں کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں اکثر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ منٹو کے ان افسانوں کی تعداد خاصی ہے، جہاں انہوں نے سیاست اور سیاسی تبدیلیوں کو بنیادی موضوع بنایا ہے۔ نیا قانون‘ یزید‘ موج دین‘ ایک خط‘ آخری سلیوٹ‘ ٹیٹوال کا کتا‘ ننگی آوازیں‘ دو قومیں‘ سوراج کے لیے‘ ۱۹۱۹ کی ایک بات‘ تماشہ‘ نعرہ‘ خونی تھوک‘ شغل‘ آم‘ ماتمی جلسہ‘ انقلاب پسند‘ جی آیا صاحب‘ ماہی گیر‘ طاقت کا امتحان‘ دیوانہ شاعر‘ چوری‘ دیکھ کبیرا رویا‘ نطفہ‘ شہید ساز‘ شیر آیا شیر آیا دوڑنا‘ ترقی پسند‘ اور ’بد تمیز‘ وغیرہ وہ افسانے ہیں جہاں منٹو نے براہ راست سیاست کو موضوع بنایا ہے۔

’نیا قانون‘ منٹو کا شاہکار سیاسی افسانہ ہے جس کو ترقی پسند و غیر ترقی پسند سبھی ناقدین نے ان کی اعلیٰ ترین تحریروں کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ یہاں فن اور سیاست اپنے امتزاج کی بہترین شکل میں نظر آتے ہیں۔ منگو کوچوان سیاسی نظریات کے اختلاف اور ان نظریات کی لفظیات سے نابلد ہے، تاہم ذاتی ذلتوں نے اسے سکھایا ہے کہ سامراج کی مشینری عام ہندوستانی باشندے کے لیے نہ صرف استحصالی ہے بلکہ وقار کے منافی بھی ہے۔ اس لیے ۱۹۳۵ کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ پر وہ اپنے باطن میں مسرت کی ایک ایسی لہر محسوس کرتا ہے کہ گویا اسے غلامی کے ظالمانہ شکنجے سے نجات مل گئی ہے۔ تاہم منگو کی یہ مسرت لمحاتی ثابت ہوتی، جب اسے کافی قیمت ادا کرنے کے بعد علم ہوتا ہے کہ بنیادی حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔

جنگ، کشمیر کے حوالے سے منٹو کے افسانوں میں اکثر بطور موضوع پائی جاتی ہے۔ ‘یزید’ ‘موج دین’ ‘ایک خط’ ‘آخری سلیوٹ’ اور ‘ٹیٹوال کا کتا’ چاروں افسانے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوئی کشمیر کی پہلی جنگ ۱۹۴۷ـ۴۹ کے پس منظر میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ صرف اتفاقی امر نہیں ہے کہ بحیثیت مصنف ان افسانوں میں منٹو کا رویہ جنگ کے خلاف ہے۔ ‘یزید’ کا کسان کرم داد جب اپنے گاؤں والوں کو آگاہ کرتا ہے کہ دشمن کو ان کا پانی بند کرنے کا حق اسی منطق سے حاصل ہوتا ہے، جس کے تحت خود ان کی افواج کو دشمن پر بم گرانے کا ہے۔ کیونکہ جنگ کی اخلاقیات دشمن کے کمزور پہلوؤں پر وار کرنے اور طاقت کے استعمال پر قائم ہوتی ہے، نہ کہ جائز و ناجائز کے سوال پر۔ کرم داد دراصل منٹو کی فکر کا آئینہ دار کردار ہے جو جنگ کے انسان دشمن پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ ‘موج دین’ میں ایک معصوم بنگالی آزاد کشمیر کے علاقے میں جاسوسی کے فرضی الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ بنگالی موج دین اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے خود کشی کر لیتا ہے، لیکن اپنی جان دینے کے بعد بھی اس کو کوئی ہمدرد میسر نہیں ہوتا۔ ‘ٹیٹوال کا کتا’ کشمیر کی جنگ کے دوران ہوئے ایک واقعے پر مبنی ہے۔ اس موقع پر ہندو ـ مسلم منافرت کا شکار ایک جانور ہوتا ہے، جس کو دونوں ملکوں کے سپاہی اس لیے گولی مار دیتے ہیں کہ اسے دونوں طرف دشمن کا نمائندہ سمجھنے کی حماقت کی جاتی ہے۔ ‘آخری سلیوٹ’ میں ہندوستان اور پاکستان کے وہی سپاہی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں، جو ابھی چند ماہ قبل تک ایک ہی فوج کا حصہ تھے اور باہم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ صوبہ دار رب نواز جیسے سادہ ذہن کا فوجی تیزی سے بدلے ہوئے واقعات سے ذہنی مفاہمت نہیں کر پاتا اور اپنے پرانے دوست رام سنگھ کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ ‘ایک خط’ کا افسانہ نگار جو دراصل سعادت حسن منٹو ہی ہے، واضح الفاظ میں کشمیر کی جنگ کو لاحاصل سمجھتا ہے اور اس کی مذمت کرتا ہے۔

‘ننگی آوازیں’ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں مہاجر طبقے کی ذاتی محرومیوں اور نفسیاتی الجھنوں کی کہانی ہے۔ یہ ایک ایسا خطۂ زمین ہے جہاں بے یار و مددگار انسانوں کو بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ ٹاٹ کے روشن پردوں کے پیچھے غریب طبقے کے ان مہاجرین کے

پرائیویٹ لمحات‘ عریاں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تقسیم کے تعلق سے کئے گئے کسی سیاسی فیصلے میں شریک نہیں تھے لیکن تقسیم کے نقصان دہ نتایج کے سب سے زیادہ شکار بنے۔

‘دو قومیں‘ اس پسماندہ مذہبی ذہنیت پر طنز ہے جہاں محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو بھی مذہب کی ترازو میں تول کر دیکھا جاتا ہے۔ شاردا اور مختار جذباتی طور پر اس قدر نزدیک آچکے ہیں کہ شریک حیات بننے کا فیصلے کر لیتے ہیں۔ لیکن دونوں کے خواب اس وقت بکھر جاتے ہیں جب مختار، شاردا کا مذہب تبدیل کرانے پر مصر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اس کا مذہب شاردا کے عقیدے سے افضل تر ہے۔ رد عمل کے طور پر شاردا کو اپنی مذہبی شناخت یاد آجاتی ہے اور یہ معصوم رشتہ مذہبی منافرت کی بنا پر ٹوٹ جاتا ہے۔

‘سوراج کے لیے‘ کا دار العمل منٹو کا شہرِ ولادت امرتسر ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تحریکِ آزادی عروج پر تھی۔ ۱۹۱۹ کے جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد شہر کی فضا تشدد ‘احتجاج، خوف اور تشنج سے لبریز تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ تمام شہر سڑکوں پر اتر آیا ہے۔ لوگ نعرے لگاتے تھے۔ حکومت مخالف مظاہروں میں شرکت کرتے تھے اور جیل چلے جاتے تھے۔ چند ماہ کی سزا کاٹ کر باہر نکلتے تھے تو پھر نعرے لگاتے تھے اور خوشی خوشی قید کر لیے جاتے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے مرکزی واقعے کے متوازی ایک ذیلی واقعہ شہزادہ غلام علی اور اس کی بیوی نگار کا ہے۔ دونوں کانگریس کی تحریک سے وابستہ تھے۔ شادی کے موقع پر یہ زن وشوہر عہد کر لیتے ہیں کہ تب تک ازدواجی تعلق قائم نہیں کریں گے، جب تک ملک میں سوراج نہیں آجاتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ تحریک کا جوش وخروش دھیما پڑ جاتا ہے۔ اور دونوں کے اعصاب پر اضمحلال طاری ہونے لگتا ہے۔ اپنے فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر دونوں ایک دن اپنا عہد توڑ دیتے ہیں —— سوراج طویل عرصے کے بعد ملتا ہے۔

‘۱۹۱۹ کی ایک بات‘ کا دار العمل بھی تحریکِ آزادی کے عروج کا امرتسر ہے ۔ ہر طرف گرفتاریوں اور شہادتوں کا ماحول گرم ہے۔ بڑے سیاسی رہنما نظر بند ہیں یا شہر بدر کر دیئے گئے ہیں، نتیجتاً عام شہری غیر منظم طریقے سے حکومت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ طوائف زادہ طفیل عرف تھیلا کنجر اس ہیجان کے زیر اثر پولیس فائرنگ میں مارا جاتا ہے۔ لیکن

جب اس کی خوبصورت بہنوں کو انگریز افسران 'دادِ عیش' کے لیے بلاتے ہیں تو وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کے روبرو احتجاج تک نہیں کرتیں۔ یہ ان عورتوں کی زندگی کا تاریک ترین پہلو ہے کہ ان کی قومی اور شخصی دونوں غیرتیں کچلی جا چکی ہیں۔

'تماشہ' منٹو کا اولین افسانہ ہے۔ یہاں انہوں نے جلیانوالہ باغ کے سانحے کو ایک بچے کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو سرتاسر حقیقی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۹۱۹ میں منٹو کی عمر سات سال تھی۔ اُس وقت امرتسر کی فضا پر برطانوی فوج کی دہشت مسلط ہے۔ آٹھ سالہ خالد بھی، واقعات کو پوری طرح نہ سمجھ پانے کے باوجود، خوف کی گرفت میں ہے۔ جب اس کے سامنے ایک بچہ پولیس کی گولی کا شکار ہوتا ہے تو اس کے اندر نادیدہ سامراجی دشمن کے خلاف احتجاج اور نفرت کے جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔

'نعرہ' کا کیشولعل ایک غریب کرایہ دار ہے۔ جس کو حالات نے نہایت کمزور بنا دیا ہے۔ وہ کھولی کا کرایہ نہیں دے پاتا اور امید کرتا ہے کہ اس کی بلڈنگ کا مالک سیٹھ اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے گا۔ لیکن سیٹھ، کیشولعل کو دو بار گالی دیتا ہے تو اس کی عزتِ نفس کو گہری ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہی کیشولعل جو کبھی کسی کا مقروض نہیں رہتا تھا، گالیاں کھا کر نفرت اور بے آبروئی کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ جب اس کے اندر کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے تو وہ ایک فلک شگاف نعرہ لگا کر اپنے دل کا غبار نکالتا ہے —— یہ کمزور کا احتجاج ہے۔

'خونی تھوک' منٹو کے ابتدائی افسانوں میں سے ایک ہے، جب ان کی فکر پر اشتراکیت کے اثرات غالب تھے۔ یہ ایک ترقی پسند افسانہ ہے۔ جس میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک سفید فام مسافر جب ایک ہندوستانی مزدور کو ٹھوکروں سے مار اڈالتا ہے تو دوسرے مزدور اس ظلم کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ مسعود جو منٹو ہی کی ذات کا عکس ہے، مزدور طبقہ سے نظریاتی ہمدردی رکھتا ہے، لیکن اس کے اندر پسماندہ طبقے کو متحد کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

'شغل' میں جب کچھ مزدوروں کی آنکھوں کے سامنے ایک پسماندہ ذات کی دوشیزہ کو کچھ خوشحال لوگ بے عزت کرنے کے لیے کار میں بٹھا کر لے جاتے ہیں تو یہ غریب لوگ اس ظلم

کے خلاف لڑنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ مگر ان کی بغاوت بلبلے کی طرح بیٹھ جاتی ہے اور یہ مزدور خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔

'آم' میں منٹو کا طبقاتی شعور واضح ہوتا ہے۔ ایک معمولی ملازم عسرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن افسران کے سامنے جھوٹے پندار کو قائم رکھنے کے لیے آم کی ڈالیاں پیش کرتا ہے۔

'**ماتمی جلسہ**' ایک سیاسی طنزیہ افسانہ ہے۔ کمال اتاترک کی وفات پر ایک مسلم علاقے میں ماتمی جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ تقریروں کے دوران جذباتی انتہا پسندی اور لفاظی کا تماشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکثر سامعین واجبی طور پر تعلیم یافتہ ہیں اور صرف اتنا جانتے ہیں کہ اتاترک ایک بڑا رہنما تھا جس نے برطانیہ اور یونان کو اپنی قوت وتدبیر کے آگے پسپا کر دیا تھا۔ لیکن جب ایک مقرر یہ بتاتا ہے کہ اتاترک کٹھ ملاؤں کے خلاف تھا، اس نے مذہب کو تعلیم سے علیحدہ کر دیا تھا اور مسلمانوں کو روایتی لباس کے بجائے مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا تھا تو حاضرین مقرر کے خلاف ہو جاتے ہیں اور اس کو لہولہان کر دیتے ہیں۔

'**انقلاب پسند**' منٹو کے ابتدائی، افسانوں میں شامل ہے۔ جو پہلی دفعہ علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا۔ کہانی کا مرکزی کردار سماج میں موجود عدم مساوات کے بارے میں اس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ 'جی آیا صاحب' بھی اسی طرح کا مبتدیانہ افسانہ ہے۔ جس میں خانگی ملازموں کے استحصال اور مالکان کے غیر انسانی سلوک کو اجاگر کیا گیا ہے" ماہی گیر" وکٹر ہیوگو کی نظم پر مبنی ہے۔ افسانے میں ایک غریب ماہی گیر کی فطرت کی سفاک قوتوں اور افلاس سے جدوجہد کی تصویر پیش کی گئی ہے 'طاقت کا امتحان' ایک کمزور کی مفلسی اور دردناک موت کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ اولاً باری علیگ کے رسالہ 'خلق' میں شائع ہوا تھا۔

'دیوانہ شاعر' ایک فلسفی قسم کا انقلابی ہے، جو سماجی تنظیمِ نو کا طلب گار ہے، جس کے لئے سوشلزم کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ 'چوری' کا بزرگ فلسفی باباجی نوجوانوں کو وہ چیزیں کسی بھی ذریعہ سے حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے جو ان سے چرائی گئی ہیں۔

'دیکھ کبیرا رویا' ایک سیاسی وسماجی طنزیہ ہے، جس میں پاکستان کی نئی مملکت میں مختلف نظریوں اور طبقوں کی ریاکاری پر طنز کیا گیا ہے۔ یہاں صورتحال یہ ہے کہ پورا معاشرہ دورنگی

اقتدار کا شکار ہے اور کوئی ایسا معتبر فلسفی، دانشور یا مصلح قوم موجود نہیں ہے جو سوسائٹی کو دیانتداری و رحم دلی کی ترغیب دے سکے۔ کبیر دراصل ایک ایماندار اور دردمند ادیب کا ضمیر ہے، جو اس نظام میں قدم قدم پر ذلت و تضحیک کا شکار ہوتا ہے۔

'نطفہ' کا مرکزی کردار ایک سیدھا سادہ سرحدی پٹھان ہے جو ملک کے سماجی حالت میں بنیادی اصلاحات کا خواہاں ہے۔ لیکن اس کے پاس کوئی مبسوط سیاسی نظریہ نہیں ہے۔ اسی لئے وہ پہلے سرخ پوش بنتا ہے پھر مسلم لیگ کارکن۔ لیکن جب قیام پاکستان کے بعد لیگیوں نے قومی ذرائع کی لوٹ کھسوٹ مچادی تو خان جیسے لوگ پارٹی سے خارج کر دیئے گئے۔ خان ادبدا کر جسم فروشوں کے درمیان پناہ لیتا ہے جہاں اسے عیاری اور بدعنوانی کم سے کم نظر آتی ہے۔

'شہید ساز' ایک طنزیہ ہے جس میں تقسیم کے بعد ہونے والی سماجی اتھل پتھل میں نئے دلال کلچر کے وجود میں آنے پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ بے گھربار لوگوں اور مغویہ عورتوں کی باز آبادکاری کے لیے جب سرکاری منصوبے شروع کئے گئے تو ان میں ایسے عناصر بھی شامل ہوگئے جو سماجی خدمت کی آڑ میں بدعنوانی اور بدکرداری کو فروغ دے رہے تھے۔ کہانی کا مرکزی کردار عام آدمیوں کی بپتاؤں سے پیسہ کمانے کا ماہر ہے۔

'شیر آیا شیر آیا دوڑنا' نیم علامتی طرز کی کہانی ہے جس میں پاکستانی معاشرے میں موجود تنگ نظری اور روایت زدگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں سوال اٹھانے والے کو سازشی، غدار اور ترقی پسند بمعنی اسلام دشمن قرار دے دیا جاتا ہے۔

'ترقی پسند' ایک طنزیہ افسانہ ہے جو دیویندر ستیارتھی اور راجندر سنگھ بیدی کے کرداروں کے چربے بنا کر مرتب کیا گیا ہے۔ ستیارتھی نے اس کے خلاف جواباً 'نئے دیوتا' شائع کیا جس میں منٹو کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ تاہم 'نئے دیوتا' 'ترقی پسند' کے بہ نسبت کمزور افسانہ ہے۔

'بدتمیز' بھی 'ترقی پسند' ہی کے قبیل کی کہانی ہے جہاں ترقی پسندوں کی ذاتی کمزوریوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

(۸)

منٹو اپنے کرداروں کی نفسیاتی تبدیلیوں اور ان کی باطنی جذباتی اتھل پتھل کو عموماً

نہایت صناعانہ ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے چند افسانے ایسے ہیں جہاں نفسیاتی ژرف بینی اپنی انتہائی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ ان افسانوں کی فہرست میں ننگی آوازیں، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سوراج کے لئے، تقی کاتب، مسٹین والا، ساڑھے تین آنے، ٹیڑھی لکیر، بانجھ، گولی، عورت ذات اور موچنا، وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

‘ننگی آوازیں’ میں بھولو کا ہوش وحواس کھو بیٹھنا اس کی جنسی محرومی کا براہ راست نتیجہ ہے۔ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ جسمانی ضروریات کی عدم تکمیل کس طرح انسان کو کبھی کبھی ذہنی عدم توازن کی طرف لے جاتی ہے۔ ‘ٹوبہ ٹیک سنگھ’ کے بشن سنگھ کا پاگل ہو جانا بھی اس کے خارجی حالات کے دباؤ کی عدم برداشت کا پیدا کردہ معلوم ہوتا ہے۔

‘سوراج کے لئے’ کے زن وشوہر کی زندگی میں ایک نامعلوم سی مردنی اور مایوسی کا دور دورہ رہتا ہے کیونکہ وہ نارمل جنسی روابط قائم نہ کرنے کا سیاسی عہد کر چکے ہیں ان کا باطن جب ہی آسودہ اور سرسبز ہوتا ہے جب وہ اپنے اس غیر فطری عہد کو توڑ دیتے ہیں۔

‘تقی کاتب’ ایک کمزور شخصیت کا نوجوان ہے۔ جو شادی کے بعد بھی اپنے تحکم پسند باپ کے دباؤ میں بسر کرتا ہے۔ باپ بیٹے کی شادی کرنے کے بعد اس کو اس کی دلہن سے نہ صرف دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ خود جنسی طور پر اس کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ شاید اسی بزرگ کے جنسی PERVERSION کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی بیوی کی ناوقت موت کے بعد تجرد کا لمبا عرصہ گزارا تھا۔ نوبت یہاں تک آتی ہے کہ باپ بیٹے میں تنازعہ شروع ہو جاتا ہے۔ انجام کار تقی کاتب اپنی بیاہتا کو لے کر باپ سے الگ رہنے لگتا ہے اور آزادانہ جنسی زندگی بسر کرتا ہے۔

‘مسٹین والا’ کا مرکزی کردار زیدی بچپن کی ایک نفسیاتی گتھی کا شکار ہے۔ جب وہ اسکولی طالب علم تھا تو ایک غنڈا شخص اس پر لوطی قسم کی جنسی نظر رکھتا تھا۔ زیدی اس آدمی مسٹین والا سے خوفزدہ رہتا تھا۔ ادھیڑ عمر میں جب اس کے گھر میں ایک بلا نظر آتا ہے تو اس کی شکل میں زیدی کو بچپن کے زمانے کا وہی غنڈہ مسٹین والا نظر آتا ہے۔ چنانچہ بچپن کے تمام خوف اور الجھنیں جو زیدی کے تحت الشعور میں وقت گزرنے کے ساتھ دب گئے تھے۔ دوبارہ عود کر آتے ہیں اور وہ بلے کی موجودگی میں بیمار رہنے لگتا ہے۔

‘**ساڑھے تین آنے**’ میں جرائم کے معاشی ونفسیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پھگو بھنگی افلاس سے مجبور ہو کر چھوٹی موٹی چوریاں کرتا ہے۔ حالانکہ ذاتی مراسم میں وہ نہایت ایماندار اور خدا ترس آدمی ہے۔ منٹو کا نظریہ افسانہ میں پیش کیا گیا ہے کہ انسان از خود جرائم کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ اس کے خارجی، داخلی حالات اور عوامل اس کو جرائم کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔

‘**ٹیڑھی لکیر**’ ایک ایسے معمولی نوجوان کی کہانی ہے جس کی زندگی میں کسی طرح کی کشش یا ایڈونچر نہیں ہے۔ زندگی میں نیاپن پیدا کرنے کے لیے وہ اپنی ہی منکوحہ کو کہیں لے کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اطراف میں موضوع بحث بن کر اہم شخصیت بننے کی کوشش کرتا ہے۔

‘**بانجھ**’ ایک ایسے کمزور و بیمار نوجوان کی کہانی ہے جو جذباتی طور پر کبھی پھل پھول نہیں سکا وہ اپنے اطراف و جوانب سے کٹا ہوا رہتا ہے۔ تاہم وہ ایک فرضی عشق کی کہانی گڑھتا ہے اور زندگی بھر عورت کی محبت اور قرب سے محروم رہنے کے بعد تھوڑی سی اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور آخر کار وہ ایک دن خودکشی کر لیتا ہے۔ دراصل اس کی جذباتی محرومیاں اسے جسمانی طور پر بیمار بنا دیتی ہیں۔

‘**گولی**’ میں ایک عام ہندوستانی عورت کی مرد پر اجارہ قائم کرنے کی ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ عائشہ اور اس کا خاوند، ایک ایسی لڑکی سے دوچار ہوتے ہیں جو ذہین و خوبصورت ہے، مگر اس کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کا نچلا جسم مفلوج ہے۔ عائشہ اس لڑکی نگہت سے شدید ہمدردی محسوس کرتی ہے۔ لیکن جب اسی جذبہ انسانی سے لبریز ہو کر اس کا شوہر نگہت سے عقدِ ثانی کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے تو عائشہ چراغ پا ہو جاتی ہے۔

‘**عورت ذات**’ میں فحاشی و عریانی کے سوال اور ان امور پر متوسط طبقے میں موجود TABOOS کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جب شوہر گھر میں بیوی کو عریاں فلم دکھانا چاہتا ہے تو وہ نہایت سختی سے اس کو روکتی ہے، لیکن یہی شریف عورت، شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی ہم عمروں کے ساتھ مل کر اس ثمرِ ممنوعہ سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

‘**موچنا**’ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے۔ جو بہت دنوں تک ایک مرد کے ساتھ نہیں رہ پاتی۔ مایا ایک معمولی صورت و شکل کی عورت ہے جو جنسی طور پر نہایت فعال اور پرکشش ہے

۔ دراصل مردوں کو اپنے تحکم میں رکھنا اس کی فطرت کا جزو ہے اور ایک قسم کی طوائفیت اس کے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔

(۹)

منٹو کے افسانے عموماً کرداری افسانے نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ کردار سے زیادہ تھیم پر توجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے اکثر کردار کسی خاص تھیم یا فضا کو فروغ دینے یا مستحکم کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ویسے بھی افسانے کی محدودیت کرداروں کو پھلنے پھولنے کے مواقع کم ہی فراہم کرتی ہے۔ منٹو کے زیادہ تر افسانے تو مختصر ہیں جو دس سے کم ہی صفات پر مشتمل ہیں۔ ان کے طویل افسانوں کی تعداد نصف درجن تک بمشکل ہی پہنچ پاتی ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کی بنا پر کسی بڑے کردار کی تشکیل پانا ایک مشکل امر ہے۔

تاہم منٹو کے چند کردار ایسے ہیں جو قاری کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں، بابو گوپی ناتھ ان میں سرِ فہرست ہے۔ بظاہر سیدھا سادہ اور بیوقوفی کی حد تک دولت لٹانے والا رئیس زادہ گوپی ناتھ اپنے اندر ایک عجیب قسم کی پیغمبرانہ شان رکھتا ہے۔ وہ ایک جہاں دیدہ شخص ہے اور بخوبی واقف ہے کہ اس کے آس پاس جو حلقہ مصاحباں منڈلا رہا ہے، وہ اس کے ہمراہ اسی لمحے تک رہے گا جب تک کہ اس کی دولت ختم نہیں ہو جاتی۔ گوپی ناتھ دنیا کا ہر ناجائز و جائز عیش کر چکا ہے اور عیاشیوں میں اس قدر غرق رہا ہے کہ اس کی روح تک آلودہ ہو چکی ہے۔ شاید اس کا ضمیر ہے جو اب ان آلودگیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے بے چین کر رہا ہے۔ گوپی ناتھ ہر طرح کی اور ہر عمر کی عورتوں سے فیض یاب ہو کر جسمانی تعیشات کے تسلسل سے اکتا چکا ہے۔ اسی لیے وہ آبائی دولت کو چراغ کے تیل کی طرح اندھا دھند جلا رہا ہے۔ یہ دولت جو گوپی ناتھ کو وراثت میں ملی ہے، ناجائز ہی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے خطۂ زمین کا مکین ہے جہاں دولت اور اس کی افراط کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عزت دونوں عموماً ناجائز اعمال سے حاصل شدہ ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ اپنی دولت اور عزت کا چراغ گل ہونے سے پہلے پہلے زینت کا گھر بسا جاتا ہے۔ زینت ایک بازاری عورت ہے لیکن اس کا بازاری پن بھی گوپی ناتھ کی طرح نہایت معصومانہ اور ناوابستہ DETACHED قسم کا ہے۔

گوپی ناتھ کے بارے میں ایک اور بات اہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ گوپی ناتھ وہ واحد کردار ہے جس کے مقابل منٹو خود کو حقیر اور بے حس انسان ثابت کرتا ہے۔ گوپی ناتھ کے طور طریقے اور طرزِ فکر اس کے اندر کسی بھی طرح سے عظمت کی نشاندہی نہیں کرتے۔ لیکن یہ منٹو کے کرافٹ کی مہارت ہے کہ کہانی کے آخری حصے میں وہ منٹو کا عظیم ترین کردار بن کر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں ایک کردار نام بدل بدل کر کئی بار سامنے آتا ہے۔ یہ ایک پہلوان نما، غنڈہ صفت، ناتراشیدہ مگر روح کی گہرائیوں میں از حد نیک اور بھولے شخص کا کردار ہے۔ یہ کردار کبھی منگو کوچوان کی شکل اختیار کرتا ہے، کبھی دودا پہلوان بن کر اپنے مالک کو بحران کا شکار ہونے سے بچاتا ہے، کبھی ممد بھائی بن کر اپنے علاقے کی بہو بیٹیوں کی عصمت کی حفاظت کرتا ہے، کبھی جگی پہلوان کی شکل میں غیر مذہب کی لڑکیوں کی شادی کے لیے ہزاروں خرچ کرتا ہے۔ کبھی یہ تھیلا کنجر بن جاتا ہے، جس نے زندگی بھر اپنی ماں اور بہنوں کے جسموں کی کمائی پر بسر کی تھی لیکن غیر ملکی غلامی کے خلاف اظہارِ نفرت کرتے ہوئے جان لٹا دیتا ہے۔ کبھی ابو کوچوان بن کر بغیر سوچے سمجھے ایک راہ چلتی ٹیار کو شریکِ حیات بنالیتا ہے اور اس رشتے کے صلے میں جیل جا کر جان دے دیتا ہے۔ یہی شخص کبھی کریم دادا بن جاتا ہے جو کئی قتل کر چکا ہے لیکن ایک نومولود بچے کا گلا گھونٹنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، کبھی یہ قادرا قصائی بن جاتا ہے جو لاہور شہر کی حسین ترین کسبی کو اپنے آس پاس نہیں پھٹکنے دیتا، کبھی یہ شیرا بن جاتا ہے جو امرتسر میں جوئے کا اڈہ چلاتا ہے لیکن دشمنوں کے قبیلے کی بھاگ کر آئی ہوئی بیٹی سے باعزت طریقے سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور اسی معاملے میں قتل کا مرتکب ہو کر جیل چلا جاتا ہے۔ یہی شخص کبھی امین پہلوان بن جاتا ہے جو روزی کمانے کے لیے دوسروں کے جرائم اپنے سر لے لیتا ہے اور جیل خانے آتا جاتا رہتا ہے۔

یہی بظاہر بدکردار مگر بباطن بہترین انسانی صفات کا حامل شخص جب معاشرے کے کمزور طبقے کا نمائندہ بنتا ہے تو کبھی رام کھلاون بن کر فرقہ وارانہ جنون کے ماحول میں بھی ایک مسلمان کی جان بچاتا ہے، کبھی سہائے بن جاتا ہے جو حسن فروشوں کی دلالی کرتا ہے۔ لیکن ایک مسلم عورت کا زیور واپس دینے کے چکر میں مسلم غنڈوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ یہ کبھی ڈھونڈو دلال بن جاتا ہے جو ایک نو عمر طوائف کے عاشق کو کھوج کر نیک کام انجام دیتا ہے۔ منٹو ان

کرداروں کی ظاہری بدنمائی اور غلاظت کے اندر سے ان کی روح کی خوبصورتی اور باطن کی پاکیزگی کو اجاگر کرتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں اس عورت کا کردار بھی اکثر نظر آتا ہے۔ جس کا بنیادی وصف اس کے اندر ابلتا ہوا جذبۂ مادری ہے۔ یہ منٹو کے عصر کی مشرقی ETHOS کی ایک اہم شناخت ہے جسے وہ کمزور طبقے سے متعلق اور جسم فروشی جیسے غلیظ سمجھے جانے والے پیشے سے وابستہ عورتوں کے اندر تلاش کر کے اس کو اجاگر کرتے ہیں۔ شاردا ایک ایسی ہی عورت ہے، جو اپنے شوہر کی فریب دہی کی شکار ہو کر دربدر ہونے پر مجبور ہوتی ہے۔ وہ نذیر کو اس کمزور لمحے میں اپنا سب کچھ سونپنے پر تیار ہو جاتی ہے جب وہ انتہائی چالاکی سے اس کی بیمار بچی کی تیمارداری کرتا ہے۔ اس لمحے کے بعد شاردا کی مامتا نذیر کے لیے وقف ہو جاتی ہے اووہ رغیر ارادی طور پر نذیر کی منکوحہ کا مقام لے لیتی ہے —— یہ اور بات ہے کہ نذیر ایک دن اچانک اس کو اپنی زندگی سے باہر نکال پھینکتا ہے۔

شوبھا بائی عرف فوبا بائی ایک عجیب و غریب مزاج کی طوائف ہے۔ وہ اپنے تماش بینوں سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کو ترجیح دیتی ہے اور پیسے و دولت کی اس درجہ دشمن ہے کہ اپنی موٹر کار اور زیورات ڈاکٹر خان کے پاس چھوڑ کر اپنے بچے سے ملنے چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کا بچہ مر جاتا ہے تو وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔

'سڑک کے کنارے' ایک مشرقی عورت کی نفسیاتی محرومیوں کا بہترین آئینہ دار افسانہ ہے۔ کہانی کا بنیادی کردار وہ بن بیاہی عورت ہے، جس کو کسی مرد نے محبت کا فریب دیکر جسمانی اور جذباتی طور پر استعمال کیا ہے۔ عورت اس فریب میں خود کو لٹا کر اپنے وجود کی تکمیل کرنا چاہتی ہے لیکن اس سے قبل مرد، اپنی حیوانی خواہشات کی تکمیل کر کے پیش منظر سے روپوش ہو جاتا ہے۔ باقی رہ جاتا ہے ایک ننھا وجود جو عورت کے وجود کے اندر آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ عورت بخوبی واقف ہے کہ یہ نیا وجود اس کے آس پاس کے پسماندہ سماج میں رسوائی اور تذلیل کا موجب بنے گا۔ مزید ستم یہ کہ یہ نوزائیدہ وجود بھی ایک لڑکی کی شکل میں دنیا میں آیا ہے۔ مجبور عورت دوسری بار اپنی فطری آرزوؤں کو قتل کر کے نوزائیدہ بچی کو سڑک پر ڈال آتی ہے۔ عورت کی ناجائز سمجھی جانے والی اولاد کا بچی کی شکل میں پیدا ہونا بجائے خود ایک نئے سوال کو جنم دیتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا اس بچی کا

مستقبل بھی ماں ہی کی طرح تاریک رہے گا؟

ممی ایک ڈھلی ہوئی عمر کی بدنام پیشہ عورت ہے۔ جس کا پیشہ عیاش مردوں کے لئے لذتیں فراہم کرنے کا ہے۔ ممی اپنے گاہکوں سے ماں کا سا رویہ اختیار کرتی ہے، جو اس کے کاروبار چلانے کا ایک گر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی روح کا درخشاں جوہر اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ ایک نوعمر لڑکی کو جنسی تلذذ کے طلب گاروں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر قسم کا نقصان اٹھانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اس کا منہ بولا بیٹا چڈہ جب بستر علالت سے بستر مرگ پر پہنچ جاتا ہے تو یہی اخلاق باختہ ممی رات دن اس کی خدمت کر کے اس کو فرشتۂ اجل کی گرفت سے چھڑا لاتی ہے۔ منٹو دکھاتے ہیں کہ ایک دلالہ کے قالب میں بھی ایک مامتا بھرا اور دردمند دل موجود ہو سکتا ہے۔

‘مسز ڈی کوسٹا’ بھی مسز اسٹیلا جیکسن عرف ممی کے قبیل کی بدنما سی عورت ہے جس کی روح انتہائی خوشبودار ہے۔ اینگلو انڈین نژاد ہونے کی بنا پر مسز ڈی کوسٹا برطانوی اقتدار کی حمایتی تھی لیکن جذباتی طور پر ہندستانیوں سے ہی وابستہ تھی۔ وہ عام ہندستانیوں کی طرح پڑوسیوں کے معاملات میں دخل دینا اور عیش کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہے۔ جب پڑوس کی ایک مسلم عورت کے یہاں پیدائش کے دن قریب آ جاتے ہیں تو وہ ایک مشرقی پڑوسن اور معالج کا مکمل رول ادا کرتی ہے۔

منٹو کے کچھ کردار ایسے ہیں جو عام ڈگر سے ہٹے ہونے کی بنا پر دلچسپ نظر آتے ہیں۔ مثلاً ‘گرم سوٹ’ کا سردار گنڈا سنگھ ہے، جو بارہ مہینہ ایک گرم سوٹ پہنے رہتا ہے جو غلیظ رہتا ہے۔ لیکن اس غلاظت میں بھی اس کی معصومیت صاف نظر آتی ہے۔

‘جنٹل مینوں کا برش’ ایک خدمتِ خلق کرنے والا شخص ہے، جو باصلاحیت ہے لیکن شاید احساسِ کمتری کی بنا پر کھل کر زندگی بسر کرنے سے محروم ہے۔ وہ بڑے لوگوں کے ساتھ نتھی ہو کر خود کو اہم بنا لیتا ہے ‘اب اور کہنے کی ضرورت نہیں’ کا امین پہلوان شہر کا بڑا غنڈہ شمار کیا جاتا ہے لیکن عورتوں سے اس قدر خوف زدہ رہتا ہے کہ ان کے آس پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ جب ایک عورت امین پہلوان کے گھر اور زندگی میں زبردستی گھس آتی ہے تو پھر وہ اس کو بغیر تامل اپنا لیتا ہے۔

‘نطفہ’ کا خان صوبۂ سرحد کا ایک سیاسی کارکن تھا، جو سزا کے طور پر صوبہ بدر کیا گیا تھا۔ خان اپنے علاقہ کا رئیس بھی تھا اور اس کے دل و دماغ قوم کی فلاح کے منصوبے سے پر تھے۔ لاہور آ کر وہ

طوائفوں سے وابستہ ہو جاتا ہے اور انجام کار ایک جسم فروش سے نکاح کر کے بالا خانہ پر ہی اقامت اختیار کر لیتا ہے۔ خان کو طوائف کے ساتھ رہنے میں بڑی آسانی محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ''میں نے اپنی پولیٹیکل لائف میں صرف یہ سیکھا ہے کہ زندگی میں تم جس کو بھی شریک بناؤ اٹیچی کیس کی طرح ہونی چاہیے۔ جس کو تم ہاتھ میں اٹھا کر چلتے بنو یا اسے وہیں چھوڑ دو۔ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہیے۔'' دراصل خان نے پاکستان کی سیاست میں اس قدر بے ضمیری اور بدعنوانی کا مشاہدہ کیا تھا کہ اس کا آئیڈیل ازم یکسر ختم ہو گیا تھا۔

منٹو نے کچھ افسانے کشمیر کے فطری حسن اور وہاں کے مکینوں کی سادہ لوحی کے پس منظر میں بھی تصنیف کیے ہیں۔ یہ ان مہینوں کے تجربات کی پیداوار ہیں جب وہ صحت یابی کے لئے بٹوٹ کے مقام پر رہے تھے جو جموں اور وادی کشمیر کی درمیانی سڑک پر واقع ہے۔ ان سبھی کہانیوں میں کشمیری قبائلی دوشیزہ اور شہری ماحول کے سیاح نوجوان کے تعلق کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ 'بیگو' ایک بدنام لڑکی ہے کیونکہ اکثر سیاح اس کے حسن کی تعریف کرتے ہیں اور میٹھے الفاظ سنتے ہی وہ خوبصورت سپنے دیکھنے لگتی ہے۔ بیگو اس قدر سادہ ہے کہ مردوں کی چالاکیوں کو سچ سمجھ بیٹھتی ہے۔ اس کے جنگلی ماحول میں سماجی پابندیوں کا دباؤ بھی اس قدر نہیں ہے کہ وہ گھر میں پردہ نشیں ہو کر بیٹھ جائے یا اجنبیوں سے بات چیت نہ کرے۔ 'چغد' کی پہاڑی ہیروئن ساوتری مہذب اور شائستہ آرٹسٹ پرکاش کی پاک وصاف محبت کی بجائے ایک ڈرائیور کی پرجوش اور خالصتاً جسمانی محبت کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ وہ اس کے طرز معاشرت سے زیادہ نزدیک ہے۔ 'مصری کی ڈلی' کی بیگو اس قدر کم عمر اور سادہ لوح ہے کہ حقیر سی چیزوں —— سرخ رنگ کے کپڑے کے ٹکڑے، مصری کی ڈلی اور سیپ کے بٹن وغیرہ کو حرز جاں بنائے رہتی ہے۔ یہی الھڑ دوشیزہ 'موسم کی شرارت' میں بھی موجود ہے۔ 'لالٹین' کی کشمیری دوشیزہ بھی بیگو ہی کی طرح دنیا داری سے دور ہے۔ 'بائی بائی' میں یہی معصوم لڑکی پھاتو ایک شہری نوجوان کو چاہنے لگتی ہے لیکن چند ڈوگرہ فوجی اس کی عزت کو پامال کر دیتے ہیں۔ 'ایک خط' کی کشمیری دوشیزہ وزیر اپنا جسمانی تقدس کھو چکی ہے، لیکن روحانی طور پر وہ ابھی بھی پاکیزہ ہے۔ چنانچہ جب اسے مخلصانہ محبت نصیب ہوتی ہے تو اس کی ذات کی ایک ارفع شکل رونما ہوتی ہے۔ منٹو کے الفاظ میں وزیر اس غلاظت کا

شکار ہوئی تھی جسے تہذیب و تمدن کا خوشنما نام دیا جاتا ہے۔ 'نامکمل تحریر' میں بیگو کی طرح وزیر کا کردار تیسری دفعہ ابھرتا ہے جو عصمت و نسائیت کا دلکش پیکر ہے۔ 'جاؤ حنیف جاؤ' کا پس منظر بھی کشمیر ہے جہاں ایک ہوس پرست مرد اپنی بیوی کو موت کی وادی میں دھکیلنے کے بعد اس کی معصومیت کو داغ دار کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ لڑکی ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتی ہے۔

منٹو کے افسانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جہاں کردار اور واقعات پس ماندہ طبقات سے اخذ کئے گئے ہیں ویسے بھی طوائفیں، کوچوان، دلال، پہلوان، غنڈے، چاقو باز، شرابی اور گھریلو ملازم جتنی بڑی تعداد میں منٹو کی تخلیقات میں سانس لیتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اتنے کسی دوسرے اردو افسانہ نویس کے یہاں نہیں ملتے۔ یہ صرف اتفاق نہیں ہے کہ ممد بھائی، بجلی پہلوان، منگو کوچوان، دودا پہلوان، خوشیا دلال، تھیلا کنجر، رام لال دلال، رام کھلاون، شیدا پہلوان، اللہ دتا، سہائے، کالو، کیشو لال، مومن، نتھو، بیگو، وزیر، مائی جیواں، مائی جنتے، کشوری، بچنی، قاسم، شاداں، غلام قادر، نکی، غلام محمد، پھگو بھنگی، بھولو اور گاما وغیرہ وہ کردار ہیں جو غیر تعلیم یافتہ، نامہذب، پسماندہ ناپسندیدہ سمجھے جانے والے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن منٹو ان کرداروں کو ہمدردانہ فہم کے ساتھ اپنے قصوں میں لاتے ہیں۔ یہ بھی اپنی اپنی سطح پر زندگی کے تلخ، غلیظ، اور غیر شریفانہ پہلوؤں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور سعادت حسن منٹو ان کے باطن کے ملکوتی جوہر کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ یہی دلال، گھریلو ملازم اور جرائم پیشہ انڈر ورلڈ کے لوگ منٹو کے ہیرو ہیں اور منٹو کے ساتھ ساتھ قاری بھی ان کے لئے ہمدردی اور اُنسیت محسوس کرتا ہے۔

منٹو کی ولادت اور ابتدائی تربیت امرتسر میں ہوئی اور اپنی تخلیقی زندگی کے لحاظ سے زندگی کی بہترین مدت، جو تقریباً دس سال پر مبنی تھی انہوں نے بمبئی میں گزاری۔ بمبئی میں فلم انڈسٹری اور ادبی دنیا، دونوں میں ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور وہاں وہ بطور ایک سرکردہ افسانہ نگار پہچانے جانے لگے تھے۔ بمبئی کے زمانے کی آزادروی، خوشحالی، مے نوشی اور کوچہ گردی کا ماحول، ان کے بہت سے افسانوں کا حصہ ہے؟ ان افسانوں میں بھی منٹو ہمیشہ کی طرح صرف سچ بولتے ہیں اور ان کی کہانیوں میں سچ کا تناسب اکثر صد فی صد کے آس پاس پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً ان کا افسانہ لتیکا رانی، اداکارہ دیویکا رانی کی سوانح حیات نظر آتا ہے۔ اسی طرح 'ممی' کا

کردار چڈہ، اداکار و مغنی شیام کا عکس محسوس ہوتا ہے۔ جو منٹو کا جگری دوست اور ہمراز تھا۔ ’سنتر پنچ‘ کا کردار گیلانی، مغنیہ نور جہاں کے شوہر شوکت رضوی کا ہو بہو چربہ ہے۔ ’میرا نام رادھا ہے‘ کا پلاٹ پارو دیوی کے خاکے میں اس کے اشوک کمار سے اظہار محبت کرنے کے واقعے پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ’ماتمی جلسہ‘ رام کھلاون‘ مجید کا ماضی‘ موذیل‘ سہائے‘ شاردا‘ دس روپے‘ شادی‘ عورت ذات‘ بانجھ‘ بو‘ پریشانی کا سبب‘ مس فریا‘ خورشٹ‘ سو کینڈل پاور کا بلب‘ بابو گوپی ناتھ‘ مس ٹین والا‘ اور ’قبض‘ وغیرہ وہ افسانے ہیں جن کا دارالعمل عروس البلاد بمبئی ہے۔ لتیکا رانی‘ اور ممی کے علاوہ ’میرا نام رادھا ہے‘ جانکی‘ قبض‘ ایکٹرس کی آنکھ‘ ٹوٹو‘ بسم اللہ‘ مس مالا‘ بری لڑکی‘ اور ’ایک بھائی ایک واعظ‘ وغیرہ افسانوں میں فلم انڈسٹری کی داخلی سچائیوں اور انڈسٹری سے وابستہ افراد کے کرداروں کے تاریک پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ منٹو نے اپنے کچھ خاکوں میں بھی اس نگری کے شب و روز کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ منٹو کے ذاتی مراسم بہت سی اداکاراؤں سے تھے۔ لیکن ان سے تعلقات کے دوران منٹو کبھی کسی کرداری لغزش کا شکار نہیں ہوئے اور ان کی ساری محبتیں اور توجہ اپنی سہرے جلووں کی بیاہی بیوی صفیہ کے لیے وقف رہیں۔ وہ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اور اس رشتے کے نباہنے میں دیانت داری کی بنیادی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے اور بمبئی سے لاہور تک ازدواجی رشتے کے تقدس کو برقرار رکھتے رہے۔ ان کا افسانہ ’خورشٹ، منٹو اور صفیہ دونوں کے ازدواجی زندگی کی پاکیزگی کو تسلیم کرنے کے اعتقاد کا عہد نامہ ہے۔

منٹو کے یہاں ذاتی زندگی اور تخلیقی زندگی کے درمیان تضاد بالکل نہیں تھا۔ وہ جیسا دیکھتے اور سمجھتے تھے، اسے مکمل ایمانداری اور بیباکی سے کاغذ پر منتقل کر دیتے تھے۔ ان کی تخلیقی دیانتداری کی انتہا یہ تھی کہ اپنے افسانوں کی ایک بڑی تعداد میں خود اپنا اور اپنی بیوی کا نام بطور کردار شامل کر دیا ہے۔

بابو گوپی ناتھ‘ میرا نام رادھا ہے‘ جانکی‘ ممی‘ ممد بھائی‘ تانگے والے کا بھائی‘ قیمے کے بجائے بوٹیاں‘ بجلی پہلوان‘ آنکھیں‘ جاؤ حنیف جاؤ‘ خود فریب‘ سوراج کے لیے‘ مس ٹین والا‘ نفسیات شناس‘ بد تمیز‘ قبض‘ مصری کی ڈلی‘ بانجھ‘ ٹوٹو‘ بسم اللہ‘ عشقیہ کہانی‘ جان محمد‘ سراج‘ شیرد ایک زاہدہ ایک فاحشہ‘ ساڑھے تین آنے‘ اور سنتر پنچ وغیرہ وہ افسانے ہیں جہاں سعادت حسن منٹو خود بولتے‘ سانس لیتے

اور حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ خود اپنی ذات کو افسانے میں براہ راست شامل کرنا، منٹو کی اپنی ایجاد کردہ حقیقت نگاری کی تکنیک ہے۔ یہی کام کرشن چندر ذرا دامن بچا کر کرتے ہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ منٹو اپنے کرداروں ان کی کہانیوں اور ان کے اندر ہونے والے تغیرات میں مکمل طور پر شامل ہیں۔

(۱۰)

سعادت حسن منٹو، کرشن چندر کی طرح شاعرانہ زبان اور حسن بیان کے لیے پہچانے جانے والے ادیب نہیں ہیں۔ منٹو کی زبان کسی حد تک کھردری، کہیں کہیں پنجابی آمیز اور کبھی کبھی عامیانہ نظر آتی ہے۔ بمبئی، لاہور اور امرتسر کے مقامی لب و لہجے ان کے افسانوں میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں کے اظہار کے ضمن میں منٹو کا رویہ کافی حد تک سفاک اور لہجہ کہیں کہیں تلخ تک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے منٹو جیسے غیر نستعلیق واقعہ نگار سے زبان و بیان کے جمال اور آرائش کی توقع رکھنا غیر مناسب سا محسوس ہوتا ہے۔ تاہم کہیں کہیں منٹو زبان کی جمالیاتی و حسن کارانہ مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اپنی کہانیوں میں نثر کے ایسے خوبصورت ٹکڑے آراستہ کرتے ہیں کہ ان کی نثر، شعر کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے:

> ”جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں چیر کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی ہوتیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھلا پھلا کر چیخ رہے ہوتے۔ یوں کہیے کہ ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے۔ صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دلنواز سرسراہٹ، نالے میں سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے کف آلود پانی کا شور اور برسات کے پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھیں جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتی تھیں جو زندگی کے اس دوزخ میں ہمیں بہشت کو خواب دکھلانے لگتیں۔“
>
> (شغل)

”دور، بہت دور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے جسے ادھر ادھر سے سمیٹا جا رہا ہے۔ ساحل کے سب قمقمے روشن تھے، جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر کپکپاتی موٹی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہروں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہوئی تھی۔“

(بانجھ)

”ایک دھاندلی تھی مگر اس دھاندلی میں ایک آتشی انتشار تھا۔ لوگ شعلوں کی طرح بھڑکتے تھے، بجھتے تھے پھر بھڑکتے تھے۔ چنانچہ اس بھڑکنے اور بجھنے ’بجھنے اور بھڑکنے نے غلام علی کی خوابیدہ اداس اور جمائیوں بھری فضا میں گرم ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ شہزادہ غلام علی نے تقریر ختم کی تو سارا جلیانوالہ باغ تالیوں اور نعروں کا دہکتا ہوا الاؤ بن گیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جب میں اس سے الگ جا کر ملا اور مبارکباد دینے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا تو وہ کانپ رہا تھا۔ یہ گرم کپکپاہٹ اس کے چمکیلے چہرے سے بھی نمایاں تھی۔“

(سوراج کے لیے)

”اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب اپنا تسلط چھوڑ چکی تھیں —— مگر اس طرح، جس طرح کوئی غاصب چھوڑتا ہے —— تاخت وتاراج ملک‘ اس کا ہر خط‘ ہر خال —— ویرانی کی ایک لکیر تھی —— مگر ویرانی کیا تھی؟ کیوں تھی؟ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آبادیاں ہی ویرانیوں کا باعث ہوتی ہیں —— کیا وہ اس قسم کی کوئی آبادی تھی جو شروع ہونے کے بعد کسی حملہ آور کے باعث ادھوری رہ گئی

تھی اور آہستہ آہستہ اس کی دیواریں جو ابھی گز بھر بھی اوپر نہیں اٹھی تھیں، کھنڈر بن گئی تھیں۔" (سراج)

"دور —— بہت دور ایک ٹیلے سے دھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی نیلاہٹ میں گھل مل رہا تھا۔ میرے گرد و پیش پہاڑیوں کی بلندیوں پر بڑھتے ہوئے چیڑوں اور سانولے پتھروں کے چوڑے چکلے سینوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد کرنیں سیاہ اور سنہرے رنگ کے مخلوط سائے بکھیر رہی تھیں۔ کتنا سندر سہانا سماں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو عظیم الشان محبت میں گھرا ہوا پایا۔" (‘موسم کی شرارت’)

☆☆☆

منٹو کا فن بنیادی طور پر مدنی URBAN ہے، لیکن انہوں نے چند افسانوں —— ‘صاحب کرامات’، ‘ٹوبہ ٹیک سنگھ’، ‘کبوتروں والا سائیں’، ‘شاہ دولے کا چوہا’، ‘ہرنام کور’ اور ‘یزید’ وغیرہ میں پنجاب کے گاؤں کی فضا کو ماہرانہ انداز سے اجاگر کیا ہے۔ ‘صاحب کرامات’، ‘حافظ حسن دین’ اور ‘شاہ دولے کا چوہا’ وہ کہانیاں ہیں جن میں پنجاب کے گاؤں میں لوگوں کی بداعتقادی اور نام نہاد مولویوں و عاملوں کی ہوس رانی کو آشکار کیا گیا ہے۔ ‘بابو گوپی ناتھ’ کا غفار سائیں، جس کے قبیل کے بارے میں منٹو لکھتے ہیں کہ "ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو ‘پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔" اس علاقے کی پسماندگی اور بداعتقادی پر ایک نہایت تیکھا طنز ہے۔ طنز کا یہ تیکھاپن اور زبان کی ایسی کاٹ وسیع مشاہدے اور گہرے فنی تعمق کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

منٹو کی کچھ تحریریں ایسی بھی ہیں جن کو عموماً افسانوں کے ذیل میں رکھا جاتا ہے، لیکن جو افسانے کے فنی لوازمات پر پوری نہیں اترتیں۔ ان غیر افسانوی تخلیقات کی فہرست میں ‘شہید ساز’، ‘قدرت کا اصول’، ‘تپش کاشمیری’، ‘موتری’، ‘موم بتی کے آنسو’، ‘شکاری عورتیں’، ‘خوشبودار تیل’، ‘جسم اور روح’، ‘رشوت’ اور ‘جھمکے’ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ‘تپش کاشمیری’، ‘شکاری عورتیں’، ‘سنتر پنچ’ اور ‘قیمے کی بجائے بوٹیاں’ وہ تخلیقات ہیں جو منٹو کے ذاتی تجربات کا من و عن بیان نظر آتی ہیں۔ ‘تپش

کاشمیری، درحقیقت ایک خاکہ ہے۔

منٹو عموماً رومان زدہ اور جمال پرستانہ قسم کے افسانے تحریر نہیں کرتے تھے لیکن ان کے کشمیر کے قیام کے دوران کے تجربات پر مشتمل چند افسانے —— ‘موسم کی شرارت’، ‘بیگو’، ‘شہ نشین پر’ اور ‘میرا اور اس کا انتقام’ وغیرہ ایسے ہیں جہاں ابتدائے نوجوانی میں پیدا ہونے والے لطیف اور نازک جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

منٹو کے چند افسانے —— ‘کالی کلی’، ‘پھندنے’، ‘فرشتہ’، ‘بادہ شمالی’ اور ‘شیر آیا شیر دوڑنا’ ایسے ہیں جن میں اپنے استعمال کردہ عام بیانیہ اسلوب سے انحراف کرکے جدید علامتی انداز میں تجربات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تینوں افسانے چھٹی دہائی کے جدید افسانے کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہانیاں منٹو کی زندگی کے اواخر میں شائع ہوئے مجموعوں —— ‘نمرود کی خدائی’ اور ‘پھندنے’ میں شامل ہیں اور ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو جدید مغربی افسانہ نگاری کے رجحانات سے پوری طرح باخبر تھے اور ادب میں جدید تجربوں کے بھی حق میں تھے۔ بالخصوص ‘پھندنے’ کو کچھ ناقدین نے جدید افسانہ قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ‘پھندنے’ ایک ایسی تحریر ہے جو افسانہ نہیں بن سکی۔

بلاشبہ منٹو بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائیوں کے ایک بڑے افسانے نگار تھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ منٹو کے کمزور اور معمولی افسانو کی فہرست خاصی طویل ہے۔ بلکہ کچھ تحریریں تو ایسی بھی ہیں کہ ان کو افسانوں کے زمرے میں رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ انارکلی’، ‘ڈھارس’، ‘رتی ماشہ تولہ’، ‘ملاقاتی’، ‘انجام بخیر’، ‘قبض’، ‘ایکٹریس کی آنکھ’، ‘وہ خط جو پوسٹ نہ کیے گئے’، ‘سجدہ’، ‘خالد میاں’، ‘بدصورتی’، ‘سودا بیچنے والی’، ‘عشقیہ کہانی’، ‘منظور’، ‘موم بتی کے آنسو’، ‘موتری’، ‘سونے کی انگوٹھی’، ‘تانگے والے کا بھائی’، ‘مسز حمیدہ’، ‘بغیر اجازت’، ‘پسینہ’، ‘گھوگھا’، ‘خط اور اس کا جواب’، ‘چودھویں کا چاند’، ‘برقعے’، ‘حجامت’، وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ تاہم پریم چند کے بعد کے اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں۔

☆☆☆

افسانے

بابو گوپی ناتھ

مجموعہ: چغد   اشاعت: ۱۹۴۸   معیار: ۵ ستارے

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ ”منٹو صاحب! بابو گوپی ناتھ سے ملئے۔“

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے— ”بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا——— ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب؟ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے، کیوں بابو گوپی ناتھ، ہے نا اینٹی کی پینٹی پو؟“

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی، دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو، ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ ”آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔“

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا۔ ”نمبرون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب، یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔“

بابو گوپی ناتھ، نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا، چونک کر کہا۔ ”ہاں ہاں، ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔“ پھر سینڈو سے پوچھا۔ ”کیوں سینڈو، کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں؟“

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے، اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔“

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتا لکھا دیا جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں، تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا۔ ”آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر جس آدمی کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں، کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور اسکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو.........“

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا۔ ”یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہوگئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لئے، مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی، میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت کرتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر

روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر رہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہی کشمیر کی کتوبری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الہڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ...... دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اور سینڈو سے کہا۔ "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا۔ "جناب یہ ہے ٹین پٹوٹی، فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ...... آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا۔ "بکواس نہ کر!" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا۔ "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ اور باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا۔ "بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا ...... بابو گوپی ناتھ، لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا۔ ”او گوڈ —— او میرے رب العالمین —— وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا —— جاؤ بھئی غلام علی دو بوتلیں جانی واکر اسٹل گوئنگ اسٹرانگ کی لے آؤ۔“

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کر دی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی بار میں ختم کر کے وہ چلّایا۔ ”دھڑن تختہ منٹو صاحب، وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں ”انقلاب، زندہ باد“ لکھتی چلی گئی ہے —— جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔“

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے، مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو، اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا، جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا۔ ”بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“

وہ چونک پڑا۔ ”جی میں —— میں —— کچھ نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ ”ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں —— اور ہمیں کیا سوچ ہو گی!“

سینڈو نے کہا۔ ”بڑے خانہ خراب ہیں یہ، منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں —— لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹلی نہ رہ چکی ہو۔“

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔ ”اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔“

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے

گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی، کون نٹنی تھی، کون کس کی نوچی تھی، نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی نہیں پیا، بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی، اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا۔ کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: ''منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ ''بڑا نیک خیال ہے۔''

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ ''منٹو صاحب! ہے بھی بڑی نیک لوگ ـــــ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جانِ من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے ـــــ منٹو صاحب موٹر کتنے میں آ جائے گی۔''

میں نے کہا ''مجھے معلوم نہیں۔''

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔ ''کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب ـــــ آپ

کو، اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ، زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیے۔" زینت کا چہرہ ردعمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب! آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ——— لیکن آپ مجھے بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا ——— بہت گنہ گار آدمی ہوں ——— وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟"

میں نے کہا "نہیں نہیں ——— بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔ "اور پیجئے منٹو صاحب!" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "منٹو صاحب! اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام کی جیب سے گر پڑے گا یا ———"

بابو گوپی ناتھ نے پوار جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب سے سارے روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر غلام علی کو دے کر کہا۔ "جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا۔ لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے، غلط ثابت

ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے، مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا ——— اس نے مجھ سے کہا۔ ”منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے، میں کہتا ہوں سبحان اللہ ——— وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انہیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفوں کو شناخت کر لیا، جن سے ان کا اُلو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیئے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار، بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”رنڈی کے کوٹھے اور تکیئے آپ کو کیوں پسند ہیں؟“

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکہ دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔“

میں نے ایک اور سوال کیا۔ ”آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے۔ کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں ———“

اس نے جواب دیا۔ ”بالکل نہیں۔ اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ——— منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔“

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں، لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا، لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی، لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب، جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدّت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی، اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے، جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، اس کی بذلہ سنج طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاج کی ایک جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے زینت سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتاً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو

اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں، مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا، وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا، جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گزر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟“

سینڈو نے کہا۔ ”تشریف لے آئیے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ .... کچھ یوں کہیے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا۔ کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا، اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور۔ ”آئیے منٹو صاحب۔“ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ، دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی

سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ’’منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانیؒ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو، جو کچھ وہ کرتی ہیں، سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب! اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جانے والی طوائفیں ایکٹریسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گُر سکھائے، غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہوگی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو، بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو—— منٹو صاحب! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بینک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوگی، سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی—— آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے، سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟‘‘

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا، لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی

کہا۔ ''اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہیور خوبصورتی بھی ہے ——— کیوں زینو جانی ——— پسند ہے تمہیں؟''

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مال دار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی، اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹریس بنانے کے لئے اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلی فون لگوایا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں، لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا۔ ''شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھیے، لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔''

یہ درست تھا۔ الماس، نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے، مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اسے تلاش کیا، لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے

بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے، آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت اچھی عورت ہے لیکن افسوس کہ بے حد شریف ہے ——— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں کیونکہ ان میں سے ایک نے، جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا، زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہار نبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یاسین بیٹھا تھا، نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یاسین مسکرایا۔ "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا۔ "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار!" یاسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یاسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا۔ کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یاسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں، زینت اور یاسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ——— مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے یاسین کی آنکھ لڑ گئی۔ چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یاسین اس کی موٹر میں صبح

شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب! یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی، میاں! اگر تم نے اس کرستان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کار کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب! بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــــ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔"

یاسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے، روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو گئے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی۔ چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ، واپس نہیں آئے گا، اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ سوسوا سو روپے روز کے ہو جاتے، جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

اس نے بڑے الھڑپن سے کہا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، مان لیتی ہوں۔"

جی چاہا کہ بہت دیر پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو، ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے، مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلی فون سے، حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی، اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کے دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

تقریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا۔ ’’سینڈو!‘‘

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ’’دھڑن تختہ۔‘‘

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا۔ ’’آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو‘‘، لیکن سینڈو نے کہا۔ ’’ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے، مجھے آپ سے کچھ پرائیوٹ باتیں کرنی ہیں۔‘‘

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا۔ دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا ’’واپس لے چلو‘‘

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا۔ ’’منٹو صاحب! زینو کی شادی ہونے والی ہے۔‘‘

میں نے حیرت سے کہا۔ ’’کس سے؟‘‘

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا۔ ’’حیدرآباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں، ان سے زینو کا زیور بن جائے گا ——— کیوں، کیا خیال ہے آپ کا؟‘‘

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حیدرآباد سندھ کا یہ دولت مند زمیندار کون ہے، سینڈو اور سردار کی کوئی جعلسازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق

ہوگئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے۔ جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے مربیّ غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پر زور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکّا کر دیا اور شادی طے ہوگئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دونی ہوگئی۔ مجھ سے اس نے کہا۔ ’’منٹو صاحب، خوبصورت نوجوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش‘‘ کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی ——— بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔‘‘

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔ محمد شفیق طوسی، محمد یاسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا ’’دھڑن تختہ!‘‘

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے سامنے چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیّا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچّوں کے سے انداز میں سے کہا۔ ’’منٹو صاحب! ذرا اندر جایئے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔‘‘

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی ——— دوپٹہ

بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے زینت سے کہا۔ ''یہ کیا مسخرہ پن ہے؟''

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ ''آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!'' اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں ——— زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔''

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا ——— ''خدا تمہیں خوش رکھے!''

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ——— بہت ہی دکھ بھری ملامت — اور چلا گیا۔

☆☆☆

ٹوبہ ٹیک سنگھ

مجموعہ: پھندنے **اشاعت: ۱۹۵۴** **معیار: ۵ ستارے**

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہئے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول۔ بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں، چونکہ قریب قریب تمام ہندو، سکھ جا چکے تھے اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیئے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں، لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ 'زمیندار' پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا۔ ”مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟“ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ ”ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔“

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔ ”سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ——— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔“

دوسرا مسکرایا۔ ”مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ——— ہندوستانی بڑے شیطانی، اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔“

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر، پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے، جس کا نام پاکستان ہے ——— یہ کہاں ہے، اس کا محلِ وقوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں ——— اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے؟ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے!

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا۔ ”میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں ——— میں اس درخت ہی پر رہوں گا۔“

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو، سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان

چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی۔ پاس ریڈیو انجینئر میں، جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ، باغ کی ایک خاص روش پر، سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کردیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کردیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کردی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کردیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہوجائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کے علیحدہ علیحدہ بند کردیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہوکر پاگل ہوگیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوگئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا، مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مِل مِلا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کردیئے ـــــ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل بُرا نہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا ـــــ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کرکے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اُڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنی پڑے گی؟

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہوچکے تھے۔ ہر وقت اس

کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے —————— ''اوپڑی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین۔'' دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ ''اوپڑی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔''

لیکن بعد میں ''آف دی پاکستان گورنمنٹ' کی جگہ'' آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ'' نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے، کیا پتا ہے کہ لاہور، جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کو کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی نہ ہو جائیں گے۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔ مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک

یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے، جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار۔ ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین'' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔''

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔

آ کر وہ اس پر برس پڑا۔ "اوپڑی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی دی فتح ——— جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا، مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔ "یہ تم سے ملنے آیا ہے ——— تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ——— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ——— مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی ——— تمہاری بیٹی روپ کور......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔ "بیٹی روپ کور!"

فضل دین نے رک رک کر کہا۔ "ہاں...... وہ...... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے ——— ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا۔ "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ——— اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ——— بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ——— اور بہن امرت کور سے بھی...... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے ——— دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ——— اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی...... اور...... میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں...... اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا۔ ''کہاں ہے ———— وہیں ہے جہاں تھا۔''

بشن سنگھ نے پھر پوچھا۔ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

''ہندوستان میں ———— نہیں نہیں، پاکستان میں۔'' فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ ''اوپڑی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ!''

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور ادھر سے اُدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو، سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے ———— کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی بک گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ———— پاگل عورتوں کا شوروغوغا الگ تھا۔ اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے، ''پاکستان زندہ باد'' اور ''پاکستان مردہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے —— پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

متعلقہ افسر ہنسا۔ ''پاکستان میں۔''

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے ——— '' اور زور زور سے چلانے لگا۔ ''اوپڑی گڑگڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے ——— اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت وصامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ——— ادھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا!

* * *

نیا قانون

مجموعہ: منٹو کے افسانے   اولین اشاعت: ۱۹۳۷   معیار: ۵ ستارے

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کے دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشن گوئی کی تھی۔ ”دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔“

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا ”۔ ولایت میں اور کہاں؟“

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے پر جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی

اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکّرانہ لہجے میں کہا ——

”یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ——— اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقّے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ ”یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا، جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفّر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کُتّا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ کسی گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدّر رہتی۔ اور وہ شام کو اڈّے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقّے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے، کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

”.........“ یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔

”آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے، رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں..........“

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

”شکل دیکھتے نا تم اس کی.......... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے.......... بالکل مُردہ مُردار، ایک دھپے کی مار، اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے“.......... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا ______

”قسم ہے بھگوان کی، لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے“۔

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں۔ اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے، گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

”سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا.......... کیا ہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو نہیں بدلے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی“۔

کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟“

”یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے“۔

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔

وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کے پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیارے سے کہتا۔ ''چل بیٹا، چل............ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔''

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھا سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔ ''ہت تیری ایسی کی تیسی۔''

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ——— ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرّت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی ——— ''غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل۔ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہو گا''۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ——— سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی ہمیشہ کے لئے بلوں میں غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا

اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ لا ہاتھ ادھر ——— ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔ "تو اب دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اس نے 'روس والے بادشاہ' کو 'انڈیا ایکٹ' یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انہیں 'روس والے بادشاہ' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں 'روس والے بادشاہ' اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے، تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ———

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے، اس لئے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں

کہا۔ ''ٹوڈی بچے!''

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ''ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور ''ٹوڈی بچے'' میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا ————

''نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں۔ اگر............ اگر صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔''

ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔''

''ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔''

''وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔''

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی 'چیز' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ ''نیا قانون ————!'' وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ ''یعنی کوئی نئی چیز!'' اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا، جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی 'نئے قانون' کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی، ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح

سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر، معمولی طور پر مسرور تھی ـــــ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دُھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکّر لگایا مگر اسے ہر چیز پُرانی نظر آئی ـــــ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھیں، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۱۳؍ مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دوکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ـــــ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دُکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں"۔ اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دُکانیں کُھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دوکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ـــــ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا ـــــ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا ——

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی"؟

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔ "ابھی کنواں کُھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو"۔

کچھ بھی ہو، مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لعل کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کی اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ——

"چلو یہ بھی اچھا ہوا —— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ

پتہ چل جائے"۔

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ـــــ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سُست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا، اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اِس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک 'گورا' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے۔ مگر بعد میں اس کو خیال آیا۔ "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکتے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا ــ

''صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟''

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ 'صاحب بہادر' کہتے وقت اس کا اوپر کا موچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس 'گورے' کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب 'گورے' نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا، مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے 'گورے' کو یوں دیکھ رہا تھا، گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے، گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دُھواں نگلتے ہوئے کہا۔ ''جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟''

''وہی ہے۔'' یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

''وہی ہے''۔ اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دوہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہوگیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا، وہی ہے۔ جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں، جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی، اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے، مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہوگیا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے

گورے سے کہا۔ "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔ "ہیرا منڈی"۔

"کرایہ پانچ روپے ہوگا"۔ استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے" کیا تم ——— ؟"

"ہاں، ہاں، پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو ——— یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا، بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پستہ قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ——— اب ہمارا راج ہے بچہ!"

لوگ جمع ہوگئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی

گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ——————

”وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے —————— اب نیا قانون ہے میاں —————— نیا قانون!“

اور بیچارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ 'نیا قانون، نیا قانون' چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

”نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو —————— قانون وہی ہے پرانا!“

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

☆☆☆

خوشیا

مجموعہ: منٹو کے افسانے   اشاعت: ۱۹۴۰   معیار: ۴ ستارے

خوشیا سوچ رہا تھا بنواری سے کالے تمباکو والا پان لے کر وہ اس کی دوکان کے ساتھ اس سنگین چبوترے پر بیٹھا تھا۔ جو دن کے وقت ٹائروں اور موٹروں کے مختلف پرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پُرزے اور ٹائر بیچنے والوں کی یہ دوکان بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لئے خالی ہو جاتا ہے۔

وہ کالے تمباکو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پان کی گاڑھی تمباکو ملی پیک اس کے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر اس کے منہ میں ادھر اُدھر پھسل رہی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیال دانتوں تلے پس کر اس کی پیک میں گھل رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا اور اس واقعہ پر غور کر رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ ابھی ابھی پیش آیا تھا یعنی آدھ گھنٹہ پہلے۔

وہ اس سنگین چبوترے پر حسب معمول بیٹھنے سے پہلے کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا۔ منگلور سے جو نئی چھوکری کانتا آئی تھی۔ اسی گلی کے نکڑ پر رہتی تھی۔ خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے وہاں گیا تھا۔

کانتا کی کھولی کا دروازہ اس نے کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ اس پر خوشیا نے کہا ”میں خوشیا۔“

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ خوشیا اندر داخل ہوا۔ جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ

رہی۔ جب اس نے کانتا کو بالکل ننگا دیکھا۔ بالکل ننگا ہی، سمجھو کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تولئے سے چھپائے ہوئے تھی۔ چھپائے ہوئے بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ چھپانے کی کتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

”کہو خوشیا کیسے آئے؟............ میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔ بیٹھو، بیٹھو......... باہر والے سے اپنے لئے چائے کے لئے تو کہہ آئے ہوتے .... جانتے تو ہو وہ موا راما یہاں سے بھاگ گیا ہے“

خوشیا، جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا بہت گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے؟ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دوچار ہو گئی تھیں، اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا۔ ”جاؤ.......... جاؤ تم نہاؤ۔ پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی“ پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟.......... اندر سے کہہ دیا ہوتا۔ میں پھر آجاتا.......... لیکن جاؤ.......... تم نہالو۔

کانتا مسکرائی۔ ”جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو......“

کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔ اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔

اس کا جسم خوبصورت تھا۔ پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا تھا کہ جسم بیچنے والی عورتیں بھی ایسا سڈول بدن رکھتی ہیں۔ اس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی، پر سب سے زیادہ تعجب اسے اس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس کو لاج تک نہ آئی۔ کیوں؟

اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا۔ ”جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے — آنے دو۔“ کیا ہرج ہے۔

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ وہ اس کا دلاّل تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسی کا تھا...... پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہو جاتی۔ کوئی خاص بات تھی۔ کانتا کے الفاظ

میں خوشیا کوئی اور ہی مطلب کرید رہا تھا۔

یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پرواہ! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانولے سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں، مگر اس کا ایک رواں تک بھی نہ کپکپایا تھا۔ بس سانولے پتھر کی مورتی کے مانند کھڑی رہی جو احساس سے عاری ہو۔

بھئی، ایک مرد اس کے سامنے کھڑا تھا — مرد جس کی نگاہیں کپڑوں میں بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پرماتما جانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور...... اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو کہ ابھی لانڈری سے دُھل کر آئی ہیں...... اس کو تھوڑی سی لاج تو آنی چاہیے تھی۔ ذرا سی سُرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہیے۔ مان لیا کسبی تھی، پر کسبیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں'' — !

دس برس اس کو دلالی کرتے ہو گئے تھے۔ اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرنے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھوکری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے، اس کے لئے 'اچھوت کنیا' کا ریکارڈ '' کاہے کرتا مورکھ پیار، پیار، پیار'' اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجایا کرتی ہے کہ اسے اشوک کمار سے بہت بُری طرح عشق ہے۔ کئی منچلے لونڈے اشوک کمار سے اس کی ملاقات کرانے کا جھانسہ دے کر اپنا الّو سیدھا کر چکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دادر میں جو پنجابن رہتی ہے، صرف اس لئے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اس کے ایک یار نے اس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹرس کی طرح ہیں جس نے '' مراکو عرف خونِ تمنا'' میں کام کیا تھا۔ یہ فلم اس نے کئی بار دیکھا اور جب اس کے یار نے کہا کہ مارلین ڈیٹرچ اس لئے پتلون پہنتی ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں اور ان ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے تو اس نے بھی پتلون پہننا شروع کر دی جو اس کے چوتڑوں میں بہت پھنس کر آتی تھی۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ 'مزگاؤں' والی دکھشنی چھوکری صرف اس لئے کالج کے خوبصورت لونڈوں کو پھانستی ہے کہ

اسے ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی۔ اس لئے کہ بانجھ ہے۔ اور اس کالی مدراسن کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی 'بوٹیاں' پہنے رہتی تھی۔ اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہوگا۔ اور وہ ان دواؤں پر بیکار روپیہ برباد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔

اس کو ان تمام چھوکریوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا جو اس کے حلقے میں شامل تھیں۔ مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا کماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا، اس کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائے گی۔ اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دوچار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر اُدھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔

اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے...... اس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچا تھا۔ جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصوّر میں لاتا تھا، اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا اپمان ہوا ہے۔

ایک دم اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''بھئی یہ اپمان نہیں ہے تو کیا ہے...... یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ — تم خوشیا ہی تو ہو — خوشیا نہ ہوا، سالا وہ بِلّا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے...... اور کیا؟''

اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی ہتک ہوئی ہے۔ وہ مرد تھا اور اس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری، اس کو مرد ہی سمجھیں گی۔ اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدّت سے چلا آ رہا ہے۔ وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لئے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانتا کے پاس اس کا جانا یکسر بزنس سے متعلق تھا۔ اگر خوشیا کانتا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو وہ اندر کیا کر رہی ہوگی۔ تو اس کے تصوّر میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آ سکتی تھیں ——

سر پر پٹی باندھے لیٹ رہی ہوگی۔

پلّے کے بالوں میں سے پسّو نکال رہی ہوگی۔

اس پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اُڑا رہی ہوگی جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے پیشنس کھیلنے میں مشغول ہوگی

بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں۔ گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی، اس لئے اس بات کا خیال ہی نہیں آ سکتا تھا۔ پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا...... یعنی کپڑے پہننے والی کانتا...... مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا، اس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہوگئی...... بالکل ننگی ہی سمجھو۔ کیونکہ ایک چھوٹا سا تولیہ سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے چھلکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پرچ کر کے اس کے سامنے آ گرا ہے ـــــــ نہیں اسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا...... جیسے ـــــــ جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دُور کر دیتا۔ مگر یہاں مصیبت یہ آن پڑی تھیں کہ اس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا۔ "جب تم نے کہا، خوشیا ہے، تو میں نے سوچا۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو" ـــــــ یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی۔

"سالی مسکرا رہی تھی" ـــــــ وہ بار بار بڑبڑاتا۔ جس طرح کانتا ننگی تھی، اسی طرح اس کی مسکراہٹ خوشیا کو ننگی نظر آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ ہی نہیں، اسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا، گویا اس پر رندا پھیرا ہوا ہے۔

اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی۔ "خوشیا بیٹا، جا دوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لا۔" جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے ہوئے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی۔ "اندر آ کے، یہاں میرے پاس رکھ دے۔ میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔" وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بالٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی ننگی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی۔ مگر اس کے دل میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"بھئی میں اس وقت بچہ تھا۔ بالکل بھولا بھالا۔ بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں سے کون پردہ کرتا ہے! مگر اب تو میں پورا مرد ہوں۔ میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے، اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی"

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا؟ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا۔ لیکن چور نگاہوں سے کیا اس نے کانتا کی ان چیزوں کا جائزہ نہیں لیا تھا جو روزانہ استعمال کے باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں۔ اور کیا تعجب کہ مرد ہوتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں، کانتا بالکل مہنگی نہیں۔ اور دسہرے کے روز بینک کا وہ منشی جو دو روپے کی رعایت نہ ملنے پر واپس چلا گیا تھا، بالکل گدھا تھا اور...... ان کے سب کے اوپر، کیا ایک لمحے کے لئے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا نہیں ہو گیا تھا اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی جس سے اس کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں؟...... پھر کیا وجہ تھی کہ منگلور کی اس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف...... صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟

اس نے غصے میں آ کر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی، جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنا دئے۔ پیک تھوک کر وہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اس نے نہا دھو کر نئی دھوتی پہنی۔ جس بلڈنگ میں رہتا تھا اس کی ایک دکان میں سیلون تھا۔ اس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی سے اس نے داڑھی مونڈنے کے لئے حجام سے کہا۔ آج چونکہ دوسری مرتبہ وہ داڑھی منڈوا رہا تھا، اس لئے حجام نے کہا۔ "ارے بھئی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح میں نے ہی تو تمہاری داڑھی مونڈی تھی"۔ اس پر خوشیا نے بڑی متانت سے داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی......"

اچھی طرح کھونٹی نکلوا کر اور چہرے پر پاؤڈر ملوا کر وہ سیلون سے باہر نکلا۔ سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ بمبئی کے مخصوص انداز میں اس نے "چھی چھی" کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور انگلی کے اشارے سے اسے ٹیکسی لانے کے لئے کہا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا

تو ڈرائیور نے مڑ کر اس سے پوچھا "کہاں جانا ہے صاحب؟"

ان چار لفظوں نے اور خاص طور پر "صاحب" نے خوشیا کو بہت مسرور کیا۔ مسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجہ میں جواب دیا۔ "بتائیں گے پہلے تم" اوپیرا ہاؤس کی طرف چلو۔ لیمنگٹن روڈ میں سے ہوتے ہوئے ــــ سمجھے!"

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے کی طرف دبا دیا۔ ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رخ کیا۔ لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ "بائیں طرف موڑ لو"۔

ٹیکسی بائیں ہاتھ مڑ گئی۔ ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدلا تھا کہ خوشیا نے کہا۔ "یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لینا ذرا۔" ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی۔ خوشیا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ یہاں سے اس نے ایک پان لیا اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا، چند باتیں کیں اور اسے اپنے ساتھ ٹیکسی پر بٹھا کر ڈرائیور سے کہا۔ "سیدھے لے چلو"!

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی۔ خوشیا نے جدھر اشارہ کیا، ڈرائیور نے ادھر ہینڈل پھیر دیا۔ مختلف پر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی، جس میں آمد و رفت کم تھی۔ کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چمپی کرا رہے تھے۔ جب ٹیکسی ان چمپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی اور ایک کاٹھ کے بنگلے نما مکان کے پاس پہنچی تو خوشیا نے ڈرائیور کو ٹھہرنے کے لئے کہا۔ "بس اب یہاں رُک جاؤ۔"

ٹیکسی ٹھہر گئی تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ آہستہ سے کہا۔ "جاؤ۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔"

وہ آدمی بیوقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے والے چوبی مکان میں داخل ہو گیا۔

خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک دو کش لے کر باہر سڑک پر پھینک دی۔ وہ بہت مضطرب تھا، اس لئے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی کا انجن بند نہیں ہوا۔ اس کے سینے میں چونکہ پھڑپھڑاہٹ ہو رہی تھی اس

لئے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے تیزی سے کہا۔ ”یوں بیکار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھا لو گے؟

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”سیٹھ، انجن تو بند ہے“۔

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔ اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیئے۔ پھر ایکا ایکی سر پر وہ کشتی نما کالی ٹوپی پہن کر، جو اب تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلایا اور کہا۔ ”دیکھو ابھی ایک چھوکری آئے گی جونہی اندر داخل ہو تم موٹر چلا دینا۔ سمجھے! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ معاملہ ایسا ویسا نہیں“۔

اتنے میں سامنے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے۔ آگے آگے خوشیا کا دوست تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کانتا، جس نے شوخ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔

خوشیا جھٹ سے اس طرف کو سرک گیا جدھر اندھیرا تھا۔ خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ فوراً ہی کانتا کی حیرت بھری آواز سنائی دی جو چیخ سے ملتی جلتی تھی۔ خوشیا تم“۔

”ہاں میں۔ لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں نا؟“ خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی۔ ”دیکھو ڈرائیور۔ جوہو لے چلو“

ڈرائیور نے سلف دبایا۔ انجن پھڑ پھڑانا شروع ہوا۔ وہ بات جو کانتا نے کہی، سنائی نہ دے سکی۔ ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھی اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے بیچ حیرت زدہ چھوڑ کر اس نیم روشن گلی میں غائب ہو گئی۔

اس کے بعد کسی نے خوشیا کو موٹروں کی دکان کے سنگین چبوترے پر نہیں دیکھا۔

☆☆☆

ہتک

مجموعہ: منٹو کے افسانے   اولین اشاعت: ۱۹۴۰   معیار: ۵ ستارے

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ ’سیٹھ‘ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو اُبھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔ اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی، جس کا اڈھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ’بیوڑا‘ کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔

تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے، جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور وہ نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرح چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ اپنے جوڑے میں غالباً لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔ پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا، جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں، اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے

گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا............ "اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟........ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے!۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے .... سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا........ "سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر........ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا، وہ تیری ماں کا یار! اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر۔ اور جب وہ آیا کرے تو اس سے کہا کر........ "تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ نیچے والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا، بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ سمجھی؟۔ بہت نازک وقت آ گیا ہے۔ میری جان .... اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں، تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا، نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر، انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔ "جمنا تو سب کو اپنے سریکھا کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا........ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ........ ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا........ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی........ ارے وہ تو ڈرنے لگا........ سنتی؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا!........ وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو

چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ جائے گا............ بولا...... روشنی کرو روشنی کرو...... .... میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا...... .... بولا لائٹ...... .... لائٹ............"

اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ "بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!" .... اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی............ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا۔ "تجھے شرم نہیں آتی مردوے۔ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی!............ وہ پھر گھبرانے لگا............ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا، کبھی اُجالا، کبھی اُجالا، کبھی اندھیرا............ ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا............ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا............ جمنا، تو بالکل الّھڑ ہے، بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے!"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی............ "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو، اسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو............ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ............ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے............ وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی............ ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں، بہن، ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی، جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اسے یاد تھے، اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں!............ ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں............ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو

کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی، لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات ...... کوئی کومل بول .... اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے............ ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر .... انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے۔ یا ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے...... وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے!............ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں، بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی، کتنا مزہ دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزارے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی!............ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا............ بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے بے شمار گر یاد تھے، اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور

فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ ''سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔'' اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے............ پریم............ کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے، تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے...... یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا، وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی، جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا............ ''سوگندھی............ تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!''

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار سے وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی، تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی! دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے۔ اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا، تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ 'وہ' ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی، جو

سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں!............ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ ''تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟............ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟............ چھی چھی چھی............ دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟............ اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی۔ اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا............ مجھے عورت چاہیے، پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے؟............ مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے جچتا ہوں!. تیرا میرا ناتا ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں............ بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی دلالی کے چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی، تیرا من کچھ اور سوچتا ہے، میرا من کچھ اور .... کیونکر نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری............ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا، تین چار دن کے لئے............ یہ دھندا چھوڑ............ میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا............ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟''

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا............ ''سوگندھی! بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا............ اور پانی کا یہ گھڑا............ دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ............ یہ چیتھڑے............ یہ چندیاں............ اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا کر باہر پھینک ان کو............ اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ....

اور............ اور............''

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی

کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا ”دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے............ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔“ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھی اس نے سوگندھی کو............ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا ”دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا............؟“

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا ”تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟“ اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ ”یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں؟“............ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے............ لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی، مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی............ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی............ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں

نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو، اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑھا رہا تھا، اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ “رام لال؟”

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا، بھنا کر کہنے لگا۔ “تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟”.......

.......پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا۔ “اندر کوئی ہے تو نہیں؟”

جب سوگندھی نے کہا۔ “نہیں”۔ ....تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔

“تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ....بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک چھوکری اُتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ....اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں..........چل چل ایک دم جلدی کر۔”

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ “رام لال، آج میرا جی اچھا نہیں۔”

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔ “تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔”

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ “وہ بات نہیں رام لال۔” ....ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں..........بہت پی گئی۔”

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ “تھوڑی بچی ہو تو لا..........ذرا ہم بھی منہ کا مزہ ٹھیک کر لیں۔”

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ ''بجائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا.......... دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آ۔''

رام لال نے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے.......... تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل.......... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا، کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا۔ لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا، اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ ''بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔'' مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیلی کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی، بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے، پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی.......... سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر۔ کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ ''لیجئے وہ آ گئی......

…………بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے۔" پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سوگندھی، ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ جی نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکاچوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ!" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا…………

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟…………کیا؟"

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ "پسند نہیں کیا تجھے؟…………اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کئے۔"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر…………کہاں تھا وہ سیٹھ…………تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا…………اس کی

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دُم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔ "ارے سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی، بس ایک منٹ کے لئے۔" پر وہ سیٹھ، لعنت ہے اس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑی جو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ

سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑی کے چیتھڑے اڑا دے، کیونکہ ساڑی، ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ۔ اونہہ'' کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا ــــــ میں نے اس موئے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے.......... پر
پر .... یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور.......... یہ بازار.......... اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک .... یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا، پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا۔ اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو۔ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔ کیا یہ درد تھا؟ ایک لمحے کے لئے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔ یہ کیا تھا؟.......... لعنت! یہ وہی ''اونہہ'' تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ ''تجھے پسند نہیں کیا!'' اسے.......... صرف میری شکل ہی پسند

نہیں آئی............نہیں آئی تو کیا ہوا؟........ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی............وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا، کتنی بری صورت تھی اس کی۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ٹھیک ہے، پر سوگندھی............تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔ ”اونہہ“۔ اس اونہہ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔ اونہہ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔ دس روپے اور یہ عورت............خچر کیا بری ہے............“

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر، جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ پیچھے کو مڑ جاتا کہ سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے، ایک بار پھر ہو۔ صرف ایک بار............وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ”اونہہ“ کی آواز آئے اور وہ............سوگندھی............اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور............اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے، اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے............

جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ”تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟“............آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان

آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی، جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ.............. یہ آواز کہاں سے آئی؟ سوگندھی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کسی کو نہ پایا۔ ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اس کا دل اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا۔ بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رک جاتا تھا۔ "رات کٹی گن گن تارے"۔ کہتا کہتا "تارے۔ تارے" کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کتنے سندر ہیں۔" وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دل میں کودا۔ "تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے.............. کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت، جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔ بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی، پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتار، ابٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا، اب اس کے پاس واپس جانے کے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس

کر دیئے تھے۔ ''مجھ میں کیا برائی ہے؟''۔ سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری، ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ کوئی.............. کوئی.............. اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ ''سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بری ہے، جو تجھے برا کہے، وہ آپ برا ہے''.............. نہیں، یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔
''سوگندھی تو بہت اچھی ہے!''

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے؟ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ''ماں'' بن رہا تھا۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شئے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شئے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی، ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی، جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں، اس کی باتیں سمجھتا تھا۔ اور سوگندھی کو ایسا بھی لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟.............. وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے.............. اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے، ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو.............. کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی۔ مگر اسے کچھ نظر نہ آیا.......... اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور.......... اور..........

”نہ آئے.......... بلا سے.......... میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں.......... گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کا دردِ سر ہی تو ہے...... چل سوگندھی گھر چل، ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا.......... فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا.......... سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی..........

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا ہے، اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں.......... اس سیٹھ نے.......... پرماتما کرے.......... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی.......... اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بےچین رہتا.......... کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی ”یہی لینے آیا تھا نا تو؟.......... لے دام دیئے بنا لے جا اسے.......... پر جو کچھ میں ہوں جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے، وہ تو کیا تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا۔“

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اس سیٹھ سے ایک

بار، صرف ایک بار اس کی مڈ بھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں، یہ نہیں، یہ کرے ………… یوں اس سے انتقام لے۔ نہیں یوں نہیں یوں ………… لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ………… بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں بنی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا!۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔ "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔ صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا، جس کی بابت تو آئے دن شکایت کرتی ہے ………… وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟ ………… کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتا تھا۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا، جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔ "میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی۔"

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔ "انتظار؟ ………… تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں؟" سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔ اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں ………… اور …………"

مادھو خوش ہو کر بولا۔ "اور میں آ گیا ………… بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی

ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ، دل کو دل سے راہ ہے...............تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا۔ "چار بجے کے قریب۔"

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔ جیسے تو پھولوں کی ساڑی...............ارے بالکل یہی ساڑی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں...............کیا تھا۔ تیرے ہاتھوں میں!...............ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔ "مادھو، تو چنتا کیوں کرتا ہے؟ لے یہ تھیلی...............ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟"...............

"سوگندھی! تیری جان کی قسم! فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا...............کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے۔...............بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے...............تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے...............ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا، مادھو سے کہنے لگی۔ "مادھو، یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟...............جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے...............بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے...............جان بچی لاکھوں پائے...............بس بس اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے...............مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا...............کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے...............واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔ "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا...............اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو...............زیادہ دینے کی ضرورت نہیں، میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس"! یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے

بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شئے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی۔ "ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی............ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی کی تھی۔ "اس کی............ منشی پالٹی کے اس داروغہ کی............ ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا. .... کہتا تھا۔ ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی............ اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے جھنکار کے اٹھتے ہی کہا۔ "رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔"

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی، جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا پھر ہنسا۔ "ہی ہی ہی............"

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے!۔ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا............ کیوں مادھو؟"

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا، اور ہنسا۔ "ہی ہی ہی............"

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا، جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ

رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ''اونہہ'' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔ ''اچھا کیا؟............ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔''

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا............ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز جو کسی کو پسند آ سکتی ہے؟............ یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟............ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپائے ہوئے تھے اس نے............ ....آج کل زمانہ ہی ایسا ہے۔ جو عیب چھپائے وہی برا۔''

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ ''دیکھ سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے............ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں............''

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا............ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا............ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟''

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ ''میں بتاتی ہوں............ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا............ اور جیسا تجھے معلوم ہے، ڈھائی روپے دلال کے ہوتے ہیں، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا، جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا............ تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے

اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری.......... پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیا ناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "یہ چیتھڑے، یہ چندیاں.......... اُف کتنی بری باس آتی ہے، اُٹھا کر باہر پھینک ان کو.........."

مادھو چلّایا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔ "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے، یہاں؟...... تیری ماں رہتی ہے اس جگہ، جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں.......... کتے کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟.......... بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟.......... میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟.......... چور یا گٹھ کترا؟.......... اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟.......... بلاؤں پولیس کو؟ پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں۔"

مادھو سہم گیا۔ دبے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ "سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"تیری ماں کا سر.......... تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا؟ بھاگ یہاں سے، ورنہ.........."

سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھی چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔ "خبردار.......... پڑے رہنے دے وہیں۔ تو جا، تیرے پہنچتے ہی میں اس کو منی

آرڈر کر دوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا —— اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے...... جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے..........

یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی، اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اسے اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی!

☆☆☆

۱۹۱۹ کی ایک بات

مجموعہ : یزید　　**اشاعت: ۱۹۵۱**　　**معیار: ۴ ستارے**

یہ ۹۱۹۱ء کی بات ہے بھائی جان، جب رولٹ ایکٹ کے خلاف سارے پنجاب میں ایجی ٹیشن ہو رہی تھی۔ میں امرتسر کی بات کر رہا ہوں۔ سر مائیکل او ڈوائر نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گاندھی جی کا داخلہ پنجاب میں بند کر دیا تھا۔ وہ ادھر آ رہے تھے کہ پلول کے مقام پر ان کو روک لیا گیا اور گرفتار کر کے واپس بمبئی بھیج دیا گیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بھائی جان، اگر انگریز یہ غلطی نہ کرتا تو جلیاں والا باغ کا حادثہ ان کی حکمرانی کی سیاہ تاریخ میں ایسے خونیں ورق کا اضافہ کبھی نہ کرتا۔

کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، سب کے دل میں گاندھی جی کی بے حد عزت تھی۔ سب انہیں مہاتما مانتے تھے۔ جب ان کی گرفتاری کی خبر لاہور پہنچی تو سارا کاروبار ایک دم بند ہو گیا۔ لاہور سے امرتسر والوں کو معلوم ہوا، چنانچہ یوں چٹکیوں میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ نو اپریل کی شام کو ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی جلاوطنی کے احکام ڈپٹی کمشنر کو مل گئے تھے۔ وہ ان کی تعمیل کے لئے تیار نہیں تھا، اس لئے کہ اس کے خیال کے مطابق امرتسر میں کسی ہیجان خیز بات کا خطرہ نہیں تھا۔ لوگ پر امن طریقے پر احتجاجی جلسے وغیرہ کرتے تھے، جن سے تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں۔ نو تاریخ کو رام نومی تھی۔ جلوس نکلا مگر مجال ہے جو کسی نے حکام کی مرضی کے خلاف ایک قدم اٹھایا ہو۔ لیکن بھائی جان، سر مائیکل عجب اوندھی کھوپڑی کا انسان تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کی ایک نہ

نی، اس پر بس یہی خوف سوار تھا کہ یہ لیڈر مہاتما گاندھی کے اشارے پر سامراج کا تختہ الٹنے کے در پے ہیں۔ اور جو ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور جو جلسے منعقد ہوتے ہیں، ان کے پسِ پردہ یہی سازش کام کر رہی ہے۔

ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی جلاوطنی کی خبر آناً فاناً شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دل ہر شخص کا مکدّر رہتا تھا۔ ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ کوئی بہت بڑا حادثہ برپا ہونے والا ہے۔ لیکن بھائی جان، جوش بہت زیادہ تھا۔ کاروبار بند تھے۔ شہر قبرستان بنا ہوا تھا۔ پر اس قبرستان کی خاموشی میں بھی ایک شور تھا۔ جب ڈاکٹر کچلو اور ستیہ پال کی گرفتاری کی خبر آئی تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوئے کہ مل کر ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جائیں اور اپنے محبوب لیڈروں کی جلاوطنی کے احکام منسوخ کرانے کی درخواست کریں۔ مگر وہ زمانہ، بھائی جان، درخواستیں سننے کا نہیں تھا۔ سر مائیکل جیسا فرعون حاکمِ اعلیٰ تھا، اس نے درخواست سننا تو کجا لوگوں کے اس اجتماع ہی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

امرتسر ——— وہ امرتسر جو کبھی آزادی کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا، جس کے سینے پر جلیاں والا باغ جیسا قابلِ فخر زخم تھا، آج کس حالت میں ہے؟ .... لیکن چھوڑیئے اس قصے کو۔ دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس مقدس شہر میں جو کچھ آج سے پانچ برس پہلے ہوا اس کے ذمہ دار بھی انگریز ہیں۔ ہو گا بھائی جان، پر سچ پوچھئے تو اس لہو میں جو وہاں بہا ہے، ہمارے اپنے ہی ہاتھ رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیر!

ڈپٹی کمشنر صاحب کا بنگلہ سول لائنز میں تھا۔ ہر بڑا افسر اور ہر بڑا ٹوڈی شہر کے اس الگ تھلگ حصے میں رہتا تھا ——— آپ نے امرتسر دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ شہر اور سول لائنز کو ملانے والا ایک پل ہے جس پر سے گزر کر آدمی ٹھنڈی سڑک پر پہنچتا ہے، جہاں حاکموں نے اپنے لئے یہ ارضی جنت بنائی ہوئی تھی۔

ہجوم جب ہال دروازے کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ پل پر گھوڑ سوار گوروں کا پہرہ ہے۔ ہجوم بالکل نہ رکا اور بڑھتا گیا۔ بھائی جان، میں اس میں شامل تھا۔ جوش کتنا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن سب نہتے تھے۔ کسی کے پاس ایک معمولی چھڑی تک بھی نہیں تھی۔ اصل میں وہ تو صرف اس غرض سے نکلے تھے کہ اجتماعی طور پر اپنی آواز حاکمِ شہر تک پہنچائیں اور اس سے

درخواست کریں کہ ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے۔ .... ہجوم پُل کی طرف بڑھتا رہا۔ لوگ قریب پہنچے تو گوروں نے فائر شروع کر دیئے۔ اس سے بھگدڑ مچ گئی۔ وہ گنتی میں صرف بیس پچیس تھے اور ہجوم سینکڑوں پر مشتمل تھا۔ لیکن بھائی جان، گولی کی دہشت بہت ہوتی ہے۔ ایسی افراتفری پھیلی کہ الاماں۔ کچھ لوگ گولیوں سے گھائل ہوئے اور کچھ بھگدڑ میں زخمی ہو گئے۔

دائیں ہاتھ کی طرف گندا نالا تھا۔ دھکا لگا تو میں اس میں گر پڑا۔ گولیاں چلنی بند ہوئیں تو میں نے اٹھ کر دیکھا کہ ہجوم تتر بتر ہو چکا تھا۔ وہ لوگ جو زخمی ہو گئے تھے، سڑک پر پڑے تھے اور پل پر گورے کھڑے ہنس رہے تھے۔ بھائی جان، مجھے قطعاً یاد نہیں کہ اس وقت میری دماغی حالت کس قسم کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے ہوش و حواس پوری طرح سلامت نہیں تھے۔ گندے نالے میں گرتے وقت تو قطعاً مجھے ہوش نہیں تھا۔ جب باہر نکلا تو جو حادثہ وقوع پذیر ہوا تھا، اس کے خدوخال آہستہ آہستہ دماغ میں ابھرنے شروع ہوئے۔

دُور سے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی، جیسے بہت سے لوگ غصے میں چیخ چلا رہے ہیں۔ میں گندا نالا عبور کر کے ظاہرا پیر کے تکیے سے ہوتا ہوا ہال دروازے کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ تیس چالیس نوجوان جوش میں بھرے پتھر اٹھا اٹھا کر دروازے کے گھڑیال پر مار رہے ہیں۔ اس کا شیشہ ٹوٹ کر سڑک پر گرا تو ایک لڑکے نے باغیوں سے کہا۔ ”چلو — ملکہ کا بُت توڑیں!“

دوسرے نے کہا۔ ”نہیں یار — کوتوالی کو آگ لگائیں!“

تیسرے نے کہا۔ ”اور سارے بینکوں کو بھی!“

چوتھے نے ان کو روکا۔ ”ٹھہرو — اس سے کیا فائدہ ہوگا — چلو پل پر چل کر ان گوروں کو ماریں۔“

میں نے اس کو پہچان لیا۔ یہ تھیلا کنجر تھا.......... نام محمد طفیل تھا، کنجر کے نام سے مشہور تھا، اس لئے کہ ایک طوائف کے بطن سے تھا۔ وہ بڑا آوارہ گرد تھا، چھوٹی عمر ہی میں اس کو جوئے اور شراب نوشی کی لت پڑ گئی تھی۔ اس کی دو بہنیں شمشاد اور الماس اپنے وقت کی حسین ترین طوائفیں تھیں۔ شمشاد کا گلا بہت اچھا تھا، اس کا مجرا سننے کے لئے رئیس بڑی دور دور سے آتے تھے۔

دونوں اپنے بھائی کی کرتوتوں سے بہت نالاں تھیں۔ شہر میں مشہور تھا کہ انہوں نے ایک قسم کا اس کو عاق کر رکھا ہے۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی حیلے سے اپنی ضروریات کے لئے ان سے کچھ نہ کچھ وصول کر ہی لیتا تھا۔ ویسے وہ بہت خوش پوش رہتا تھا۔ اچھا کھاتا تھا۔ اچھا پیتا تھا۔ بڑا نفاست پسند تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی مزاج میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ میراثیوں اور بھانڈوں کے سوقیانہ پن سے بہت دور رہتا تھا۔ لمبا قد، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، مضبوط کسرتی بدن، ناک نقشے کا بھی خاصا تھا۔

پُرجوش لڑکوں نے اس کی بات نہ سنی اور ملکہ کے بُت کے طرف چلنے لگے۔ اس نے پھر ان سے کہا۔ ''میں کہتا ہوں، مت ضائع کرو اپنا جوش۔ ادھر آؤ میرے ساتھ —— چلو ان گوروں کو ماریں جنہوں نے ہمارے بے قصور آدمیوں کی جان لی ہے اور انہیں زخمی بھی کیا ہے ...... خدا کی قسم ہم سب مل کر ان کی گردن مروڑ سکتے ہیں —— چلو!''

کچھ نوجوان ملکہ کے بُت کی طرف روانہ ہو چکے تھے، جو رہ گئے تھے تھیلے کی بات سن کر رک گئے۔ تھیلا جب پُل کی طرف بڑھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ماؤں کے یہ لال بے کار موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ میں فوارے کے پاس دبکا کھڑا تھا۔ وہیں سے میں نے تھیلے کو آواز دی اور کہا۔ ''مت جاؤ یار —— کیوں اپنی اور ان کی جان کے پیچھے پڑے ہو۔''

تھیلے نے میری بات سن کر ایک عجیب سا قہقہہ بلند کیا اور مجھ سے کہا۔ ''تھیلا صرف یہ بتانے چلا ہے کہ وہ گولیوں سے ڈرنے والا نہیں۔'' پھر وہ اپنے پیچھے آتے ہوئے نوجوانوں سے مخاطب ہوا۔ ''اگر تم لوگ ڈرتے ہو تو واپس جا سکتے ہو۔''

ایسے موقعوں پر بڑھے ہوئے قدم اُلٹے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور پھر وہ بھی اس وقت، جب ایک جوشیلا نوجوان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آگے آگے جا رہا ہو۔ تھیلے نے قدم تیز کئے تو اس کے پیچھے بڑھتے ہوئے ساتھیوں کو بھی کرنے پڑے۔

ہال دروازے سے پُل کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے ...... ہو گا کوئی ساٹھ ستر گز کے قریب —— تھیلا سب سے آگے تھا۔ جہاں سے پُل کے دو رویہ متوازی جنگلہ شروع ہوتا ہے وہاں سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر دو گھڑ سوار گورے کھڑے تھے۔ تھیلا نعرے

لگاتا ہوا جب جنگلے کے آغاز کے پاس پہنچا تو ادھر سے فائر ہوا۔ نہ جانے کیوں میں سمجھا کہ وہ گر پڑا ہے —— لیکن دیکھا کہ وہ اسی طرح —— زندہ آگے بڑھ رہا ہے۔ فائر ہوتے ہی اس کے باقی ساتھی بھاگ اٹھے تھے۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا اور چلّایا؟ ”بھاگو نہیں —— چلے آؤ!“

اس کا منہ میری طرف تھا کہ ایک اور فائر ہوا۔ پلٹ کر اس نے گوروں کی طرف دیکھا اور اپنی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا —— اب اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سفید بوسکی کی قمیض پر لال لال دھبے تھے۔ اور وہ تیزی سے آگے بڑھا، جیسے زخمی شیر ...... اتنے میں ایک اور فائر ہوا اور وہ لڑکھڑایا مگر ایک دم قدم مضبوط کر کے وہ گھوڑ سوار گورے پر لپکا اور چشم زدن میں جانے کیا ہوا —— ایک گھوڑے کی پیٹھ خالی تھی۔ گورا زمین پر تھا اور تھیلا اس کے اوپر —— دوسرے گھوڑ سوار نے جو قریب ہی تھا اور زخمی تھیلے کی پھرتی سے پہلے بوکھلا گیا تھا، اپنے بدکتے ہوئے گھوڑے کو روکا اور دھڑا دھڑ فائر شروع کر دیئے اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ میں وہاں فوارے کے پاس بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

بھائی جان! جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں تھا۔ چند جان پہچان کے آدمی مجھے وہاں سے اٹھا لائے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پُل پر سے گولیاں کھا کر ہجوم مشتعل ہو گیا تھا۔ نتیجہ اس اشتعال کا یہ ہوا کہ ملکہ کے بُت کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ٹاؤن ہال اور تین بینکوں کو آگ لگی اور پانچ یا چھ گورے مارے گئے۔ خوب لوٹ مچی۔

لوٹ کھسوٹ کا انگریز افسروں کو اتنا خیال نہیں تھا۔ پانچ یا چھ یوروپین ہلاک ہوئے تھے، اسی کا بدلہ لینے کے لئے چنانچہ، جلیاں والا باغ کا خونیں حادثہ رونما ہوا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے شہر کی باگ ڈور جنرل ڈائر کے سپرد کر دی۔ چنانچہ جنرل صاحب نے بارہ اپریل کو فوجیوں کے ساتھ شہر کے مختلف بازاروں میں مارچ کیا اور درجنوں بے گناہ آدمی گرفتار کیے۔

تیرہ اپریل کو جلیاں والا باغ میں جلسہ ہوا۔ قریب قریب پچیس ہزار کا مجمع تھا۔ شام کے قریب جنرل ڈائر مسلح گورکھوں اور سکھوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور نہتّے آدمیوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔

اس وقت تو کسی کو نقصانِ جان کا ٹھیک اندازہ نہیں ہوا۔ لیکن بعد میں جب تحقیق ہوئی

تو پتہ چلا کہ ایک ہزار ہلاک ہوئے ہیں اور تین ہزار سے زائد لوگ کے قریب زخمی .... لیکن میں تھیلے کی بات کر رہا تھا .... بھائی جان، آنکھوں دیکھی آپ کو بتا چکا ہوں — بے عیب ذات خدا کی ہے۔ مرحوم میں پانچوں عیب شرعی تھے۔ ایک پیشہ ور طوائف کے بطن سے تھا مگر جیالا تھا — میں اب یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس ملعون گورے کی پہلی گولی بھی اسی کے لگی تھی۔ جب اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تھا اور انہیں حوصلہ دلایا تھا تو جوش کی حالت میں اس کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ اس کی چھاتی میں گرم گرم سیسہ اتر چکا ہے وہ تو پہلے فائر کی آواز سنتے ہی گردن گھما کر بھاگتے ہوئے نوجوانوں کو پکارنے لگا تھا .... دوسری گولی اس کی پیٹھ میں لگی، تیسری پھر سینے میں ——— میں نے دیکھا نہیں، پر سنا ہے، جب تھیلے کی لاش گورے سے جدا کی گئی تو اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں اس بری طرح پیوست تھے کہ علیٰحدہ نہیں ہوتے تھے ——— گورا جہنم واصل ہو چکا تھا۔

دوسرے روز جب تھیلے کی لاش کفن دفن کے لئے اس کے گھر والوں کے سپرد کی گئی تو اس کا بدن گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا ——— دوسرے گورے نے تو اپنا پورا پستول اس پر خالی کر دیا تھا .... میرا خیال ہے اس وقت مرحوم کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس شیطان کے بچے نے صرف تھیلے کے مردہ جسم پر چاند ماری کی تھی۔

کہتے ہیں جب تھیلے کی لاش محلے میں پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ اپنی برادری میں وہ اتنا مقبول نہیں تھا، لیکن اس کی قیمہ قیمہ لاش دیکھ کر سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس کی بہنیں شمشاد اور الماس تو بے ہوش ہو گئیں۔ جب تھیلے کا جنازہ اٹھا تو ان دونوں نے ایسے بین کئے کہ سننے والے لہو کے آنسو رونے لگے۔

بھائی جان، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ فرانس کے انقلاب میں پہلی گولی وہاں کی ایک ٹکھیائی کے لگی تھی۔ مرحوم تھیلا یعنی محمد طفیل ایک طوائف کا لڑکا تھا۔ انقلاب کی اس جدوجہد میں اس کے جو پہلی گولی لگی تھی، دسویں تھی یا پچاسویں، اس کے متعلق کسی نے بھی تحقیق نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ سوسائٹی میں اس غریب کا کوئی رتبہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں پنجاب کے اس خونیں غسل میں نہانے والوں کی فہرست میں تھیلے کنجر کا نام و نشان تک بھی نہیں ہوگا .... اور یہ بھی کون جانتا ہے کہ ایسی کوئی فہرست تیار بھی ہوئی تھی!

سخت ہنگامی دن تھے۔ فوجی حکومت کا دور دورہ تھا۔ وہ دیو جسے مارشل لا کہتے ہیں، شہر کے گلی گلی کوچے کوچے میں ڈکارتا پھرتا تھا۔ بہت افراتفری کے عالم میں اس غریب کو جلدی جلدی دفن کیا گیا......... جیسے اس کی موت اس کے سوگوار عزیزوں کا ایک سنگین جرم تھی جس کو وہ مٹا دینا چاہتے تھے۔

"بس بھائی جان، تھیلا مر گیا۔ تھیلا دفنا دیا گیا اور"........... یہ کہہ کر میرا ہم سفر پہلی مرتبہ کچھ کہتے کہتے رکا اور خاموش ہو گیا۔ ٹرین دندناتی ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ پٹریوں کی کھٹا کھٹ نے یہ کہنا شروع کر دیا ——— "تھیلا مر گیا ——— تھیلا دفنا دیا گیا ——— تھیلا مر گیا ——— تھیلا دفنا دیا گیا۔" اس مرنے اور دفنانے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا، جیسے وہ اِدھر مرا اور اُدھر دفنا دیا گیا ——— اور کھٹ کھٹ کے ساتھ ان الفاظ کی ہم آہنگی مجھے کچھ اس قدر جذبات سے عاری لگی کہ مجھے اپنے دماغ سے ان دونوں کو جدا کرنا پڑا۔ چنانچہ میں نے اپنے ہم سفر سے کہا۔ "آپ کچھ اور بھی سنانے والے تھے!"

چونک کر اس نے میری طرف دیکھا۔ "جی ہاں......... اس داستان کا ایک افسوس ناک حصہ باقی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا؟"

اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ تھیلے کی دو بہنیں تھیں۔ شمشاد اور الماس، بہت خوبصورت۔ شمشاد لمبی تھی، پتلے پتلے نقش، غلافی آنکھیں۔ ٹھمری بہت خوب گاتی تھی۔ سنا ہے خاں صاحب فتح علی خان سے تعلیم لیتی رہی تھی۔ دوسری الماس تھی، اس کے گلے میں سُر نہیں تھے، لیکن بتادے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ مجرا کرتی تو ایسا لگتا تھا کہ اس کا انگ انگ بول رہا ہے۔ اس کے ہر بھاؤ میں ایک گھات ہوتی تھی......... آنکھوں میں وہ جادو تھا جو ہر ایک کے سر چڑھ کے بولتا تھا۔"

میرے ہم سفر نے تھیلے کی دونوں بہنوں کی تعریف و توصیف میں کچھ ضرورت سے زیادہ وقت لیا۔ مگر میں نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی اس لمبے چکر سے نکلا اور داستان کے افسوس ناک حصے کی طرف لوٹ آیا ——— "قصہ یہ ہے بھائی جان، کہ ان آفت کی پرکالہ دونوں بہنوں کے حسن و جمال کا ذکر کسی خوشامدی ٹوڈی نے گورے فوجی

افسروں سے کردیا...... بلوے میں ایک میم...... کیا نام تھا اس چڑیل کا...... مس ...... مس شروڈ ماری گئی تھی...... طے ہوا کہ ان کو بلوایا جائے اور...... اور...... جی بھر کے انتقام لیا جائے...... آپ سمجھ گئے نا بھائی جان؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں!''

میرے ہم سفر نے ایک آہ بھری۔ ''ایسے نازک معاملوں میں طوائفیں اور کسبیاں بھی اپنی مائیں بہنیں ہوتی ہیں...... مگر بھائی جان، یہ ملک اپنی عزت و ناموس کو، میرا خیال ہے پہچانتا ہی نہیں..... جب اوپر سے علاقے کے تھانیدار کو آرڈر ملا تو وہ فوراً تیار ہو گیا؛ وہ خود شمشاد اور الماس کے مکان پر گیا اور کہا کہ صاحب لوگوں نے ان دونوں یاد کیا ہے، وہ تمہارا مجرا سننا چاہتے ہیں...... بھائی کی قبر کی مٹی بھی ابھی تک خشک نہیں ہوئی تھیں۔ اللہ کو پیارا ہوئے اس غریب کو صرف دو ہی دن ہوئے تھے کہ یہ بہنوں کو حاضری کا حکم صادر ہوا کہ آؤ ہمارے حضور ناچو...... اذیت کا اس سے بڑھ کر پُر اذیت طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے......؟...... مستبد تمسخر کی ایسی مثال، میرا خیال ہے شاید ہی کوئی اور مل سکے...... حکم دینے والوں کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ طوائف بھی غیرت مند ہوتی ہے؟ ...... ہو سکتی ہے...... کیوں نہیں ہو سکتی؟''

میرے ہم سفر نے اپنے آپ سے سوال کیا لیکن مخاطب وہ مجھ سے ہی تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہو سکتی ہے۔''

''جی ہاں ——— تھیلا آخر ان کا بھائی تھا۔ اس نے کسی قمار خانے کی لڑائی بھڑائی میں اپنی جان نہیں دی تھی۔ وہ شراب پی کر دنگا فساد کرتے ہوئے ہلاک نہیں ہوا تھا..... اس نے وطن کی راہ میں بڑے بہادرانہ طریقے پر شہادت کا جام پیا تھا...... وہ ایک طوائف کے بطن سے تھا، لیکن وہ طوائف ماں بھی تو تھی، اور شمشاد اور الماس اسی ماں کی بیٹیاں تھیں، اور وہ تھیلے کی بہنیں پہلے تھیں ——— طوائفیں بعد میں تھیں۔

——— اور وہ تھیلے کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب اس کا جنازہ اٹھا تھا تو انہوں نے ایسے بین کیے تھے کہ سن کر لوگ لہو رونے لگے تھے......''

میں نے پوچھا۔ ''تو کیا وہ گئیں؟''

میرے ہم سفر نے اس کا جواب تھوڑے وقفے کے بعد افسردگی سے دیا۔ ''جی ہاں......

جی ہاں گئیں .... خوب سج بن کر۔ " ایک دم اس کی افسردگی تیکھا پن اختیار کر گئی۔ " سولہ سنگھار کر کے وہ اپنے بلانے والوں کے پاس گئیں .... کہتے ہیں کہ خوب محفل جمی .... دونوں بہنوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے .... زرق برق پشوازوں میں ملبوس وہ کوہ قاف کی پریاں معلوم ہوتی تھیں .... شراب کے دور چلتے رہے اور وہ ناچتی گاتی رہیں .... اور کہتے ہیں کہ .... رات کے دو بجے ایک بڑے افسر کے اشارے پر محفل برخاست ہوئی ...."

میرا ہم سفر کچھ دیر خاموش رہا، پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جھکتے ہوئے کھڑکی سے باہر پیچھے کی طرف باہر بھاگتے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگا۔

ٹرین کے پہیوں اور پٹریوں کی آہنی گڑگڑاہٹ کی تال پر اس کے آخری دو لفظ ناچنے رہے تھے۔ " برخاست ہوئی —— برخاست ہوئی۔ "

میں نے اپنے دماغ میں انہیں اس کے آخری دو لفظوں کو ٹرین کی آہنی گڑگڑاہٹ سے نوچ کر علیحدہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ " پھر کیا ہوا؟ "

پیچھے بھاگتے ہوئے درختوں اور کھمبوں سے نظریں ہٹا کر اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ " پھر انہوں نے اپنی زرق برق پشوازیں نوچ ڈالیں اور الف ننگی ہو گئیں اور کہنے لگیں .... " لو ہمیں دیکھ لو .... ہم تھیلے کی بہنیں ہیں .... اس شہید کی، جس کے خوبصورت جسم کو تم نے صرف اس لئے اپنی گولیوں سے چھلنی چھلنی کیا تھا کہ اس میں اپنے وطن سے محبت کرنے والی روح تھی .... ہم اسی کی خوبصورت بہنیں ہیں .... آؤ اپنی شہوت کے گرم گرم لوہے سے ہمارا خوشبوؤں میں بسا ہوا جسم داغدار کرو .... مگر ایسا کرنے سے پہلے صرف ہمیں ایک بار اپنے منہ پر تھوک لینے دو .... "

یہ کہہ کر میرا ہم سفر خاموش ہو گیا۔ کچھ اس طرح، کہ اور نہیں بولے گا۔ میں نے فوراً ہی پوچھا۔ " پھر کیا ہوا۔ "

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ " ان کو ..... ان کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ " میں نے کچھ نہ کہا۔ گاڑی آہستہ ہو کر اسٹیشن پر رکی تو اس نے قلی کو بلا کر اپنا اسباب اٹھوایا۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ " آپ نے جو داستان سنائی ہے اس کا انجام مجھے آپ کا خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔ "

ایک دم چونک کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''یہ آپ نے کیسے جانا؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کے لہجے کی مضبوطی میں ایک ناقابلِ بیان کرب تھا۔''

میرے ہم سفر نے اپنے حلق کی تلخی تھوک کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں............ ان حرام............'' وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔ ''انہوں نے اپنے شہید بھائی کے نام پر بٹا لگا دیا۔''

یہ کہہ کر وہ پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

☆☆☆

سوراج کے لئے

مجموعہ: نمرود کی خدائی   **اشاعت:** ۱۹۵۰ء   **معیار:** ۵ ستارے

مجھے سن یاد نہیں رہا، لیکن وہی دن تھے جب امرتسر میں ہر طرف ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے گونجتے تھے۔ ان نعروں میں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک عجیب قسم کا جوش تھا۔ ایک جوانی، ایک عجیب قسم کی جوانی ——— بالکل امرتسر کی گجریوں کی سی، جو سر پر اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے بازاروں کو جیسے کاٹتی ہوئی چلتی ہیں۔ خوب دن تھے۔ فضا میں جو جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کا اداس خوف سمویا رہتا تھا، اس وقت بالکل مفقود تھا۔ اب اس کی جگہ ایک بے خوف تڑپ نے لے لی تھی۔ ایک اندھا دھند جست نے جو اپنی منزل سے ناواقف تھی۔

لوگ نعرے لگاتے تھے، جلوس نکالتے تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں دھڑا دھڑ قید ہو رہے تھے۔ گرفتار ہونا ایک دلچسپ شغل بن گیا تھا۔ صبح قید ہوئے، شام چھوڑ دیئے گئے، مقدمہ چلا ——— چند مہینوں کی قید ہوئی، واپس آئے، ایک نعرہ لگایا، پھر قید ہو گئے۔

زندگی سے بھرپور دن تھے۔ ایک ننھا سا بلبلا پھٹنے پر بھی ایک بہت بڑا بھنور بن جاتا تھا۔ کسی نے چوک میں کھڑے ہو کر تقریر کی اور کہا۔ ''ہڑتال ہونی چاہیئے۔'' چلیئے ہڑتال ہو گئی...... ایک لہر اٹھی کہ ہر شخص کو کھادی پہننی چاہیئے تاکہ لنکا شائر کے سارے کارخانے بند ہو جائیں...... بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ شروع ہو گیا اور ہر چوک میں الاؤ جلنے لگے۔ لوگ جوش میں آ کر کھڑے کھڑے وہیں کپڑے اتارتے اور الاؤ میں پھینکتے جاتے، کوئی عورت اپنے مکان کی شہ نشین سے اپنی ناپسندیدہ ساڑھی اچھالتی تو ہجوم تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ لال کر لیتا۔

مجھے یاد ہے کوتوالی کے سامنے ٹاؤن ہال کے پاس ایک الاؤ جل رہا تھا--- شینخو نے، جو میرا ہم جماعت تھا، جوش میں آ کر اپنا ریشمی کوٹ اتارا اور بدیسی کپڑوں کی چتا میں ڈال دیا۔ تالیوں کا سمندر بہنے لگا۔ کیونکہ شینخو ایک بہت بڑے ٹوڈی بچے کا لڑکا تھا۔ اس غریب کا جوش اور بھی زیادہ بڑھ گیا، اپنی بوسکی کی قمیض اتار وہ بھی شعلوں کی نذر کر دی، لیکن بعد میں خیال آیا کہ اس کے ساتھ سونے کے بٹن تھے۔

میں شینخو کا مذاق نہیں اڑاتا، میرا حال بھی ان دنوں بہت دگرگوں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آ جائیں تو ایک دہشت پسند پارٹی بنائی جائے۔ باپ گورنمنٹ کا پنشن خوار تھا، اس کا مجھے کبھی خیال نہ آیا۔ بس دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی کھد بد رہتی تھی ——— بالکل ویسی ہی جیسی فلاش کھیلنے کے دوران میں رہا کرتی ہے۔

اسکول سے تو مجھے ویسے ہی دلچسپی نہیں تھی، مگر ان دنوں تو خاص طور پر مجھے پڑھائی سے نفرت ہو گئی تھی...... گھر سے کتابیں لے کر نکلتا اور جلیانوالہ باغ چلا جاتا، اسکول کا وقت ختم ہونے تک وہاں کی سرگرمیاں دیکھتا رہتا۔ یا کسی درخت کے سائے تلے بیٹھ کر دور مکانوں کی کھڑکیوں میں عورتوں کو دیکھتا اور سوچتا کہ ضرور ان میں سے کسی کو مجھ سے عشق ہو جائے گا ——— یہ خیال دماغ میں کیوں آتا، اس کے متعلق میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

جلیانوالہ باغ میں خوب رونق تھی۔ چاروں طرف تنبو اور قناتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو خیمہ سب سے بڑا تھا، اس میں ہر دوسرے تیسرے روز ایک ڈکٹیٹر بنا کے بٹھا دیا جاتا تھا، جس کو تمام والنیٹر سلامی دیتے تھے۔ دو تین روز یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روز تک یہ ڈکٹیٹر کھادی پوش عورتوں اور مردوں کی نمسکاریں ایک مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ وصول کرتا۔ شہر کے بنیوں سے لنگر خانے کے لئے آٹا چاول اکٹھا کرتا اور دہی کی لسی پی پی کر، جو خدا معلوم جلیانوالہ باغ میں کیوں اس قدر عام تھی، ایک دن اچانک گرفتار ہو جاتا اور کسی قید خانے میں چلا جاتا۔

میرا ایک پرانا ہم جماعت تھا، شہزادہ غلام علی۔ اس سے میری دوستی کا اندازہ آپ کو ان باتوں سے ہو سکتا ہے کہ ہم اکٹھے دو دفعہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو چکے تھے اور ایک دفعہ ہم دونوں گھر سے بھاگ کر بمبئی گئے تھے۔ خیال تھا کہ روس جائیں گے، مگر پیسے ختم ہونے پر جب فٹ پاتھوں پر سونا پڑا تو گھر خط لکھے، معافیاں مانگیں اور واپس چلے آئے۔

شہزادہ غلام علی خوب صورت جوان تھا۔ لمبا قد، گورا رنگ، جو کشمیریوں کا ہوتا ہے۔ تیکھی ناک، کھلنڈری آنکھیں، چال ڈھال میں ایک خاص شان تھی۔ جس میں پیشہ ور غنڈوں کی کجکلاہی کی ہلکی سی جھلک بھی تھی۔

جب وہ میرے ساتھ پڑھتا تھا تو 'شہزادہ' نہیں تھا ـــــ لیکن جب شہر میں انقلابی سرگرمیوں نے زور پکڑا اور اس نے دس پندرہ جلسوں اور جلوسوں میں حصہ لیا تو نعروں، گیندے کے ہاروں، جوشیلے گیتوں اور لیڈی والنٹیئرز سے آزادانہ گفتگوؤں نے اسے ایک نیم رس انقلابی بنا دیا۔ ایک روز اس نے اپنی پہلی تقریر کی ـــــ دوسرے روز میں نے اخبار دیکھے تو معلوم ہوا کہ غلام علی شہزادہ بن گیا ہے۔

شہزادہ بنتے ہی غلام علی سارے امرتسر میں مشہور ہو گیا۔ چھوٹا شہر ہے، وہاں نیک نام ہوتے یا بد نام ہوتے دیر نہیں لگتی ـــــ یوں تو امرتسری عام آدمیوں کے معاملے میں بہت حرف گیر ہیں، یعنی ہر شخص دوسروں کے عیب ٹٹولنے اور کرداروں میں سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، لیکن سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے معاملے میں امرتسری بہت چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ان کو دراصل ہر وقت ایک تقریر یا تحریک کی

ضرورت رہتی ہے۔ آپ انہیں نیلی پوش بنا دیجئے یا سیاہ پوش، ایک ہی لیڈر چولے بدل بدل کر امرتسر میں کافی دیر زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ تمام بڑے بڑے لیڈر جیلوں میں تھے اور ان کی گدیاں خالی تھیں۔ اس وقت لوگوں کو لیڈروں کی کوئی اتنی زیادہ ضرورت نہ تھی، لیکن وہ تحریک جو کہ شروع ہوئی تھی، اس کو البتہ ایسے آدمیوں کی اشد ضرورت تھی جو ایک دو روز کھادی پہن کر جلیانوالہ باغ کے بڑے تنبو میں بیٹھیں، ایک تقریر کریں اور گرفتار ہو جائیں۔

ان دنوں یوروپ میں نئی نئی ڈکٹیٹر شپ شروع ہوئی تھی ـــــ ہٹلر اور مسولینی کا بہت اشتہار ہو رہا تھا۔ غالباً اسی اثر کے ماتحت کانگریس پارٹی نے ڈکٹیٹر بنانے شروع کر دیے تھے۔ جب شہزادہ غلام علی کی باری آئی تو اس سے پہلے چالیس ڈکٹیٹر گرفتار ہو چکے تھے۔

جونہی مجھے معلوم ہوا کہ اس طرح غلام علی ڈکٹیٹر بن گیا ہے تو میں فوراً جلیانوالہ باغ میں پہنچا ـــــ بڑے خیمے کے باہر والنٹیئروں کا پہرہ تھا۔ مگر غلام علی نے جب مجھے اندر سے

دیکھا تو بلا لیا۔ زمین پر ایک گدیلا تھا، جس پر کھادی کی چاندنی بچھی تھی۔ اس پر گاؤ تکیوں کا سہارا لئے شہزادہ غلام علی چند کھادی پوش بنیوں سے گفتگو کر رہا تھا، جو غالباً ترکاریوں کے متعلق تھی۔ چند منٹوں ہی میں اس نے یہ بات چیت ختم کی اور چند رضا کاروں کو احکام دے کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کی یہ غیر معمولی سنجیدگی دیکھ کر میرے گدگدی سی ہو رہی تھی۔ جب رضا کار چلے گئے تو میں ہنس پڑا۔ ”سنا بے شہزادے!“

میں دیر تک اس سے مذاق کرتا رہا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ غلام علی میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی تبدیلی جس سے وہ باخبر ہے۔ چنانچہ اس نے کئی بار مجھ سے یہی کہا۔ ”نہیں سعادت، مذاق نہ اڑاؤ۔ میں جانتا ہوں میرا سر چھوٹا اور یہ عزّت جو مجھے ملی ہے بڑی ہے۔ لیکن میں یہ کھلی ٹوپی ہی پہنے رہنا چاہتا ہوں۔“

کچھ دیر کے بعد اس نے مجھے دہی کی لسّی کا ایک بہت بڑا گلاس پلایا۔ اور میں اس سے یہ وعدہ کر کے چلا گیا کہ شام کو اس کی تقریر سننے ضرور آؤں گا۔

شام کو جلیانوالہ باغ کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں چونکہ جلدی آیا تھا، اس لئے مجھے پلیٹ فارم کے پاس ہی جگہ مل گئی ---- غلام علی تالیوں کے شور کے ساتھ نمودار ہوا ——— سفید بے داغ کھادی کے کپڑے پہنے وہ خوبصورت اور پرکشش دکھائی دے رہا تھا ——— وہ کجکلاہی کی جھلک جس کا میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں، اس کی اس کشش میں اضافہ کر رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ بولتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار میرے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ اور ایک دو دفعہ تو میرے جسم میں بڑی شدّت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بم کی طرح پھٹ جاؤں۔ اس وقت میں نے شاید یہی خیال کیا تھا کہ یوں پھٹ جانے سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔

خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ بیتے ہوئے احساسات اور واقعات کی نوک پلک جو اس وقت تھی، اب پوری صحت سے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ کہانی لکھتے ہوئے میں جب غلام علی کی تقریر کا تصوّر کرتا ہوں تو مجھے صرف ایک جوانی بولتی دکھائی دیتی ہے، جو سیاست سے بالکل پاک تھی ——— اس میں ایک ایسے نوجوان کی پرخلوص بیباکی تھی جو ایک دم کسی راہ چلتی عورت کو پکڑ لے اور کہے۔ ”دیکھو میں تمہیں چاہتا ہوں۔“ اور دوسرے لمحے

قانون کے پنجے میں گرفتار ہو جائے۔ اس تقریر کے بعد مجھے کئی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے، مگر وہ خام دیوانگی، وہ سر پھری جوانی، وہ الہڑ جذبہ، وہ بے ریش و بروت للکار جو میں نے شہزادہ غلام علی کی آواز میں سنی، اب اس کی ہلکی سی گونج بھی مجھے کبھی سنائی نہیں دیتی۔ اب جو تقریریں سننے میں آتی ہیں وہ ٹھنڈی سنجیدگی، بوڑھی سیاست اور شاعرانہ ہوش مندی میں لپٹی ہوتی ہیں۔

اس وقت دراصل دونوں پارٹیاں خام کار تھیں، حکومت بھی اور رعایا بھی۔ دونوں نتائج سے بے پروا، ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ حکومت قید کی اہمیت سمجھے بغیر لوگوں کو قید کر رہی تھی۔ اور جو قید ہوتے تھے، ان کو بھی قید خانوں میں جانے سے پہلے قید کا مقصد معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ایک دھاندلی تھی۔ مگر اس دھاندلی میں ایک آتشی انتشار تھا ______ لوگ شعلوں کی طرح بھڑکتے تھے، بجھتے تھے، پھر بھڑکتے تھے۔ چنانچہ اس بھڑکنے اور بجھنے، بجھنے اور بھڑکنے نے غلام علی کی خوابیدہ، اداس اور جمائیوں بھری فضا میں گرم ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

شہزادہ غلام علی نے تقریر ختم کی تو سارا جلیاں والہ باغ تالیوں اور نعروں کا دہکتا ہوا الاؤ بن گیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جب میں اس سے الگ جا کر ملا اور مبارک باد دینے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا تو وہ کانپ رہا تھا۔ یہ گرم کپکپاہٹ اس کے چمکیلے چہرے سے بھی نمایاں تھی۔ وہ کسی قدر ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پر جوش جذبات کی دمک کے علاوہ مجھے ایک تھکی ہوئی تلاش نظر آئی ______ وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک دم اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور سامنے چنبیلی کی جھاڑی کی طرف بڑھا۔

وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی، کھادی کی بے داغ ساڑی میں ملبوس۔ دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ شہزادہ غلام علی عشق میں گرفتار ہے۔ وہ اس لڑکی سے جسے میں نے چنبیلی کی جھاڑی کے پاس باادب کھڑی دیکھا تھا، محبت کر رہا تھا.......... یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی، کیونکہ نگار کو بھی اس سے والہانہ لگاؤ تھا۔ نگار، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مسلمان لڑکی تھی، یتیم۔ وہ زنانہ ہسپتال میں نرس تھی اور شاید پہلی مسلمان لڑکی تھی جس نے امرتسر میں بے پردہ ہو کر کانگریس کی تحریک میں حصہ لیا۔

کچھ کھادی کے لباس نے، کچھ کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باعث اور کچھ ہسپتال کی فضا نے نگار کی اسلامی خو کو، اس تیکھی چیز کو جو مسلمان عورت کی فطرت میں نمایاں ہوتی

ہے، تھوڑا سا گھلا دیا تھا، جس سے وہ ذرا ملائم ہوگئی تھی۔

وہ حسین نہیں تھی۔ لیکن اپنی جگہ نسوانیت کا ایک نہایت ہی دیدہ چشم منفرد نمونہ تھی۔ انکسار، تعظیم اور پرستش کا وہ ملا جلا جذبہ، جو آدرش ہندو عورت کا خاصہ ہے، نگار میں اس کی خفیف سی آمیزش نے ایک روح پرور رنگ، پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت تو شاید کبھی میرے ذہن میں نہ آتا، مگر اب یہ لکھتے وقت میں نگار کا تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے نماز اور آرتی کا دلفریب مجموعہ دکھائی دیتی ہے۔

شہزادہ غلام علی کی وہ پرستش کرتی تھی اور وہ بھی اس پر دل و جان سے فدا تھا۔ جب نگار کے بارے میں اس سے گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ کانگریس تحریک کے دوران میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے ملاپ سے وہ ایک دوسرے کے ہوگئے۔

غلام علی کا ارادہ تھا کہ قید ہونے سے پہلے پہلے وہ نگار کو اپنی بیوی بنا لے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا، کیونکہ قید خانے سے واپس آنے پر بھی وہ اس سے شادی کر سکتا تھا۔ ان دنوں کوئی اتنی لمبی قید تو ہوتی نہیں تھی۔ کم سے کم تین مہینے اور زیادہ سے زیادہ ایک برس۔ بعضوں کو تو پندرہ بیس روز کے بعد ہی رہا کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسرے قیدیوں کے لئے جگہ بن جائے۔ بہر حال وہ اس ارادے کو نگار پر بھی ظاہر کر چکا تھا اور وہ بالکل تیار تھی۔ اب صرف دونوں کو باباجی کے پاس جا کر ان کا آشیرواد لینا تھا۔

باباجی، جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے بہت زبردست ہستی تھی۔ شہر سے باہر لکھ پتی صرّاف ہری رام کی شاندار کوٹھی میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ اکثر اپنے آشرم میں رہتے جو انھوں نے پاس کے ایک گاؤں میں بنا رکھا تھا۔ مگر جب کبھی امرتسر آتے تو ہری رام صراف ہی کی کوٹھی میں اترتے۔ اور ان کے آتے ہی یہ کوٹھی باباجی کے شیدائیوں کے لئے مقدس جگہ بن جاتی۔ سارا دن درشن کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دن ڈھلے وہ کوٹھی سے باہر کچھ فاصلے پر آم کے پیڑوں کے جھنڈ میں ایک چوبی تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو عام درشن دیتے، اپنے آشرم کے لئے چندہ اکٹھا کرتے۔ آخر میں بھجن وغیرہ سن کر ہر روز شام کو یہ جلسہ ان کے حکم سے برخاست ہو جاتا۔

باباجی بہت پرہیزگار، خداترس، عالم اور ذہین آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ اور اچھوت سب ان کے گرویدہ تھے اور انھیں اپنا امام مانتے تھے۔

سیاست سے گو باباجی کو بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ پنجاب کی ہر سیاسی تحریک انہی کے اشارے پر شروع ہوئی اور انہی کے اشارے پر ختم ہوئی۔

گورنمنٹ کی نگاہوں میں وہ ایک عقدۂ لاینحل تھے، ایک ایسی سیاسی چیستان جسے سرکارِ عالیہ کے بڑے بڑے مدبر بھی نہ حل کر سکے تھے۔ باباجی کے پتلے پتلے ہونٹوں کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ہزار معنٰی نکالے جاتے تھے، مگر جب وہ خود اس مسکراہٹ کا بالکل ہی نیا مطلب واضح کرتے تو مرعوب عوام اور زیادہ مرعوب ہو جاتے۔

یہ جو امرتسر میں سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی اور لوگ دھڑا دھڑ قید ہو رہے تھے، اس کے عقب میں جیسا کہ ظاہر ہے، باباجی ہی کا اثر کار فرما تھا۔ ہر شام لوگوں کو درشنِ عام دیتے وقت وہ سارے پنجاب کی تحریک آزادی اور گورنمنٹ کی نت نئی سخت گیریوں کے متعلق اپنے پوپلے منہ سے ایک چھوٹا سا معصوم سا جملہ نکال دیا کرتے تھے، جسے فوراً ہی بڑے بڑے لیڈر اپنے گلے میں تعویذ بنا کر ڈال لیتے تھے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت تھی، ان کی آواز میں ایک جادو تھا اور ان کا ٹھنڈا دماغ ______ ان کا وہ مسکراتا ہوا دماغ، جس کو گندی سے گندی گالی اور زہریلی سے زہریلی طنز بھی ایک لحظے کے ہزارویں حصے کے لئے برہم نہیں کر سکتی تھی، حریفوں کے لئے بہت ہی الجھن کا باعث تھا۔

امرتسر میں باباجی کے سینکڑوں جلوس نکل چکے تھے۔ مگر جانے کیا بات ہے کہ میں نے اور تمام لیڈروں کو دیکھا، ایک صرف ان ہی کو دور سے دیکھا نہ نزدیک سے۔ اسی لئے جب غلام علی نے مجھ سے ان کے درشن کرنے اور ان سے شادی کی اجازت لینے کے متعلق بات چیت کی تو میں نے اس سے کہا کہ جب وہ دونوں جائیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے جائیں۔

دوسرے ہی روز غلام علی نے تانگے کا انتظام کیا اور ہم صبح سویرے لالہ ہری رام صراف کی عالیشان کوٹھی میں پہنچ گئے۔

باباجی غسل اور صبح کی دعا سے فارغ ہو کر ایک خوبصورت پنڈتانی سے قومی گیت سن رہے تھے۔ چینی کی بے داغ سفید ٹائلوں والے فرش پر آپ کھجور کے پتوں کی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گاؤ تکیہ ان کے پاس ہی پڑا تھا مگر انھوں نے اس کا سہارا نہیں لیا تھا۔

کمرے میں سوائے ایک چٹائی کے، جس کے اوپر باباجی بیٹھے تھے اور فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سفید ٹائلیں چمک رہی تھیں۔ ان کی چمک نے قومی گیت گانے والی پنڈتانی کے ہلکے سے پیازی چہرے کو اور بھی زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ باباجی گو ستر بہتر برس کے بڈھے تھے مگر ان کا جسم (وہ صرف گیروے رنگ کا چھوٹا سا تہمد باندھے تھے) عمر کی جھرّیوں سے بے نیاز تھا۔ جلد میں ایک عجیب قسم کی ملاحت تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہر روز اشنان سے پہلے روغنِ زیتون اپنے جسم پر ملواتے ہیں۔

شہزادہ غلام علی کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائے۔ مجھے بھی ایک نظر دیکھا اور ہم تینوں کی بندگی کا جواب اسی مسکراہٹ کو ذرا طویل کر کے دیا اور اشارہ کیا کہ ہم بیٹھ جائیں۔

میں اب یہ تصویر اپنے سامنے لاتا ہوں تو شعور کی عینک سے یہ مجھے دلچسپ ہونے کے علاوہ بہت ہی فکر خیز دکھائی دیتی ہے۔ کھجور کی چٹائی پر ایک نیم برہنہ معمر جوگیوں کا آسن لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی بیٹھک سے، اس کے گنجے سر سے، اس کی ادھ کھلی آنکھوں سے، اس کے سانولے ملائم جسم سے، اس کے چہرے کے ہر خط سے ایک پرسکون اطمینان، ایک بے فکر تیقن مترشح تھا۔ کہ جس مقام پر دنیا نے اسے بٹھا دیا ہے، اب بڑے سے بڑا زلزلہ بھی اسے وہاں سے نہیں گرا سکتا۔۔۔۔ اس سے کچھ دور وادیٔ کشمیر کی ایک نوخیز کلی، جھکی ہوئی، کچھ اس بزرگ کی قربت کے احترام سے، کچھ قومی گیت کے اثر سے اور کچھ اپنی شدید جوانی سے، اور جو اس کی کھردری سفید ساڑی سے نکل کر قومی گیت کے علاوہ اپنی جوانی کا گیت بھی گانا چاہتی تھی، جو اس بزرگ کی قربت کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی ایسی تندرست اور جوان ہستی کی بھی تعظیم کرنے کی خواہشمند تھی جو اس کی نرم کلائی پکڑ کر زندگی کے دہکتے ہوئے الاؤ میں کود پڑے۔ اس کے ہلکے پیازی چہرے سے، اس کی بڑی بڑی سیاہ متحرک آنکھوں سے، اس کے کھادی کے کھردرے بلاؤز میں ڈھکے ہوئے متلاطم سینے سے، اس معمر جوگی کے ٹھوس تیقن اور سنگین اطمینان کے تقابل میں ایک خاموش صدا اٹھی کہ آؤ، جس مقام پر میں اس وقت ہوں، وہاں سے کھینچ کر مجھے یا تو نیچے گرا دو یا اس سے بھی اوپر لے جاؤ۔ اس طرف ہٹ کر ہم تین بیٹھے تھے۔ میں، نگار اور شہزادہ غلام علی ——— میں بالکل چغد بنا بیٹھا تھا۔ باباجی کی شخصیت سے بھی متاثر تھا اور اس پنڈتانی کے بے داغ حسن سے بھی۔ فرش کی چمکیلی ٹائلوں نے بھی مجھے مرعوب کیا تھا۔ کبھی سوچتا تھا کہ ایسی ٹائلوں والی ایک

کوٹھی مجھے مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ پھر سوچتا تھا کہ یہ پنڈتانی مجھے اور کچھ نہ کرنے دے، ایک صرف مجھے اپنی آنکھوں کو چوم لینے دے۔ اس کے تصوّر سے بدن میں تھرتھری پیدا ہوتی تو جھٹ اپنی نوکرانی کا خیال آتا، جس سے تازہ تازہ مجھے کچھ وہ ہوا تھا۔ جی میں آتا کہ ان سب کو یہاں چھوڑ کر سیدھا گھر جاؤں ـــــ شاید نظر بچا کر اسے اوپر غسل خانے تک لے جانے میں کامیاب ہوسکوں۔ مگر جب باباجی پر نظر پڑتی اور کانوں میں قومی گیت کے پر جوش الفاظ گونجتے تو ایک دوسری تھرتھری بدن میں پیدا ہوتی اور میں سوچتا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آجائے تو سول لائن میں جا کر انگریزوں کو مارنا شروع کردوں۔

اِس چغد کے پاس نگار اور غلام علی بیٹھے تھے، دو محبت کرنے والے دل، جو تنہا محبت میں دھڑکتے دھڑکتے اب شاید کچھ اکتا گئے تھے اور جلد ہی ایک دوسرے میں محبت کے دوسرے رنگ دیکھنے کے لئے مدغم ہو جانا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ باباجی سے، اپنے مسلمہ سیاسی رہنما سے شادی کی اجازت لینے آئے تھے۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے، ان دونوں کے دماغ میں اس وقت قومی گیت کے بجائے ان کی اپنی زندگی کا حسین ترین مگر ان سنا نغمہ گونج رہا تھا۔

گیت ختم ہوا۔ باباجی نے بڑے مشفقانہ انداز سے پنڈتانی کو ہاتھ کے اشارے سے آشیرواد دیا اور مسکراتے ہوئے نگار اور غلام علی کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے بھی انھوں نے ایک نظر دیکھ لیا۔

غلام علی شاید تعارف کے لئے اپنا اور نگار کا نام بتانے والا تھا مگر باباجی کا حافظہ بلا کا تھا۔ انھوں نے فوراً ہی اپنی میٹھی آواز میں کہا۔ ''شہزادے، ابھی تک تم گرفتار نہیں ہوئے؟''

غلام علی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''جی نہیں۔''

باباجی نے قلمدان سے ایک پنسل نکالی اور اس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگے۔ ''مگر میں تو سمجھتا ہوں تم گرفتار ہو چکے ہو۔''

غلام علی اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ لیکن باباجی نے فوراً ہی پنڈتانی کی طرف دیکھا اور نگار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''نگار نے ہمارے شہزادے کو گرفتار کر لیا ہے۔''

نگار محجوب سی ہو گئی۔ غلام علی کا منہ فرطِ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور پنڈتانی کے پیازی چہرے پر ایک دعائیہ چمک سی آئی۔ اس نے نگار اور غلام علی کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے یہ کہہ

رہی ہو۔‘‘ ’’بہت اچھا ہوا۔‘‘

بابا جی ایک بار پھر پنڈتانی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ’’یہ بچے مجھ سے شادی کی اجازت لینے آئے ہیں ——— تم کب شادی کر رہی ہو کمل؟‘‘

تو اس پنڈتانی کا نام کمل تھا۔ بابا جی کے اچانک سوال سے وہ بوکھلا گئی، اس کا پیازی چہرہ سرخ ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا۔ ’’میں تو آپ کے آشرم میں جا رہی ہوں۔‘‘

ایک ہلکی سی آہ بھی ان الفاظ میں لپٹ کر باہر آئی۔ جسے بابا جی کے ہشیار دماغ نے فوراً نوٹ کیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر جوگیانہ انداز میں مسکرائے اور غلام علی اور نگار سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ’’تو تم دونوں فیصلہ کر چکے ہو؟‘‘

دونوں نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ’’جی ہاں۔‘‘

بابا جی نے اپنی سیاست بھری آنکھوں سے اُن کو دیکھا۔ ’’انسان جب فیصلے کرتا ہے تو کبھی کبھی ان کو تبدیل بھی کر دیتا ہے۔‘‘

پہلی دفعہ بابا جی کی بارعب موجودگی میں غلام علی نے، اس کی الھڑ اور بے باک جوانی نے کہا۔ ’’یہ فیصلہ اگر کسی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو بھی اپنی جگہ پر اٹل رہے گا۔‘‘

بابا جی نے آنکھیں بند کر لیں اور جرح کے انداز میں پوچھا۔ ’’کیوں؟‘‘

حیرت ہے کہ غلام علی بالکل نہ گھبرایا۔ شاید اس دفعہ نگار سے جو اسے پرخلوص محبت تھی، وہ بول اٹھی۔ ’’بابا جی ہم نے ہندوستان کو آزادی دلانے کا جو فیصلہ کیا ہے۔ ممکن ہے، وقت کی مجبوریاں اسے تبدیل کرتی رہیں، مگر جو فیصلہ ہے وہ تو اٹل ہے۔‘‘

بابا جی نے، جیسا کہ میرا اب خیال ہے کہ اس موضوع پر بحث کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ چنانچہ وہ مسکرا دیئے ——— اس مسکراہٹ کا مطلب بھی ان کی تمام مسکراہٹوں کی طرح ہر شخص نے بالکل الگ الگ سمجھا۔ اگر بابا جی سے پوچھا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا مطلب ہم سب سے بالکل مختلف بیان کرتے۔

خیر ——— اس ہزار پہلو مسکراہٹ کو اپنے پتلے ہونٹوں پر ذرا اور پھیلاتے ہوئے بابا جی نے نگار سے کہا۔ ’’نگار تم ہمارے آشرم میں آجاؤ۔ شہزادہ تو تھوڑے ہی

دنوں میں قید ہو جائے گا۔"

نگار نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "جی اچھا۔"

اس کے بعد باباجی نے شادی کا موضوع بدل کر جلیانوالہ باغ کیمپ کی سرگرمیوں کا حال پوچھنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک غلام علی، نگار اور کمل گرفتاریوں، رہائیوں، دودھ، لسی اور ترکاریوں کے متعلق باتیں کرتے رہے اور میں، جو بالکل چغد بنا بیٹھا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ باباجی نے شادی کی اجازت دینے میں کیوں اتنی مین میکھ کی ہے۔ کیا وہ غلام علی اور نگار کی محبت کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں؟ —— کیا انہیں غلام علی کے خلوص پر شبہ ہے؟

نگار کو انھوں نے کیا آشرم میں آنے کی اس لئے دعوت دی کہ وہاں رہ کر وہ اپنے قید ہونے والے شوہر کا غم بھول جائے گی؟ —— لیکن باباجی کے اس سوال پر کہ "کمل تم کب شادی کر رہی ہو۔" کمل نے کیوں کہا تھا کہ میں تو آپ کے آشرم میں جا رہی ہوں؟ —— آشرم میں کیا مرد عورت شادی نہیں کرتے؟ —— میرا ذہن عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ مگر ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ لیڈی والنٹیئرز کیا پانچ سو رضا کاروں کے لئے چپاتیاں وقت پر تیار کر لیتی ہیں؟، چولھے کتنے ہیں؟ اور توے کتنے بڑے ہیں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بہت بڑا چولھا بنا لیا جائے اور اس پر اتنا بڑا توا رکھا جائے کہ چھ عورتیں ایک ہی وقت میں روٹیاں پکا سکیں؟

میں یہ سوچ رہا تھا کہ پنڈتانی کمل کیا آشرم میں جا کر باباجی کو بس قومی گیت اور بھجن ہی سنایا کرے گی؟ میں نے آشرم کے مرد والنٹیئر دیکھے تھے۔ گو وہ سب کے سب وہاں کے قواعد کے مطابق ہر روز اشنان کرتے تھے، صبح اٹھ کر داتن کرتے تھے، باہر کھلی ہوا میں رہتے تھے، بھجن گاتے تھے، مگر ان کے کپڑوں سے پسینے کی بو پھر بھی آتی تھی۔ ان میں سے اکثر کے دانت بدبودار تھے اور وہ جو کھلی فضا میں رہنے سے انسان پر ایک ہشاش بشاش نکھار آتا ہے، ان میں بالکل مفقود تھا۔

جھکے جھکے سے، دبے دبے سے —— زرد چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں، مرعوب جسم —— گائے کے نچڑے ہوئے تھنوں کی طرح بے حس اور بیجان ——

میں ان آشرم والوں کو جلیاں والے باغ میں کئی بار دیکھ چکا تھا —— اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہی مرد، جن سے گھاس کی بو آتی ہے، اس پنڈتانی کو جو دودھ، شہد اور زعفران کی بنی

ہے، اپنی کیچڑ بھری آنکھوں سے گھوریں گے۔ کیا یہی مرد جن کا منہ اس قدر متعفن ہوتا ہے، اس لوبان کی مہک میں لپٹی ہوئی عورت سے گفتگو کریں گے؟ —— لیکن پھر میں نے سوچا کہ نہیں، ہندوستان کی آزادی شاید ان چیزوں سے بالاتر ہے۔

میں اس 'شاید' کو اپنی تمام حب الوطنی اور جذبۂ آزادی کے باوجود نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ مجھے نگار کا خیال آیا جو بالکل میرے قریب بیٹھی تھی اور باباجی کو بتا رہی تھی کہ شلجم بہت دیر میں گلتے ہیں —— کہاں شلجم اور کہاں شادی، جس کے لئے وہ اور غلام علی اجازت لینے آئے تھے۔

میں نگار اور آشرم کے متعلق سوچنے لگا۔ آشرم میں نے دیکھا نہیں تھا۔ مگر مجھے ایسی جگہوں سے جن کو آشرم، ودیالہ، جماعت خانہ، تکیہ یا درس گاہ کہا جائے ہمیشہ سے نفرت ہے، جانے کیوں؟

میں نے کئی اندھ ودیالوں اور اناتھ آشرموں کے لڑکوں اور ان کے منتظموں کو دیکھا ہے، سڑک پر قطار باندھ کر چلتے اور بھیک مانگتے ہوئے۔ میں نے جماعت خانے اور درس گاہیں دیکھی ہیں۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پائجامہ، بچپن ہی میں ماتھے پر محراب۔ جو بڑے ہیں ان کے چہرے پر گھنی داڑھی —— جو نوخیز ہیں ان کے گالوں اور ٹھڈی پر نہایت ہی بدنما موٹے اور مہین بال —— نماز پڑھتے جا رہے ہیں لیکن ہر ایک کے چہرے پر حیوانیت —— مصلّے پر بیٹھی نظر آتی ہے۔

نگار عورت تھی۔ مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی عورت نہیں —— وہ صرف عورت تھی، نہیں عورت کی دعا تھی جو وہ اپنے چاہنے والے کے لئے یا جسے وہ خود چاہتی ہے، صدق دل سے مانگتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ باباجی کے آشرم میں جہاں ہر روز قواعد کے مطابق دعا مانگی جاتی ہے، یہ عورت جو خود ایک دعا ہے کیسے اپنے ہاتھ اٹھا سکے گی؟

میں اب سوچتا ہوں تو باباجی، نگار، غلام علی، وہ خوبصورت پنڈتانی اور امرتسر کی ساری فضا جو تحریک آزادی کے رومان آفریں کیف میں لپٹی ہوئی تھی، ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا خواب جو ایک بار دیکھنے کے بعد جی چاہتا ہے آدمی پھر دیکھے۔

باباجی کا آشرم میں نے اب بھی نہیں دیکھا، مگر جو نفرت مجھے اس سے پہلے تھی اب بھی ہے۔

وہ جگہ جہاں فطرت کے خلاف اصول بنا کر انسانوں کو ایک لکیر پر چلایا جائے، میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آزادی حاصل کرنا بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے حصول کے لئے آدمی مر جائے، میں اس کو سمجھ سکتا ہوں، لیکن اس کے لئے اگر اس غریب کو ترکاری کی طرح ٹھنڈا اور بے ضرر بنا دیا جائے تو یہ میری سمجھ سے بالکل بالاتر ہے۔

جھونپڑوں میں رہنا، تن آسانیوں سے پرہیز کرنا، خدا کی حمد گانا، قومی نعرے مارنا ——— یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر یہ کیا کہ انسان کی اس حس کو جسے طلب حسن کہتے ہیں آہستہ آہستہ مردہ کر دیا جائے۔ وہ انسان کیا، جس میں خوبصورتی اور ہنگاموں کی تڑپ نہ رہے۔ ایسے آشرموں، مدرسوں، ودیالوں اور مولیوں کے کھیت میں کیا فرق ہے؟

دیر تک باباجی، غلام علی اور نگار سے جلیانوالہ باغ کی جملہ سرگرمیوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ آخر میں انھوں نے اس جوڑے کو جو کہ ظاہر ہے کہ اپنے آنے کا مقصد بھول نہیں گیا تھا، کہا کہ وہ دوسرے روز شام کو جلیانوالہ باغ آئیں گے اور ان دونوں کو میاں بیوی بنا دیں گے۔

غلام علی اور نگار بہت خوش ہوئے۔ اس سے بڑھ کر ان کی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی کہ باباجی خود شادی کی رسم ادا کریں گے۔ غلام علی جیسا کہ اس نے مجھے بہت بعد میں بتایا، اس قدر خوش ہوا تھا کہ فوراً ہی اسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ شاید جو کچھ اس نے سنا ہے غلط ہے۔ کیونکہ باباجی کے منحنی ہاتھوں کی خفیف سی جنبش بھی ایک تاریخی حادثہ بن جاتی تھی۔ اتنی بڑی ہستی اور ایک معمولی آدمی کی خاطر جو محض اتفاق سے کانگریس کا ڈکٹیٹر بن گیا ہے، چل کے جلیانوالہ باغ جائے اور اس کی شادی میں دلچسپی لے۔ یہ ہندوستان کے تمام اخباروں کے پہلے صفحے کی جلی سرخی تھی۔

غلام علی کا خیال تھا باباجی نہیں آئیں گے۔ کیونکہ وہ بہت مصروف آدمی ہیں۔ لیکن اس کا خیال، جس کا اظہار دراصل اس نے نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے صرف اس لئے کیا تھا کہ وہ ضرور آئیں، اس کی خواہش کے مطابق غلط ثابت ہوا ——— شام کے چھ بجے جلیانوالہ باغ میں جب رات کی رانی کی جھاڑیاں اپنی خوشبو کے جھونکے

پھیلانے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور متعدد رضاکار دولہا دلہن کے لئے ایک چھوٹا سا تنبو نصب کر کے اسے چنبیلی، گیندے اور گلاب کے پھولوں سے سجا رہے تھے، باباجی اس

قومی گیت گانے والی پنڈتانی، اپنے سیکریٹری اور لالہ ہری رام صراف کے ہمراہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے۔ ان کی آمد کی اطلاع جلیانوالہ باغ میں صرف اسی وقت پہنچی، جب صدر دروازہ پر لالہ ہری رام کی ہری موٹر رکی۔

میں بھی وہیں تھا۔ لیڈی والنٹیئرز ایک دوسرے تنبو میں نگار کو دلہن بنا رہی تھیں۔ غلام علی نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ سارا دن وہ شہر کے کانگریسی بنیوں سے رضاکاروں کے کھانے پینے کی ضروریات کے متعلق گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے چند لمحات کے لئے نگار سے تخلئے میں کچھ بات چیت کی تھی۔ اس کے بعد جیسا کہ میں جانتا ہوں، اس نے اپنے ماتحت افسروں سے صرف اتنا کہا تھا کہ شادی کی رسم ادا ہونے کے ساتھ ہی وہ اور نگار دونوں جھنڈا اونچا کریں گے۔

جب غلام علی کو باباجی کی آمد کی اطلاع پہنچی تو وہ کنوئیں کے پاس کھڑا تھا۔ میں غالباً اس سے یہ کہہ رہا تھا۔ ’’غلام علی تم جانتے ہو یہ کنواں، جب گولی چلی تھی لاشوں سے لبالب بھر گیا تھا ——— آج سب اس کا پانی پیتے ہیں ——— اس باغ کے جتنے پھول ہیں اس کے پانی نے سینچے ہیں۔ مگر لوگ آتے ہیں اور انھیں توڑ کر لے جاتے ہیں ——— پانی کے کسی گھونٹ میں لہو کا نمک نہیں ہوتا۔ پھول کی کسی پتی میں خون کی لالی نہیں ہوتی --- یہ کیا بات ہے؟‘‘

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے یہ کہہ کر اپنے سامنے، اس مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا تھا، جس میں کہا جاتا ہے کہ ایک نوعمر لڑکی بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی اور جنرل ڈائر کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔ اس کے سینے سے نکلے ہوئے خون کی لکیر چونے کی عمر رسیدہ دیوار پر دھندلی ہو رہی تھی۔

اب خون کچھ اس قدر ارزاں ہو گیا تھا کہ اس کے بہنے بہانے کا وہ اثر ہی نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کے چھ سات مہینے بعد جب میں تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا، ہمارا ماسٹر ساری کلاس کو ایک دفعہ اس باغ میں لے گیا تھا۔ اس وقت یہ باغ باغ نہیں تھا۔ اجاڑ، سنسنان اور اونچی نیچی خشک زمین کا ایک ٹکڑا تھا جس میں ہر قدم پر مٹی کے چھوٹے بڑے ڈھیلے ٹھوکریں کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے مٹی کا چھوٹا سا ڈھیلا، جس پر جانے پان کی پیک کے دھبے یا کیا تھا، ہمارے ماسٹر نے اٹھا لیا تھا اور ہم سے کہا تھا۔ ’’دیکھو اس پر ابھی تک ہمارے شہیدوں کا خون لگا ہے۔‘‘

یہ کہانی لکھ رہا ہوں اور حافظے کی تختی پر سینکڑوں چھوٹی چھوٹی باتیں ابھر رہی ہیں۔ مگر مجھے تو غلام علی اور نگار کی شادی کا قصہ بیان کرنا ہے۔

غلام علی کو جب باباجی کی آمد کی خبر ملی تو اس نے دوڑ کر سب والنٹیئر اکٹھے کیے، جنھوں نے فوجی انداز میں ان کو سیلوٹ کیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک وہ اور غلام علی مختلف کیمپوں کا چکر لگاتے رہے۔ اس دوران میں باباجی نے جن کی مزاحیہ حس بہت تیز تھی، لیڈی والنٹیئرز اور دوسرے ورکرز سے گفتگو کرتے وقت کئی فقرے چست کیے۔

ادھر ادھر مکانوں میں جب تمام بتیاں جلنے لگیں اور دھندلا اندھیرا سا جلیاں والہ باغ پر چھا گیا تو رضاکار لڑکیوں نے ایک آواز ہو کر بھجن گانا شروع کیا۔ چند آوازیں سریلی، باقی سب کن سُری تھیں۔ مگر ان کا مجموعی اثر بہت خوش گوار تھا۔ باباجی آنکھیں بند کیے سن رہے تھے۔ تقریباً ایک ہزار آدمی موجود تھے۔ جو چبوترے کے ارد گرد زمین پر بیٹھے تھے۔

بھجن گانے والی لڑکیوں کے علاوہ ہر شخص خاموش تھا۔

بھجن ختم ہونے پر چند لمحات تک ایسی خاموشی طاری رہی جو ایک دم ٹوٹنے کے لئے بے قرار ہو۔ چنانچہ جب باباجی نے آنکھیں کھولیں اور اپنی میٹھی آواز میں کہا۔ ''بچو، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میں یہاں آزادی کے دو دیوانوں کو ایک کرنے آیا ہوں۔'' تو سارا باغ خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔

نگار دلہن بنی چبوترے کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کھادی کی ترنگی ساڑی میں بہت بھلی دکھائی دے رہی تھی۔ باباجی نے اشارے سے اسے بلایا اور غلام علی کے پاس بٹھا دیا۔ اس پر اور خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔

غلام علی کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، جب اس نے نکاح کا کاغذ اپنے دوست سے لے کر باباجی کو دیا تو اس کا ہاتھ لرز گیا۔

چبوترے پر ایک مولوی صاحب بھی موجود تھے۔ انھوں نے قرآن کی وہ آیت پڑھی جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتے ہیں۔ باباجی نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایجاب وقبول ختم ہوا تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں دولھا دلہن کو آشیرواد دی۔ اور جب چھواروں کی بارش شروع ہوئی تو انھوں نے بچوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر دس پندرہ چھوارے اکٹھے کر کے اپنے پاس رکھ لئے۔

نگار کی ایک ہندو سہیلی نے شرمیلی مسکراہٹ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا غلام علی کو دی اور اس سے کچھ کہا۔ غلام علی نے ڈبیا کھولی اور نگار کی سیدھی مانگ میں سیندور بھر دیا۔ جلیانوالہ باغ کی خشک فضا ایک بار پھر تالیوں کی تیز آواز سے گونج اٹھی۔

بابا جی اس شور میں اٹھے ______ ہجوم ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کی رانی اور چنبیلی کی ملی جلی سوندھی خوشبو شام کی ہلکی پھلکی ہوا میں تیر رہی تھی۔ بہت سہانا سماں تھا۔ بابا جی کی آواز آج اور بھی میٹھی تھی ______ غلام علی اور نگار کی شادی پر اپنی دلی مسرّت کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ''یہ دونوں بچے اب زیادہ تندہی اور خلوص سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کریں گے۔ کیونکہ شادی کا صحیح مقصد مرد اور عورت کی پرخلوص دوستی ہے۔ ایک دوسرے کے دوست بن کر غلام علی اور نگار یکجہتی سے سوراج کے لئے کوشش کر سکتے ہیں۔ یوروپ میں ایسی کئی شادیاں ہوتی ہیں جن کا مطلب دوستی اور صرف دوستی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ قابل احترام ہیں جو اپنی زندگی سے شہوت نکال پھینکتے ہیں۔''

بابا جی دیر تک شادی کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ شادی کا صحیح مزہ صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب مرد اور عورت کا تعلق صرف جسمانی نہ ہو۔ عورت اور مرد کا شہوانی رشتہ ان کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں آدمی کھاتے ہیں، اپنے ذائقے کی حس کو خوش کرنے کے لئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنا انسانی فرض ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کھاتے ہیں زندہ رہنے کے لئے۔ اصل میں صرف یہی لوگ ہیں جو خورد و نوش کے صحیح قوانین جانتے ہیں۔ اسی طرح وہ انسان جو صرف اس لئے شادی کرتے ہیں کہ انھیں شادی کے مطہر جذبے کی حقیقت اور اس رشتے کی تقدیس معلوم ہو، حقیقی معنوں میں ازدواجی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں ....

بابا جی نے اپنے اس عقیدے کو کچھ اس وضاحت، کچھ ایسے نرم و نازک خلوص سے بیان کیا کہ سننے والوں کے لئے ایک بالکل نئی دنیا کے دروازے کھل گئے ______ میں خود بہت متاثر ہوا۔ غلام علی جو میرے سامنے بیٹھا تھا، بابا جی کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو جیسے پی رہا تھا ______۔ بابا جی نے جب بولنا بند کیا تو اس نے نگار سے کچھ کہا۔ اس کے بعد اٹھ کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں یہ اعلان کیا ______

'میری اور نگار کی شادی اسی قسم کی آدرش شادی ہوگی۔ جب تک ہندوستان کو سوراج نہیں ملتا میرا اور نگار کا رشتہ بالکل دوستوں جیسا ہوگا ——'

جلیانوالہ باغ کی خشک فضا دیر تک تالیوں کے بے پناہ شور سے گونجتی رہی۔ شہزادہ غلام علی جذباتی ہوگیا۔ اس کے کشمیری چہرے پر سرخیاں دوڑنے لگیں۔ جذبات کی اسی رو میں اس نے نگار کو بلند آواز میں مخاطب کیا —— "نگار! تم ایک غلام بچّے کی ماں بنو--- کیا تمہیں یہ گوارا ہوگا؟"

نگار، جو کچھ شادی ہونے پر اور کچھ باباجی کی تقریر سن کر بوکھلائی ہوئی سی تھی، یہ کڑک سن کر اور بھی بوکھلا گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی۔ "جی؟-- جی نہیں۔"

ہجوم نے پھر تالیاں پیٹیں اور غلام علی اور زیادہ جذباتی ہوگیا۔ نگار کو غلام بچّے کی شرمندگی سے بچا کر وہ اتنا خوش ہوا کہ وہ بہک گیا اور اصل موضوع سے ہٹ کر آزادی حاصل کرنے کی پیچدار گلیوں میں جا نکلا۔ ایک گھنٹے تک وہ جذبات بھری آواز میں بولتا رہا —— اچانک اس کی نظر نگار پر پڑی —— جانے کیا ہوا--- ایک دم اس کی قوت گویائی جواب دے گئی۔ جیسے آدمی شراب کے نشے میں بغیر کسی حساب کے نوٹ نکالتا جائے، اور ایک دم بٹوہ خالی پائے —— اپنی تقریر کا بٹوہ خالی پا کر غلام علی کو کافی الجھن ہوئی —— مگر اس نے فوراً ہی باباجی کی طرف دیکھا اور جھک کر کہا۔ "باباجی --- ہم دونوں کو آپ کا آشیرواد چاہئے کہ جس بات کا ہم نے عہد کیا ہے، اس پر پورے رہیں۔"

دوسرے روز صبح چھ بجے شہزادہ غلام علی کو گرفتار کرلیا گیا، کیونکہ اس تقریر میں، جو اس نے سوراج ملنے تک بچّہ پیدا نہ کرنے کی قسم کھانے کے بعد کی تھی، انگریزوں کا تختہ الٹنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔

گرفتار ہونے کے چند روز بعد غلام علی کو آٹھ مہینے کی قید ہوئی اور وہ ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ وہ امرتسر کا اکتالیسواں ڈکٹیٹر تھا اور شاید چالیس ہزارواں سیاسی قیدی —— کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے، اس تحریک میں قید ہونے والے لوگوں کی تعداد اخباروں نے چالیس ہزار ہی بتائی تھی۔

عام خیال تھا کہ آزادی کی منزل اب صرف دو ہاتھ ہی دور ہے —— لیکن فرنگی

سیاست دانوں نے اس تحریک کا دودھ ابلنے دیا۔ اور جب ہندوستان کے بڑے لیڈروں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو یہ تحریک ٹھنڈی لسی میں تبدیل ہو گئی۔

آزادی کے دیوانے جیلوں سے باہر نکلے تو قید کی صعوبتیں بھولنے اور اپنے بگڑے ہوئے کاروبار سنوارنے میں مشغول ہو گئے۔ شہزادہ غلام علی سات مہینے کے بعد ہی باہر آ گیا تھا۔ گو اس وقت پہلا سا جوش نہیں تھا پھر بھی امرتسر کے اسٹیشن پر لوگوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے اعزاز میں تین چار دعوتیں اور جلسے بھی ہوئے۔ میں ان سب میں شریک تھا۔ مگر یہ محفلیں بالکل پھیکی تھیں۔ لوگوں پر ایک عجیب قسم کی تھکاوٹ طاری تھی، جیسے ایک لمبی دوڑ میں اچانک دوڑنے والوں سے کہہ دیا گیا ہو۔ ''ٹھہرو، یہ دوڑ پھر سے شروع ہو گی''۔ اور اب جیسے یہ دوڑنے والے کچھ دیر ہانپنے کے بعد دوڑ کے مقامِ آغاز کی طرف بڑی بے دلی کے ساتھ واپس آ رہے تھے۔

کئی برس گزر گئے ـــــ یہ بے کیف تھکاوٹ ہندوستان سے دور نہ ہو سکی تھی۔ میری دنیا میں چھوٹے موٹے کئی انقلاب آئے۔ داڑھی مونچھ اگی، کالج میں داخل ہوا۔ ایف اے میں دو بار فیل ہوا ـــــ والد انتقال کر گئے، روزی کی تلاش میں ادھر ادھر پریشان ہوا۔ ایک تھرڈ کلاس اخبار میں مترجم کی حیثیت سے نوکری کی، یہاں سے جی گھبرایا تو ایک بار پھر تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوا اور تین ہی مہینے بعد دق کا مریض ہو کر کشمیر کے دیہاتوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ وہاں سے لوٹ کر بمبئی کا رخ کیا۔ یہاں دو برسوں میں تین ہندو مسلم فساد دیکھے۔ جی گھبرایا تو دلّی چلا گیا۔ وہاں بمبئی کے مقابلے میں ہر چیز سست رفتار دیکھی۔ کہیں حرکت نظر بھی آئی تو اس میں ایک زنانہ پن محسوس ہوا۔ آخر یہی سوچا کہ بمبئی اچھا ہے ـــــ کیا ہوا اگر ساتھ والے ہمسائے کو ہمارا نام تک پوچھنے کی فرصت نہیں۔ جہاں لوگوں کو فرصت ہوتی ہے، وہاں ریاکاریاں اور چالبازیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ دلّی میں دو برس ٹھنڈی زندگی بسر کرنے کے بعد بمبئی چلا آیا۔ سدا متحرک بمبئی!

گھر سے نکلے اب آٹھ برس ہو چلے تھے۔ دوست احباب اور امرتسر کی سڑکیں گلیاں کس حالت میں ہیں، اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ کسی سے خط و کتابت ہی نہیں تھی جو پتہ چلتا ـــــ دراصل مجھے ان آٹھ برسوں میں اپنے مستقبل کی طرف سے کچھ بے پروائی سی ہو گئی تھی ـــــ کون بیتے ہوئے دنوں کے متعلق سوچے۔ جو آٹھ برس پہلے خرچ ہو چکا ہے اس کا اب

حساب کرنے سے فائدہ؟ ——— زندگی کے روپے میں، وہی پائی زیادہ اہم ہے جسے تم آج خرچنا چاہتے ہو یا جس پر کل کسی کی آنکھ ہوگی۔

آج سے چھ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ جب زندگی کے روپے اور چاندنی کے روپے سے، جس پر بادشاہ سلامت کی چھاپ ہوتی ہے پائی خارج نہیں ہوئی تھی۔ میں اتنا زیادہ قلاش نہیں تھا، کیونکہ فورٹ میں اپنے پاؤں کے لئے ایک قیمتی شو خریدنے جا رہا تھا۔

آرمی اینڈ نیوی اسٹور کے اس طرف ہار نبی روڈ پر جوتوں کی ایک دوکان ہے جس کی نمائشی الماریاں مجھے بہت دیر سے اس طرف کھینچ رہی تھیں۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے چنانچہ یہ دوکان ڈھونڈنے میں کافی وقت صرف ہوگیا۔

یوں تو میں اپنے لئے ایک قیمتی شو خریدنے آیا تھا، مگر جیسا کہ میری عادت ہے، دوسری دوکانوں میں سجی ہوئی چیزیں دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ ایک اسٹور میں سگریٹ کیس دیکھے، دوسرے میں پائپ، اسی طرح فٹ پاتھ پر ٹہلتا ٹہلتا جوتوں کی ایک چھوٹی سی دوکان کے پاس آیا اور اس کے اندر چلا گیا کہ چلو یہیں سے خرید لیتے ہیں۔ دوکاندار نے میرا استقبال کیا اور پوچھا۔ ''کیا مانگتا ہے صاحب؟''

میں نے تھوڑی دیر یاد کیا کہ مجھے کیا چاہئے۔ ''ہاں — کریپ سول شو۔''

''ادھر نہیں رکھتا ہم۔''

مون سون قریب تھی۔ میں نے سوچا گم بوٹ ہی خرید لوں۔ ''گم بوٹ نکالو''۔ ''باجو والے کی دکان سے ملیں گا'' ——— ربڑ کی کوئی چیز ہم ادھر نہیں رکھتا۔''

میں نے ایسے ہی پوچھا۔ ''کیوں؟''

''سیٹھ کی مرضی۔''

یہ مختصر مگر جامع جواب سن کر میں دوکان سے باہر نکلنے والا تھا کہ ایک خوش پوش آدمی پر میری نظر پڑی جو باہر فٹ پاتھ پر ایک بچہ گود میں اٹھائے پھل والے سے سنگترہ خرید رہا تھا۔ میں باہر نکلا اور وہ دکان کی طرف مڑا ——— ''ارے ——— غلام علی۔''

''سعادت!'' یہ کہہ کر اس نے بچے سمیت مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ بچے کو یہ حرکت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے رونا شروع کر دیا۔ غلام علی نے اس آدمی کو بلایا جس نے

مجھ سے کہا تھا کہ ربڑ کی کوئی چیز ادھر ہم نہیں رکھتا۔ اور اسے بچہ دے کر کہا۔ ''جاؤ اسے گھر لے جاؤ۔' 'پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کتنی دیر کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملے ہیں۔''

میں نے غلام علی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔۔۔ وہ کجکلاہی، وہ ہلکا سا غنڈہ پن جو اس کی امتیازی شان تھی، اب بالکل مفقود تھا۔ میرے سامنے آتشیں تقریریں کرنے والے کھادی پوش نوجوان کی جگہ ایک گھریلو قسم کا عام انسان کھڑا تھا ـــــــ مجھے وہ اس کی آخری تقریر یاد آئی ۔جب اس نے جلیانوالہ باغ کی خشک فضا کو ان گرم الفاظ سے مرتعش کیا تھا ـــــــ ''نگار ـــــــ تم ایک غلام بچّے کی ماں بنو ـــــــ کیا تمھیں یہ گوارا ہوگا ـــــــ'' فوراً ہی مجھے اس بچّے کا خیال آیا، جو غلام علی کی گود میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ بچّہ کس کا ہے؟'' غلام علی نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔ ''میرا ــ اس سے بڑا ایک اور بھی ہے۔ کہو تم نے کتنے پیدا کیے؟''

ایک لحظے کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے غلام علی کے بجائے کوئی اور ہی بول رہا ہے۔ میرے دماغ میں سینکڑوں خیال اوپر تلے گرتے گئے۔ کیا غلام علی اپنی قسم بالکل بھول چکا ہے۔ کیا اس کی سیاسی زندگی اس سے قطعاً علیحدہ ہو چکی ہے۔ ہندوستان کو آزادی دلانے کا وہ جوش، وہ ولولہ کہاں گیا۔ اس بے ریش و بروت للکار کا کیا ہوا۔ نگار کہاں تھی؟ ـــــــ کیا اس نے دو غلام بچّوں کی ماں بننا گوارا کیا ـــــــ شاید وہ مر چکی ہو۔ ہو سکتا ہے غلام علی نے دوسری شادی کر لی ہو۔

''کیا سوچ رہے ہو ـــــــ کچھ باتیں کرو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہیں۔'' غلام علی نے میرے کاندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

میں شاید خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دم چونکا اور ایک لمبی ''ہاں'' کر کے سوچنے لگا کہ گفتگو کیسے شروع کروں۔ لیکن غلام علی نے میرا انتظار نہ کیا اور بولنا شروع کر دیا۔ ''یہ دوکان میری ہے۔ دو برس سے میں یہاں بمبئی میں ہوں۔ بڑا اچھا کاروبار چل رہا ہے۔ تین چار سو مہینے کے بچ جاتے ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو؟ سنا ہے کہ بہت بڑے افسانہ نویس بن گئے ہو۔ یاد ہے ہم ایک دفعہ یہاں بھاگ کے آئے تھے ـــــــ لیکن یار عجیب بات ہے، اس بمبئی میں اور اس بمبئی میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ چھوٹی تھی اور یہ بڑی ہے۔''

اتنے میں ایک گاہک آیا جسے ٹینس شو چاہیے تھا۔ غلام علی نے اس سے کہا۔ ''ربڑ کا مال ادھر نہیں ملتا۔ بازو کی دکان میں چلے جایئے۔''

گاہک چلا گیا تو میں نے غلام علی سے پوچھا۔ ''ربڑ کا مال تم کیوں نہیں رکھتے۔ میں بھی یہاں کریپ سول شو لینے آیا تھا۔''

یہ سوال میں نے یوں ہی کیا تھا۔ لیکن غلام علی کا چہرہ ایک دم بے رونق ہو گیا۔ دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا۔ ''مجھے پسند نہیں۔''

''کیا پسند نہیں؟''

''یہی ربڑ ـــــــ ربڑ کی بنی ہوئی چیزیں۔'' یہ کہہ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی، جب ناکام رہا تو زور سے خشک سا قہقہہ لگایا۔ ''میں تمھیں بتاؤں گا۔ ہے تو بالکل واہیات ہی چیز لیکن ـــــ لیکن میری زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔''

تفکر کی گہرائی غلام علی کے چہرے پر پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھیں، جن میں ابھی تک کھلنڈراپن موجود تھا، ایک لمحے کے لئے دھندلی ہوئیں، لیکن پھر چمک اٹھیں۔ ''بکواس تھی یار وہ زندگی ------ سچ کہتا ہوں سعادت، میں وہ دن بالکل بھول چکا ہوں جب میرے دماغ پر لیڈری سوار تھی۔ چار پانچ برس سے اب بڑے سکون میں ہوں۔ بیوی ہے، بچے ہیں، اللہ کا بڑا فضل وکرم ہے۔''

اللہ کے فضل وکرم سے متاثر ہو کر غلام علی نے بزنس کا ذکر شروع کر دیا کہ کتنے سرمائے سے اس نے کام شروع کیا تھا۔ ایک برس میں کتنا فائدہ ہوا۔ اب بینک میں اس کا کتنا روپیہ ہے۔ میں نے اسے درمیان میں ٹوکا اور کہا۔ ''لیکن تم نے کسی واہیات چیز کا ذکر کیا تھا۔ جس کا تمھاری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔''

ایک بار پھر غلام علی کا چہرہ بے رونق ہو گیا۔ اس نے ایک لمبی ''ہاں'' کی اور جواب دیا۔ ''گہرا تعلق تھا ـــــ شکر ہے کہ اب نہیں ہے ـــــ لیکن مجھے ساری داستان سنانی پڑے گی۔''

اتنے میں اس کا نوکر آ گیا۔ دوکان اس کے سپرد کر کے وہ مجھے اندر اپنے کمرے میں لے گیا۔ جہاں بیٹھ کر اس نے مجھے اطمینان سے بتایا کہ اسے ربڑ کی چیزوں سے کیوں نفرت پیدا ہوئی۔

‘‘میری سیاسی زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ اس کے متعلق تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میرا کیریکٹر کیسا تھا۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ ہم دونوں قریب قریب ایک جیسے ہی تھے۔ میرا مطلب ہے ہمارے ماں باپ کسی سے فخریہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے لڑکے بے عیب ہیں۔ معلوم نہیں میں تم سے یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ لیکن شاید تم سمجھ گئے ہو کہ میں کوئی مضبوط کیریکٹر کا مالک نہیں تھا۔ مجھے شوق تھا کہ میں کچھ کروں۔ سیاست سے مجھے اسی لئے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جھوٹا نہیں تھا۔ وطن کے لئے میں جان بھی دے دیتا۔ اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں، بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کی سیاست، اس کے لیڈر سب ناپختہ ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں تھا۔ ایک لہر اٹھتی ہے۔ اس میں جوش، زور، شور بھی ہوتا ہے، لیکن فوراً ہی بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میرا خیال ہے، کہ لہر پیدا کی جاتی ہے، خود بخود نہیں اٹھتی ——— لیکن شاید میں تمہیں اچھی طرح سمجھا نہیں سکا۔’’

غلام علی کے خیالات میں بہت الجھاؤ تھا۔ میں نے اسے سگریٹ دیا۔ اسے سلگا کر اس نے زور سے تین کش لئے اور کہا۔ ‘‘تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا ہندوستان کی ہر کوشش جو اس نے آزادی حاصل کرنے کے لئے کی ہے غیر فطری نہیں؟ ——— کوشش نہیں ——— میرا مطلب ہے اس کا انجام کیا ہر بار غیر فطری نہیں ہوتا رہا۔ ہمیں کیوں آزادی نہیں ملتی۔ کیا ہم سب نامرد ہیں؟ نہیں، ہم سب مرد ہیں۔ لیکن ہم ایسے ماحول میں ہیں کہ ہماری قوت کا ہاتھ آزادی تک پہنچنے ہی نہیں پاتا۔’’

میں نے اس سے پوچھا۔ ‘‘تمہارا مطلب ہے آزادی اور ہمارے درمیان کوئی چیز حائل ہے۔’’

غلام علی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ‘‘بالکل ——— لیکن یہ کوئی پکی دیوار نہیں ہے۔ کوئی ٹھوس چٹان نہیں ہے۔ ایک پتلی سی جھلی ہے ——— ہماری اپنی سیاست کی، ہماری مصنوعی زندگی کی، جہاں لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کے علاوہ اپنے آپ سے بھی فریب کرتے ہیں۔’’

اس کے خیالات بدستور الجھے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے وہ اپنے گزشتہ تجربوں کو اپنے دماغ میں تازہ کر رہا تھا۔ سگریٹ بجھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا۔ ‘‘انسان جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنا چاہئے۔ نیک کام کرنے کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ انسان اپنا سر

منڈائے، گیروے کپڑے پہنے یا بدن پر راکھ ملے۔ تم کہو گے یہ اس کی مرضی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں اس کی اس مرضی ہی سے، اس کی اس نرالی چیز ہی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ یہ لوگ اونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے کردار، ان کے خیالات اور عقیدے تو ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے، لیکن ان کے منڈے ہوئے سر، ان کے بدن کی راکھ اور ان کے گیروے کپڑے سادہ لوح انسانوں کے دماغ میں رہ جائیں گے۔"

غلام علی زیادہ جوش میں آگیا ــــــ "دنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی تعلیم تو لوگ بھول چکے ہیں۔ لیکن صلیبیں، دھاگے، داڑھیاں، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں۔ ایک ہزار برس پہلے جو لوگ یہاں بستے تھے۔، ہم ان سے زیادہ تجربہ کار ہیں ــــــ میری سمجھ میں نہیں آتا آج کے مصلح کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ انسان کی شکل مسخ کر رہے ہیں۔ جی میں کئی دفعہ آتا ہے۔ بلند آواز میں چلانا شروع کردوں ـــــ خدا کے لئے انسان کو انسان رہنے دو۔ اس کی صورت کو تم بگاڑ چکے ہو، ٹھیک ہے۔ اب اس کے حال پر رحم کرو ــــ تم اس کو خدا بنانے کی کوشش کرتے ہو، لیکن وہ غریب اپنی انسانیت بھی کھو رہا ہے۔ سعادت، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ میرے دل کی آواز ہے۔ میں نے جو محسوس کیا ہے وہی کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ غلط ہے تو پھر کوئی چیز درست اور صحیح نہیں ہے .... میں نے دو برس، پورے دو برس دماغ کے ساتھ کئی کشتیاں لڑی ہیں۔ میں نے اپنے دل، اپنے ضمیر، اپنے جسم، اپنے روئیں روئیں سے بحث کی ہے۔ مگر اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کو انسان ہی رہنا چاہئے۔ نفس ہزاروں میں ایک دو آدمی ماریں۔ سب نے اپنا نفس مار لیا تو میں پوچھتا ہوں یہ کشتہ کام کس کے آئے گا؟"

یہاں تک کہہ کر اس نے ایک اور سگریٹ لیا اور اسے سلگانے میں ساری تیلی جلا کر گردن کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ "کچھ نہیں سعادت، تم نہیں جانتے ــــــ میں نے کتنی روحانی اور جسمانی تکلیف اٹھائی ہے۔ لیکن فطرت کے خلاف جو بھی قدم اٹھائے گا اسے تکلیف برداشت کرنی ہوگی۔ میں نے اس روز ــــــ تمہیں یاد ہوگا وہ دن ــــــ جب جلیاں والہ باغ میں اس بات کا اعلان کر کے کہ نگار اور میں غلام بچے پیدا نہیں کریں گے، ایک عجیب قسم کی برتی مسرت محسوس کی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ اس اعلان کے بعد میرا

سر اونچا ہو کر آسمان کے ساتھ جا لگا ہے۔ لیکن جیل سے واپس آنے کے بعد مجھے آہستہ آہستہ اس بات کا تکلیف دہ.......... بہت ہی اذیت رساں احساس ہونے لگا کہ میں نے اپنے جسم کا، اپنی روح کا ایک بہت ہی ضروری حصہ مفلوج کر دیا ہے.......... اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کے باغ کا سب سے حسین پھول مسل ڈالا ہے.......... شروع شروع میں اس خیال سے مجھے ایک عجیب قسم کا تسلی بخش فخر محسوس ہوتا رہا کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو دوسروں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن دھیرے دھیرے جب میرے شعور کے مسام کھلنے لگے تو حقیقت اپنی تمام تلخیوں سمیت میرے رگ و ریشے میں رچنے لگی --- جیل سے واپس آنے پر میں نگار سے ملا ———— ہسپتال چھوڑ کر وہ باباجی کے آشرم میں چلی گئی تھی ——— سات مہینے کی قید کے بعد جب میں اس سے ملا تو اس کی بدلی ہوئی رنگت، اس کی تبدیل شدہ جسمانی اور دماغی کیفیت دیکھ کر میں نے خیال کیا شاید میری نظروں نے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن ایک برس برس گزرنے کے بعد ———— ایک برس اس کے ساتھ۔"

غلام علی کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی "ہاں ایک برس اس کے ساتھ رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا غم بھی وہی ہے جو میرا ہے.......... لیکن وہ مجھ پر ظاہر کرنا چاہتی ہے نہ میں اس پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں.......... ہم دونوں اپنے عہد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے --- ایک برس میں سیاسی جوش آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کھادی کے لباس اور ترنگے جھنڈوں میں اب وہ پہلی سی کشش باقی نہ رہی تھی .... 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ اگر کبھی بلند ہوتا بھی تھا تو اس میں وہ شان نظر نہیں آتی تھی.......... جلیانوالہ باغ میں ایک تنبو بھی نہیں تھا .... پرانے کیمپوں کے کھونٹے کہیں کہیں گڑے نظر آتے تھے.......... خون سے سیاست کی حرارت قریب قریب نکل چکی تھی.......... "میں اب زیادہ وقت گھر ہی میں رہتا تھا، اپنی بیوی کے پاس"..........

ایک بار پھر غلام علی کے ہونٹوں پر وہی زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ میں بھی چپ رہا۔ کیونکہ میں اس کے خیالات کا تسلسل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چند لمحات کے بعد اس نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور سگریٹ بجھا کر کہنے لگا۔ "ہم دونوں ایک عجیب قسم کی لعنت میں گرفتار تھے.......... نگار سے مجھے جتنی محبت ہے تم اس سے

واقف ہو…………میں سوچنے لگا …… …… یہ محبت کیا ہے؟ ………… میں اس کو ہاتھ لگاتا ہوں تو کیوں اس کے ردِعمل کو اپنی معراج پر پہنچنے کی اجازت نہیں دیتا ………… میں کیوں ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا………… مجھے نگار کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ ایک روز جب کہ شاید میں بالکل صحیح حالت میں تھا، میرا مطلب ہے جیسا کہ ہر انسان کو ہونا چاہئے، میں نے انھیں چوم لیا …………وہ میرے بازوؤں میں تھی………… یوں کہو کہ ایک کپکپی تھی جو میرے بازوؤں میں تھی…………قریب تھا کہ میری روح اپنے پر پھڑپھڑا کر پھڑپھڑاتی ہوئی اونچے آسمان کی طرف اڑ جائے کہ میں نے………… کہ میں نے اسے پکڑ لیا اور قید کر دیا………… اس کے بعد بہت دیر تک………… کئی دنوں تک اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرے اس فعل سے………… میرے اس بہادرانہ کارنامے سے میری روح کو ایسی لذت ملی ہے جس سے بہت کم انسان آشنا ہیں………… لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ناکام رہا اور اس ناکامی نے، جسے میں ایک بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہتا تھا، خدا کی قسم مجھے دنیا کا سب سے زیادہ دکھی انسان بنا دیا………… لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو انسان حیلے بہانے تلاش کر لیتا ہے۔ میں نے بھی ایک راستہ نکال لیا۔ ہم دونوں سوکھ رہے تھے………… اندر ہی اندر ہماری تمام لطافتوں پر پپڑی جم رہی تھی………… کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے غیر بن رہے تھے………… میں نے سوچا………… بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد ہم اپنے عہد پر قائم رہ کر بھی………… میرا مطلب ہے کہ نگار غلام بچے پیدا نہیں کرے گی۔''

یہ کہہ کر اس کے ہونٹوں پر تیسری بار وہ زخمی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لیکن فوراً ہی ایک بار قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں تکلیف دہ احساس کی چبھن نمایاں تھی۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر وہ کہنے لگا۔ ''ہماری ازدواجی زندگی کا یہ عجیب و غریب دور شروع ہوا………… اندھے کو جیسے ایک آنکھ مل گئی ——— میں ایک دم دیکھنے لگا، لیکن یہ بصارت تھوڑی ہی دیر کے بعد دھندلی ہونے لگی………… پہلے پہل تو یہی خیال تھا'' ——— غلام علی موزوں الفاظ تلاش کرنے لگا۔

''پہلے پہل تو ہم مطمئن تھے۔ میرا مطلب ہے شروع شروع میں ہمیں اس کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم نامطمئن ہو جائیں گے………… یعنی ایک آنکھ تقاضا کرنے لگی کہ دوسری آنکھ بھی ہو………… آغاز میں ہم دونوں نے محسوس کیا تھا جیسے ہم صحت مند ہو رہے ہیں، ہماری

دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹا...... پٹاخے کی سی آواز آئی...... بیلون پھٹ گیا اور بچے کے ہاتھ میں دھاگے کے ساتھ ربڑ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹکتا رہ گیا۔ غلام علی نے دو انگلیوں سے اس ٹکڑے کو چھین کر یوں پھینکا جیسے وہ کوئی نہایت ہی مکروہ چیز تھی۔

☆☆☆

بلاؤز

مجموعہ : منٹو کے افسانے　　اشاعت: ۱۹۴۰　　معیار: ۴ ستارے

کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتٰی کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم چونک پڑتا۔ دُھندلے دُھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں، مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے۔ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی رہتی تھیں۔ ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضاء میں پیدا ہو گیا تھا، جس کے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس تکلیف کی شدّت جب بڑھ جاتی تو اس کے جی میں آتا کہ اپنے آپ کو ایک بڑے سے ہاون میں ڈال دے اور کسی سے کہے۔ ’’مجھے کوٹنا شروع کر دیں۔‘‘

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اس کی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جاتی جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیئے کی لو کی طرح کانپنا شروع کر دیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ شاید سولھواں بھی لگا ہو، اسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا جس کا لڑکپن تیزی سے جوانی کے میدان کی طرف

بھاگ رہا تھا۔ اس دوڑ نے، جس سے مومن بالکل غافل تھا اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کر دی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی، اب موٹی ہو گئی تھی۔ بانہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہہ موٹی ہو گئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں، جگہ اُبھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کر دیا ہے۔ ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا۔ قمیض کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غُسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانہ میں جب کوئی اور موجود نہ ہو، مومن اپنی قمیض کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا۔ ہاتھوں سے مسلتا۔ درد ہوتا، ٹیسیں اٹھتیں، جیسے جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح زور سے ہلایا گیا ہو۔ کانپ کانپ جاتا مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے ایک لیس دار لعاب نکل آتا۔ اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے نہ کر سکتا ہو، اس کے خیال کے مطابق گناہ تھا۔ چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیض کے بٹن بند کر لیتا اور دل میں عہد کرتا کہ آئندہ ایسی فُضول حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے یا تیسرے روز تخلیئے میں وہ پھر اس کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے سب گھر والے خوش تھے۔ بڑا محنتی لڑکا تھا۔ جب ہر کام وقت پر کر دیتا تو کسی کو شکایت کا موقعہ کیسے ملتا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر نوکر ہُوا تھا۔ مگر دوسرے مہینے ہی اس کی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ اس کی یہاں قدر کی جاتی تھی۔ مگر

اب کچھ دنوں سے وہ بے قرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجا بجانے، نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہ کی تھی۔ شکیلہ البتہ مومن سے اِدھر اُدھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ بھی چند بلاؤزوں کے نمونے اُتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اس کی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بے حد شوق تھا۔ شکیلہ اس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی جو زیادہ تر باورچی خانے کا کام کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے، ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور وہ انقلاب جس میں مومن کا دل و دماغ اور جسم گزر رہا تھا، اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس لئے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ اور پھر مومن نوکر تھا......... نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آنکلا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بے حد پُرخطر تھا۔ اس راستے پر اس کے قدم کبھی تیز تیز اُٹھتے تھے، کبھی ہولے ہولے۔ وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہئے۔ انہیں جلدی طے کرنا چاہئے یا کچھ وقت لے کر آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کا سہارا لے کر طے کرنا چاہئے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی

بیٹیاں پھسل رہی تھیں ۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی لئے بے حد مضطرب تھا، اسی اضطراب کے باعث کئی کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اس کے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اسے کوئی اتنا کھینچے اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اس کے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوئی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو...... کیا ہو؟...... بس کچھ ہو۔ میز پر قرینے سے چُنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اُچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اُپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دُہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا چھوٹ نکلے۔ اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور اس میں ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے۔

کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی طرز سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذوں پر بلاؤزوں کے نمونے اُتار رہی تھی۔ جب اِس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان سب میں اچھا تھا، سامنے رکھ کر اپنے لئے اُودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کر دیا۔ اب رضیہ کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو اس کی نشست بڑی پُر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تا کہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اس کی بہت صحیح تھی۔ اس لئے کہ پہلے کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے مگر چیز بالکل فٹ تیار ہوتی تھی۔

شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی ہاتھ بہت گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ایک ننھا گڑھا تھا۔ جب مشین چلاتی تھی تو یہ ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتے تھے۔

شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی دو یا تین اُنگلیاں بڑی صفائی کے ساتھ مشین کی ہتھی گھماتی تھیں۔ کلائی میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا ایک طرف جھک جاتی تھی اور بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لئے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی نیچے پھسل آتی تھی۔ شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک رہتی کہ اسے ہٹانے یا جمانے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔

جب شکیلہ اُودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ماپ کا بلاوز تراشنے لگی تو اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیائش کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے اپنے کئی بلاوز موجود تھے۔ مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی، اس لئے ساری پیائش دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیض اُتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا۔ ''جاؤ مومن دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔''

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں۔ وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا۔ مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رُخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا۔ ''کیسا گز بی بی جی۔''

شکیلہ نے جواب دیا ''کپڑے کا گز.......... ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ یہ لوہے کا ہے۔ ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے کپڑے کا، جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔''

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لے کر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا ''یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا۔'' پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی۔ ''ان لوگوں کی کوئی چیز اپنے پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے.......... ادھر آؤ یہ گز لو اور یہاں سے میرا ماپ لو۔''

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ماپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔

مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

”رضیہ تم گز کو کھینچ کر ماپ کیوں نہیں لیتیں......... پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا۔ تم نے ماپ لیا اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اُوپر کے حصّہ پر اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو اِدھر اُدھر بغلوں میں جُھول پڑ جاتے ہیں۔“

”کہاں کا لوں، کہاں کا نہ لوں۔ تم تو عجب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ماپ لینا شروع کیا تھا تو تم نے کہا ذرا اور نیچے کا لو......... ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کون سی آفت آ جائے گی؟“

”بھئی واہ......... چیز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے۔ کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے......... لو اب تم ماپ لو......“

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھلانا شروع کیا۔ جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”لو اب جلدی کرو۔“

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا۔ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”گز لائیے بی بی جی......... دے آؤں۔“

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا۔ ”ذرا ٹھہر جاؤ۔“

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا۔ جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اُگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو سرسراہٹ اسے محسوس ہوا کرتی تھی، اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور ناک میں پیدا کر دی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا اور بغل چھپ گئی تھی، مگر مومن اب بھی کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اٹھا رہا اور بغل میں اس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دے دیا اور کہا۔ ”جاؤ، واپس دے آؤ۔ کہنا

بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔"

مومن گز واپس دے کر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اس کے دل و دماغ میں دُھندلے دُھندلے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا، جس میں اس نے عید کے لئے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بُو اس کی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلہ بی بی کے پاس جائے اور اسے سلام کرے……… اس کی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کرے گی اور اس کی رومی ٹوپی………!

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھُندنا آ گیا اور پھُندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور چمکیلے پھُندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی۔ "مومن!"

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا اور اندر چلا گیا، جہاں شکیلہ نمونے کے مطابق اُودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر وہ مومن کی طرف متوجہ ہوئی۔ "میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں۔ سو گئے تھے کیا؟"

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ "نہیں بی بی جی۔"

"تو کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ……… کچھ بھی نہیں؟"

"کچھ تو ضرور کرتے ہو گے۔" شکیلہ یہ سوال کئے جا رہی تھی۔ مگر اس کا دھیان اصل میں بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ "ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا۔"

شکیلہ کھِل کھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اس تسکین نے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے۔ چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں شرماہٹ پیدا کر کے اس نے کہا۔ ”بڑی بی بی جی سے پیسے لے کر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔“

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا ”کیا کرو گے اس رومال کا؟“

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ ”گلے میں باندھوں گا بی بی جی...... بڑا اچھا معلوم ہوگا۔“

یہ سُن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

”گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا اسی سے پھانسی دے دوں گی۔“ یہ کہہ کر شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ سے کہا۔ ”کم بخت نے مجھے کام ہی بھلا دیا۔ رضیہ، میں نے اسے کیوں بلایا تھا؟“

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کر دی جو وہ دو روز سے سیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آ گیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا۔ ”دیکھو مومن میں تمہیں یہ بنیان اُتار کر دیتی ہوں۔ دوائیوں کی دوکان کے پاس جو ایک دکان نئی کھلی ہے نا، وہی جہاں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے، وہاں جاؤ اور پوچھ کے آؤ کہ ایسی چھ بنیانوں کے وہ کیا لے گا...... کہنا ہم پورے چھ لیں گے۔ اس لئے کچھ رعایت ضرور کرے...... سمجھ لیا نا؟“

”مومن نے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“

”اب تم پرے ہٹ جاؤ۔“

مومن باہر نکل کر دروازے کے اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیان اس کے قدموں کے پاس آ گرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی۔ ”کہنا ہم اسی قسم کی، اسی ڈیزائین کی، بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیے۔“

مومن نے ”بہت اچھا“ کہہ کر بنیان اُٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا، جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بُو بھی اس میں بسی ہوئی تھی۔ میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلّی کے بچّے کی طرح ملائم تھا، اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا گیا۔

جب بھاؤ واؤ دریافت کر کے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاؤز کی سلائی شروع کر چکی تھی ——— اس اُودی، اُودی ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی رومی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچک دار تھی۔

یہ بلاؤز شائد عید کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی۔ مومن کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کے لئے، استری نکالنے کے لئے، سوئی ٹوٹ گئی تو نئی سوئی لانے کے لئے۔ شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر باقی کام اُٹھا دیا تو دھاگے کے ٹکڑے اور اُودی ساٹن کی بیکار کترنیں اُٹھانے کے لئے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی۔ باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ مگر ساٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں ……… بالکل بے مطلب کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کا کیا کرے گا!

دوسرے روز اس نے جیب سے کترنیں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا۔ حتٰی کہ دھاگے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ایک گُچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا۔ لیکن اس کے تصوّر میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔

اس دن بھی اسے شکیلہ نے کئی بار بلایا ……… اُودی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچّا کیا گیا تھا تو اس پر سفید دھاگے کے بڑے بڑے ٹانکے جا بجا پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اس کے بعد کچّی حالت ہی میں شکیلہ ے اسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا۔ دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس آئینے میں خود اس کو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا۔ جب پُورا اطمینان ہو گیا تو اسے اُتارا۔ جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا، وہاں نشان بنائے۔ اس کی ساری خامیاں دُور کیں۔ ایک بار پھر پہن کر دیکھا، جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکّی سلائی شروع کی۔

ادھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا، ادھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے سے اُدھڑ رہے تھے ……… جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے

بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے۔ صرف چھو کر ہی نہیں............ بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے ——— اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے ان ساٹن کے ٹکڑوں سے اس کی ملائمیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے، جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے، اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے۔ جب اس نے ان کا گچھا بنایا تو دباتے وقت اسے معلوم ہُوا تھا کہ ان میں ربڑ کی سی لچک بھی ہے۔............ وہ جب بھی اندر آ کر بلاؤز کو دیکھتا اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی اس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہوں گے؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا............ مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا، کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیض اُتار کر اس نے پلنگ پر رکھی۔ اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا۔ جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا............ اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے ہوئے آئینہ کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے............ شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھیں۔ مومن سے رہا نہ گیا۔ چنانچہ اس سے کہا۔ ”بی بی جی۔ آپ نے درزیوں کو بھی مات کر دیا ہے!“

شکیلہ اپنی تعریف سُن کر خُوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کے لئے بے قرار تھی۔ اس لئے وہ صرف ”اچھا ہے نا؟“ کہہ کر باہر دوڑ گئی............ مومن آئینے کی طرف دیکھتا رہ گیا جس میں بلاؤز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لئے آیا تو اس نے کھونٹی پر لکڑی کے ہینگر میں اس بلاؤز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے غور سے دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے یوں لگا کہ کوئی اس کے جسم کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے۔

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے............ ڈپٹی صاحب

نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا.......... یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولا بنا ہوا تھا.......... پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اُڑنا شروع ہوئے.......... بہت اُوپر جا کر یہ پھٹنے لگے.......... پھر آندھی آگئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھُندنا کہیں غائب ہو گیا.......... پھُندنے کی تلاش میں نکلا.......... دیکھی اور ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا.......... نئے لٹھے کی بُو بھی یہیں کہیں سے آنا شروع ہوئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا .... ایک کالی ساٹن کی بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا.......... کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اسے خوف تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی.......... پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوئی۔ مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم میں رینگنے لگی۔

☆☆☆

دُھواں

مجموعہ : دھواں **اوّلین اشاعت: ۱۹۴۱** **معیار: ۴ ستارے**

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ ان کی کھالیں اُتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں، پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدّت نہیں تھی، لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دو کانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے، آوازیں مدھم تھیں۔ جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں چپکے چپکے۔ دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اُٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اُٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید

کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلا پن نہیں تھا، روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے، جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی، اس لیئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدّت اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے، ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آکر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ ـــــ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ سب بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ وہ بلبلا اُٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک

کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو، جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا، اس لئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لُوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی، اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا، جس میں کئی دفعہ سا، رے، گا، ما، آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اُٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ”امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ ان کی کھال اُتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا، بالکل ویسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔“

”اچھا......!“ یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں...... اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا......!" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اُٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

"......اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔"

"اچھا...." مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیسے پھڑکتا تھا؟"

"یوں.......... یوں"۔

مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"پھر کیا ہوا؟" یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔"

"گرم تھا......! اچھا، مسعود یہ بتاؤ، تم میرا ایک کام کرو گے؟"

"بتایئے۔"

"آؤ، میرے ساتھ آؤ۔"

نہیں آپ پہلے بتایئے، کام کیا ہے؟"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔"

"جی نہیں.......... آپ پہلے کام بتایئے۔"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے...... میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا...... اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم، بڑا درد ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو، درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھ سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں......؟" مسعود اُٹھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا۔ "چلئے، لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا......"

''شاباش، شاباش۔'' اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دُکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔ ''مسعود آج ضرور بارش ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اُٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ''دیکھیے باجی، گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔''

''بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ، ورنہ یاد رکھو، بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔'' کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔

مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوگیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں، تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کر دیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دوکان میں اپنی اُنگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے، جبکہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی ——— اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی، اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح

دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ ''شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح...... شاباش میرے بھائی......''

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں تڑپ سی گئیں —— بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہو گئی۔

مسعود گرتے گرتے بچا لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ''یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا؟ سیدھی لیٹ جائیے کہ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں......''

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی، اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ ''نا بھائی، میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم وحشیوں کی طرح دباتے ہو......''

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ ''نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا...... آپ اطمینان رکھیے، اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی......''

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگیں —— مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی، پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا۔ ''کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟'' لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

''بس، بس''۔ کلثوم تھک گئی۔ ''بس بس......''

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے۔ لیکن جب اس نے ارادہ کر کے مسعود کے لات جمانی چاہی تو مسعود اُچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور ناز بو کے ہرے ہرے پتّے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں ـــــ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔

بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی، کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزہ آیا۔ اس کے جسم کے کس حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی، اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھینچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ کوئی باورچی خانے میں تھا نہ صحن میں۔ ادھر اُدھر جتنے کمرے تھے، سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔

اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی۔ ”کون؟“

”جی میں ہوں مسعود!“

اندر سے آواز آئی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

”جی کھیل رہا ہوں!“

”کھیلو......“ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا۔ ”تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے، زیادہ شور نہ مچانا......“

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم باز ——— مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا۔ اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا——— اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

☆☆☆

بُو

مجموعہ : لذتِ سنگ **اوّلین اشاعت: ۱۹۴۴** **معیار: ۴ ستارے**

بَرسَات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگوں والے پلنگ پر جو اب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا ہے، ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھومروں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی ہوئی تھی۔

شام کے قریب، دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا، تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لئے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھانس کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں، عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لئے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی ——— رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ

رندھیر، جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذّب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا، لیکن اس پر فورٹ کے اکثر قحبہ خانوں کے دروازے صرف اس لئے بند کر دیے گئے تھے کیونکہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی۔ اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچن چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابلِ نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سُناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دُھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں ——— یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلا سکے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا کہ۔ "یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی.........."

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے۔ مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا، جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ اُبھر آیا تھا ——— کاشٹا کھول کر اس نے

ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا۔ ”میں کیا کروں، نہیں کھلتی......“

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا، اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی، جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے، ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیونکہ جو کچھ انھیں کہنا سننا تھا، سانسوں، ہونٹوں

اور ہاتھوں سے ملے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی بُوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جوان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے جاگ اُٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے کے لئے کپکپا اُٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سُنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سُنانا چاہئیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔ مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا، بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بُو آتی رہی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی، وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، ہر جگہ سے یہ بُو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے ہر سانس میں موجود تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی، اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بُو نہ اُڑتی ـــــ یہ بُو جو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی، اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بُو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے، عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے۔ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے، ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی، جو مائلِ پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی ـــــ وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بُو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلی تھی، رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے

سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے، لیکن نہیں، وہ بُو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی ـــــــ عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بُو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بُو دب جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار، ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھِن نہ آئی، بلکہ اسے عجیب طرح کی لذّت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بُو نکلی تھی جو غایت درجہ قابلِ فہم ہونے کے باوجود نا قابلِ فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو یہ مطلب سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے.......... اسی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہا رہے تھے، ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی، جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے ـــــــ برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اسی کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے، موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا، بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی روشنی بھی اتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے مُنہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا، ایک گوری چٹی لڑکی اپنے سَتر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سوگئی تھی ـــــــ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سُرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے اُترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہرے پھولوں والی قمیض، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ ـــــــ سب کا رنگ سُرخ تھا، بے حد سُرخ۔ یہ سب کپڑے

حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرّے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سُرخی اور مقیش کے ان ذرّات نے مل جُل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا، بے جان سا، اُڑا اُڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچّے رنگ نے جا بجا لال لال دھبّے ڈال دیے تھے۔

چھاتیاں دُودھ کی طرح سفید تھیں، جس میں تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سُرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا —— کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے، کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح۔ کیونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ملنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے ازار بند کا نشان —— وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نکلیس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں، جیسے ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہو —— برسات کے یہی دن تھے، پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچّے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کیے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سُنی —— لیکن وہ پکار کہاں تھی، وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بُو میں سونگھی تھی، وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچّے کے رونے سے کہیں زیادہ قابلِ فہم تھی، وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دُور، بہت دُور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اسے مٹمیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دُھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی، جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی، ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی جواب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالتِ نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جو بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس، بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبّوں کی صورت میں۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بُو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکلی تھی۔ وہ بُو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دُور رس تھی، جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا، جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور جو اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی، رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی ——— وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بُو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں، جب کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے، اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

☆☆☆

کالی شلوار

مجموعہ: دھواں **اوّلین اشاعت: ۱۹۴۲** **معیار: ۴ ستارے**

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی، جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ ”دس لیف، ویری بیڈ..........“ یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو کچھ نہیں ملتا۔“

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔ ”صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔“ اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی۔ ”صاحب، تم ایک دم اُلو کا پٹھا ہے، حرامزادہ ہے...... سمجھا!“۔ یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی —— گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلو کے

پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی، ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں ——— اس کے پاس صرف چھ آدمی آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا تھا۔ ’’بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے......‘‘ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا، چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا۔ ’’دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو نہ ہو گا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔‘‘ چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ ’’لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔‘‘ اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے، غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ——— بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر پانی ایک دم اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا۔ ’’کیا ہوا.........؟ یہ چیخ تمہاری تھی.........؟‘‘

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ’’یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا، میں نے کہا، چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھما کا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں.........‘‘

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا، اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے، وہ اس کی تلاش میں آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی، اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے، جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس۔ نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر

دیا۔ یہاں، وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں، دس پندرہ اچھی اچھی ساڑیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں، اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی——— ''یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں ''کوئلوں کی دوکان'' لکھا تھا، وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں ''شرفا کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے'' لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دو کان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''کیا بات ہے خدا بخش، پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا............ مانتی ہوں، آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے............''

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔ ''میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں............ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ............'' وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ، کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو —— اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''تم میری سنو اور چلو واپس انبالے............ یہاں کیا دھرا ہے............؟ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے، اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے............''

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ ''نہیں جانِ من! انبالے نہیں

جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آ کر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال و اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی

ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جارہی ہے……… نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کہیں رک جائے گی، کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے، ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں—— سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جارہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ ”دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔“ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ ”جانِ من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا………“

پورے پانچ مہینے ہوگئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آرہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں

تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرّم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ باہر بالکنی میں چلی گئی تا کہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

سامنے پٹریوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے، پر انجن کوئی بھی نہ تھا——شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا، اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹریوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں؟ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا۔ ”آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟“

وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا.........ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“

اس پر سلطانہ نے کہا۔ ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے.........“

وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے.........میں تمہارے اوپر والے فلیٹ

کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے..........“ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سلطانہ نے پوچھا۔ ”آپ جا رہے ہیں؟“

اس آدمی نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں.......... چلو، مجھے تمام کمرے دکھاؤ..........“

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام شنکر ہے..........“

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیض تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا، شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا۔ ”فرمائیے......!“

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا۔ ”میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے......“

جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ ”میں سمجھا...... لو اب مجھ سے سنو۔ جو کچھ تم نے سمجھا ہے، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے..........“

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ”آپ کام کیا کرتے ہیں؟“

شنکر نے جواب دیا۔ ”یہی جو تم لوگ کرتے ہو!“

”کیا؟“

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں .... میں .... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنّا کر کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی .... آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے؟"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی؟"

"میں جھک مارتی ہوں ...."

"میں بھی جھک مارتا ہوں ...."

"تو آؤ، دونوں جھک ماریں ...."

"حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو .... یہ لنگر خانہ نہیں ...."

"اور میں بھی والنٹیئر نہیں ...."

سلطانہ اب رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "اُلو کے پٹھے ...."

"میں اُلو کی پٹھی نہیں ...."

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ضرور اُلو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے ...." یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا: "تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو ...."

شنکر مسکرایا۔ "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ...... بولو، رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں ......"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’تو جاؤ، رستہ پکڑو……‘‘

شنکر آرام سے اٹھا، پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ ’’میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو، بلا لینا…… بہت کام کا آدمی ہوں۔‘‘

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا، جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدابخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا۔ ’’تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟‘‘

خدابخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ’’پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں……‘‘

’’کچھ انھوں نے تم سے کہا؟‘‘

’’نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے…… پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں، وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔‘‘

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدابخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ ’’تم سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو…… میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں، نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ، کیا ہوگا…… یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ

تو سہارا ہو ہی جائے گا..........‘‘

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا۔ ’’پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے...... خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب یہ برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے، اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے، کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم..........‘‘

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ’’تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو۔ پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے، اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے، سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو.......... دیکھو، تمہیں میری جان کی قسم! کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو...... میری بھتی کھاؤ، اگر نہ لاؤ...‘‘

خدا بخش اٹھ بیٹھا۔ ’’اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی ہو.......... میں کہاں سے لاؤں گا.......... افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں..........‘‘

’’کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔‘‘

’’دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے..........‘‘

’’تم کچھ نہیں کرو گے.......... تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو.......... جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی، اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟‘‘

’’اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔‘‘ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ ’’لو، اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔‘‘

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی تو خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی —— دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے

دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی —— اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔

نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسی ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ ’’تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ...... میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔‘‘

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ’’نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے......‘‘

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ ’’تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔‘‘

’’کیسی شرطیں؟‘‘ سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ ’’کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟‘‘

’’نکاح اور شادی کیسی؟ نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں...... چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو......‘‘

’’بولو، کیا بات کروں؟‘‘

’’تم عورت ہو...... کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے......‘‘

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔ ’’صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو......‘‘

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔"

شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا......"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں

ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں، خود سمجھنا چاہئیں........."

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا۔ "میں سمجھ گئی.........."

"تو کہو، کیا ارادہ ہے.........."

"تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو.......... اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو.......... تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے.........."

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے.......... یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ، اندر چلیں.........."

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "شنکر، میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر.........."

"کہو کہو.......... رک کیوں گئی ہو؟"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرّم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں.......... یہاں کے سارے دکھڑے تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا، جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے

دیا ہے.........‘‘

شنکر نے یہ سن کر کہا۔ ’’تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم کالی شلوار بنوا سکو۔‘‘

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ ’’نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔‘‘

شنکر مسکرایا۔ ’’میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی.........لو، بس اب خوش ہو گئیں نا! پھر سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ’’کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟‘‘

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ ’’تم ان کا کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔‘‘

اس پر شنکر نے کہا۔ ’’میں نے تم سے بُندے مانگے ہیں، ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو......‘‘

’’لے لو.........‘‘ یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔ پھر اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا۔ ’’ساٹن کی کالی شلوار ہے.........دیکھ لینا شاید لمبی ہو.........اب میں چلتا ہوں.........‘‘

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا، ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ویسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا، اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا ”قمیض اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے.......... کب بنوائی؟“

سلطانہ نے جواب دیا۔ ” آج ہی درزی لایا ہے.........“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ ”یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟“

مختار نے جواب دیا: ” آج ہی منگوائے ہیں.........“

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

☆☆☆

جانکی

مجموعہ: چغد **اشاعت: ۱۹۴۸** **معیار: ۴ ستارے**

پونہ میں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا۔ ''میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، اس کو یا تو پونہ میں یا بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں ملازم کرادو۔ تمہاری واقفیت کافی ہے، امید ہے تمہیں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔''

دقت کا تو اتنا زیادہ سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنہیں ان کی کمائی کھانا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا۔ لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پرانا دوست ہے، جانے کس یقین کے ساتھ بھیجا ہے، اس کو مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر بھی یک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لئے اگر وہ جوان ہو، ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں۔ اتنی تردد کی بات ہی کیا ہے، میری مدد کے بغیر ہی اسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔

خط ملنے کے چوتھے روز جانکی پونہ پہنچ گئی۔ کتنا لمبا سفر طے کر کے آئی تھی، پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونہ......... پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا، اس لئے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دور نہ چلنا پڑا کیونکہ سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی اتری۔ میری طرف وہ پیٹھ کر کے کھڑی ہوگئی اور ایڑیاں اونچی کر کے مجھے ہجوم میں تلاش کرنے لگی۔ میں نے قریب جا کر کہا، جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہوں۔

وہ پلٹی: ''اوہ، آپ!۔'' ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلف انداز

میں کہا۔ ''سعادت صاحب! سفر بہت ہی لمبا تھا۔ بمبئی میں فرنٹیئر میل سے اتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹنا پڑا، اس نے طبیعت صاف کر دی۔''

میں نے کہا: ''اسباب کہاں ہے آپ کا؟''

''لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی۔ دو سوٹ کیس اور ایک بستر نکالا۔

میں نے قلی بلوایا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا: ''میں ہوٹل میں ٹھہروں گی۔''

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لئے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا۔ اسے غسل وسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور آرام کرنا تھا، اس لئے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور یہ کہہ کر کہ صبح دس بجے مجھ سے ملے، ہوٹل سے چل دیا۔

صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر، جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، آئی جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہو گئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں، جو نیا نیا تھا موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر سے جاگا تھا، اس لئے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا، کہ وہ اچانک اندر داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔

جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھرپور تھی لیکن جب پربھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا، سوائے ایک بے وقوف نوکر کے۔ میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لئے میں ٹھہرا ہوا تھا، بالکل سنسان تھا اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔

میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا: ''ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی، پھر بھی شوق فرمائیے!''

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن ہچکچاتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر نے اسے چھیڑا ہے چنانچہ میں نے کہا: ''آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟''

''جی، جی نہیں!''

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا۔ چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے پوچھا: ''عزیز صاحب کیسے ہیں؟''

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا: ''منٹو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''پونہ میں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔''

''اوہ!''

میں نے پوچھا: ''کیوں بیمار ہیں آپ؟''

''جی ہاں:'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا: ''کیا تکلیف ہے؟''

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لئے جاتے تھے وا ہوئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر کہا: ''معاف کیجئے گا میں سگریٹ پیا کرتی ہوں۔''

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔ بالکل مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً پچھتر سگریٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ بتاتی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟''

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔

''ہائے اللہ! میں کیسے بتاؤں آپ کو'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔ وہ بیٹھ گئی

اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا: "بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ......"

پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا "ایسا اکثر ہوتا ہے۔"

اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہر نہ گیا ہو۔"

میں نے کہا: "اوہ!"

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن چائے کی طشتری میں دبائی: "اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دن ہی میں سب صاف ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا: "آپ کو بچے پسند نہیں؟"

وہ مسکرائی "پسند ہیں......لیکن کون پالتا پھرے۔"

میں نے کہا: "آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی......پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا: "مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کونسی بات ہے۔ اپنی ہی تو چیز ہے۔ اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔

بڑا جرم ہے!"

میں بے اختیار ہنس پڑا: "عجیب وغریب عورت ہو تم جانکی!"

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کیا: "عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔"

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پر خلوص ہوں، ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا: "سعادت صاحب! بتائیے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں؟"

میں نے کہا ”بہت“۔

”جھوٹ!“

”اس کا ثبوت؟“

اس نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا: ”بھئی، شاید ایسا ہو۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ کچھ بے وقوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں، زیادہ ہنستی ہوں۔ اب آپ ہی دیکھئے نا زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔“

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی۔ بیچ بیچ میں گھنگھرو سے بجتے تھے۔

پھر وہ اسقاط حمل کے متعلق باتیں کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست، جس کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا آ گیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائریکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کر رہا تھا، اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لئے ضرور لے لے گا۔

پونہ میں جتنے اسٹوڈیو تھے، میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کے لئے کوشش کی کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا۔ کسی نے کیمرہ ٹسٹ۔ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے کے باعث پریشان تھی، چار پانچ روز متواتر جب اسے مختلف فلم کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گزارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

بچہ ضائع کرنے کے لئے وہ ہر روز بیس بیس گرین کونین کھاتی تھی۔ اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی سی رہتی تھی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں، اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی ——— پونہ پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلا ناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے، اس لئے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں گھر میں کئی بار بیوی سے ان کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انہوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مند رہتی ہے، محض بکواس ہے، بناوٹ ہے لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب بھی خط آیا جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔

فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا۔ دن واقعی اوپر ہو گئے تھے لیکن وہ بات جس کا اسے کھٹکا تھا، نہیں تھی۔

جانکی کو پونہ آئے بیس روز ہو چلے تھے۔ عزیز کو وہ خط پر خط لکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونہ میں اگر جانکی کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبئی میں کوشش کروں کیونکہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں۔ بات معقول تھی لیکن میں سنیریو لکھنے میں مصروف تھا، اس لئے جانکی کے ساتھ بمبئی جانا مشکل تھا، لیکن میں نے پونہ سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا، ٹیلی فون کیا اِتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہ تھا۔ آفس میں نرائن کھڑا تھا اسے جب معلوم ہوا کہ میں پونہ سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلّایا: ”ہلو، منٹو.......... نرائن اسپیکنگ فرام دس انڈ.......... کہو، بات کیا ہے۔ سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے۔ گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا ”کیا مطلب؟“

نرائن نے ادھر سے جواب دیا، کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں۔ رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹانکا ملا لیا ہے۔

میں نے کہا: ”لیکن یہ حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے؟“

نرائن بولا: ”بڑا کمینہ ہے یار، سعید — اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید کر دیئے تھے“۔ ”بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔“

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب وموزوں لفظوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا۔

میں تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی: ”عورت! پشاور کی عورت خو، بیجو اس کو جلدی۔ خو ہم بھی قصور کا پٹھان ہے۔“

میں نے کہا ”بکواس نہ کرو نرائن سنو، کل دکن کوئن سے میں انہیں بمبئی بھیج رہا ہوں۔ سعید یا تم کوئی بھی اسے اسٹیشن پر لینے کے لئے آ جانا ______ کل دکن کوئن سے۔ یاد رہے۔

نرائن کی آواز آئی: ”پر ہم اسے پہچانیں گے کیسے؟“

میں نے جواب دیا ”وہ خود تمہیں پہچان لے گی — لیکن دیکھو کوشش کر کے اسے کسی نہ کسی جگہ ضرور رکھوا دینا۔“

تین منٹ گذر گئے۔ میں نے جانکی سے کہا۔ ”کل دکن کوئن سے تم بمبئی چلی جانا۔ سعید اور نرائن دونوں کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ لمبے تڑنگے خوبصورت جوان ہیں۔ تمہیں پہچاننے میں دِقت نہیں ہوگی“۔

میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نرائن کی مختلف فوٹو دکھائے ______ دیر تک وہ انہیں دیکھتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے، اس نے مجھ سے پوچھا ”دونوں کیسے آدمی ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں ____ میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی بُرے ہوتے ہیں۔“

اس کے لہجے میں ایک ٹوہ لینے والی سنجیدگی تھی۔

میں نے کہا: ”یہ تو درست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے!“

”کیوں؟“

”دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا

اندازہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ تمہارا خیال کیا ہے، کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی تہہ کی جلن کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں۔ ''

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: '' وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں'' میں نے کہا '' بالکل درست۔ فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل کی واقفیت ہو۔ ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے، یہ ناکامِ محبت والا ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ وہ عورت جو پانچ وقت جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سُور کے برابر سمجھتی ہے، کیمرے کے سامنے کسی مرد کے ساتھ اظہارِ محبت کیا خاک کرے گی!''

اس نے پھر سوچا: '' اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔ ''

میں نے کہا: '' یہ ضروری نہیں۔ فلم لائن میں آکر بھی وہ چیزیں جان سکتی ہے اس نے میری بات پر غور نہ کیا اور جو پہلا سوال کیا تھا پھر اسے دہرایا:

'' سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں؟

'' تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟ ''

'' تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟ ''

'' یہ کہ دونوں میں سے تمہارے لئے کون بہتر رہے گا! ''

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گزری:

'' کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ ''

'' جیسی تم چاہتی ہو''۔

'' ہٹائیے بھی۔ '' یہ کہہ کر وہ مسکرائی '' میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ ''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: '' جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔ ''

'' کیوں؟ ''

'' اس لئے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔ ''

میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ سعید شاعر ہے، ایک بہت بے رحم قسم کا شاعر۔ مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کے بجائے اس کی گردن مروڑے گا۔ گردن مروڑ کر اس کے پر نوچے گا۔

پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالے گا۔ یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اس مرغی کی موت پر ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوگی۔

شراب پیئے گا تو کبھی بہکے گا نہیں۔ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ صبح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اٹھے گا۔ نوکر چائے کی پیالی بنا کر لائے گا۔ اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لے گا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پیئے گا جیسے اس میں ذائقے کی کوئی حس ہی نہیں۔ بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے، مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ پیپ نکل رہی ہے، گل سڑ گیا ہے، ناسور بننے کا خطرہ ہے، لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ آپ اس سے کچھ کہیں گے تو یہ جواب ملے گا۔ ''اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جزو بدن ہو جاتی ہیں جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے''۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی اچھا شعر نظر آ گیا ہے۔

ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا، اس لئے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب قریب عاری ہے۔ میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا ایک جگہ اس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا۔ خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کُتے کا پنجہ پکڑا جاتا ہے۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اچھے شاعر ہو، گھر بیٹھو اور نظمیں لکھا کرو۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکٹنگ کی دھن سوار ہے۔

نرائن مجھے بہت پسند ہے۔ اسٹوڈیو کی زندگی کے جو اصول اس نے اپنے لئے وضع کر رکھے ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔

۱............ایکٹر جب تک ایکٹر ہے، اسے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ شادی کرلے تو فوراً فلم کو طلاق دے کر دودھ دہی کی دکان کھول لے۔ اگر مشہور ایکٹر رہا ہے تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔

۲............کوئی ایکٹرس تمہیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو فوراً اس کے کان میں کہو، آپ کی انگیا کا سائز کیا ہے۔

۳.......... کسی ایکٹرس پر اگر تمہاری طبیعت آ گئی ہے تو تمہیدیں باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس سے تخلیئے میں ملو اور کہو کہ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، اس کا یقین نہ آئے تو پوری جیبھ باہر نکال کر دکھا دو۔

۴.......... اگر کوئی ایکٹرس تمہارے حصّے میں آجائے تو اس کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔ ایکٹرسوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لئے یہ پیسہ حلال ہے۔

۵.......... اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹرس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس قسم کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

۶.......... یاد رکھو کہ ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ اسے ریزر اور کنگھی سے سنوارنے کے بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو، مثال کے طور پر کوئی نیک کام کر کے۔

۷.......... اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو۔ صبح اسٹوڈیو میں آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ یہاں نہیں تو دوسری دنیا میں، جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔

۸.......... شراب اور ایکٹرس کی عادت ہرگز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کسی روز کانگریس گورنمنٹ لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دے دے۔

۹.......... سوداگر، مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے۔ لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر، یا مسلم ایکٹر نہیں ہو سکتا۔

۱۰.......... جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں "نرائن کے دس احکام" کے عنوان تلے اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں جن سے اس کے کیریکٹر، کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارتاً بتا دیئے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر تم اس لائن میں آگئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا پڑے گا۔ نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہوگا۔

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بمبئی چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیونکہ نرائن نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک سال کے لئے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرا دیا تھا۔ یہ ملازمت اسے کیسے ملی، دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئی۔ جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا:

''سعید اور نرائن، دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی، ان میں سے کس نے تم کو زیادہ پسند کیا؟''

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''سعید صاحب!'' یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ''سعادت صاحب آپ نے کیوں اتنے پل باندھے تھے۔ نرائن کی تعریفوں کے؟''

میں نے پوچھا: ''کیوں''

''بڑا ہی واہیات آدمی ہے۔ شام کو باہر کرسیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لئے بیٹھے تو باتوں باتوں میں میں نے نرائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر پوچھا:

''تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے۔''

''بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں تو آگ ہی لگ گئی۔ کیسا لچر آدمی ہے'' جانکی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے تیزی سے کہا: ''آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟''

''اس کی بے وقوفی پر۔'' یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کر دیا۔

تھوڑی دیر نرائن کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکرمند لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا، اس لئے طرح طرح کے خیال اسے ستا رہے تھے۔ کہیں انہیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھادھند سائیکل چلاتے ہیں، کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ یونہی نہ آ رہے ہوں، کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تردّد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کر دیں۔ گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے، اس لئے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انہی کو

کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائی فائڈ ہو گیا تھا تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی طرح اس کی تیمار داری کرتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی جہاں اس کے لئے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔

پونہ میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخدمت وصول کرکے میں نے بمبئی کا رخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور نرائن، دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے، تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے، جو نوکروں کے لئے اکثر کھلا رہتا ہے۔ میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے، حسب معمول بے حد غلیظ تھے۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آرہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا پائنتی پر کمبل پڑا تھا، یہ میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا ہاتھ نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔ نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی، مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا لیکن وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی خاص موضوع پر نہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بے ہودہ بکواس کرنا چاہتا تھا؛ چنانچہ صبح نو بجے تک ہم بے ہودہ بکواس میں مشغول رہے، جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا۔ ہنستے ہنستے اس نے کہا سب

سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے تو اس نے بتا دیا کہا: ''چوبیس''۔

اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا۔ اور مجھے کوسنا شروع کر دیا۔ بالکل بچی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو سینے پر دوپٹہ رکھ لیتی ہے۔ لیکن منٹو! بڑی وفادار عورت ہے۔

میں نے پوچھا: ''یہ تم نے کیسے جانا؟''

نرائن مسکرایا: ''عورت، جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتا دے، دھوکے باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔''

عجیب و غریب منطق تھی۔ لیکن نرائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین دلایا کہ جانکی بڑی پُر خلوص عورت ہے۔ اس نے کہا منٹو: ''تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پرلے درجے کا بے پرواہ ہو آسان کام نہیں۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھا رہی ہے۔ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پُر خلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس خرذات کو جگانے میں آدھ گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے، کپڑے پہناتی ہے، ناشتہ کراتی ہے۔ اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے۔ اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہے ------ ''سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھا گاتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لئے پشاور سے پوٹھوہاری سینڈل منگوائی ہے۔ سعید صاحب کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپرو لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا۔ اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انگیا والی بات یاد کر کے تیوری چڑھا لیتی ہے۔''

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئی۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی لیکن اسے اس کی بے پرواہ طبیعت کا بہت گلہ تھا۔

''سعادت صاحب! اپنی صحت کا بالکل خیال ہی نہیں رکھتے۔ بہت بے پرواہ ہیں۔ ہر وقت سوچتا

جو ہوا اس لئے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا۔ آپ ہنسنے لگے، لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں۔"

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کو کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا ہے۔ کیا سعید کو پا کر وہ اس کو بھول چکی تھی؟

میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا۔ جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا، اس کے مالک سے میری کسی بات پر چخ ہو گئی اور میں دماغی تکدر دور کرنے کے لئے پونہ چلا گیا۔ دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ بمبئی سے عزیز کا تار آیا کہ میں آ رہا ہوں ——— پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی ——— میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں، شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔

عزیز کا خیال تھا کہ ہوٹل میں اٹھ جائے لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا تھا آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولہاپور گیا تھا، اس لئے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ تین کمرے تھے، ایک میں جانکی سو سکتی تھی دوسرے میں عزیز۔ یوں تو مجھے ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیے تھا لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہیں کیا تھا۔

رات کو وہ دونوں سنیما دیکھنے چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا، اس لئے کہ میں فلم کے لئے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی تھی۔ اس لئے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔

رات کو میں چاہے بہت دیر تک کام کروں، ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں۔ حسب عادت اس رات کو بھی میں پانی پینے کے لئے

اٹھا۔ اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا، یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا، عزیز کے پاس تھا، اور اس میں میری صراحی پڑی ہوئی تھی۔

اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا، اس لئے مجھے دستک دینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا ''سعید صاحب!۔'' اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی ''اوہ'' اس کے منہ سے نکل گئی۔

اندر کے پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لئے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی: ''عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انہیں زکام ہو جاتا ہے۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے، اور رہتے بھی کیوں نہیں جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی......... آپ نے دیکھا انہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں!''

اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لئے کہا: ''مجھے کل یہاں پہنچتے ہی انہیں تار بھیجنا چاہئے تھا۔ کتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ انہیں بہت تشویش ہو رہی ہو گی۔''

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنی بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔

چار روز گزر گئے۔ سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کئے پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ وہ اضطراب بھی شامل تھا ـــــ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی' سعادت صاحب میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں، ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوط کا جواب ضرور لکھتے۔

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا۔ ''میں بہت بیمار ہوں فوراً چلی آؤ۔''

تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔

عزیز کو اس کی یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا ہو ——— جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا: ''میں جاتی ہوں، لیکن بہت جلد واپس آ جاؤں گی۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''سعادت صاحب ان کا خیال رکھیے ابھی تک ان کا بخار دور نہیں ہوا ہو۔''

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی پر بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اس کے بعد جانکی کی۔ لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوا پی تھی یا نہیں؟ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی لیکن آدھ گھنٹے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مند رہی تھیں، عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دبا دبا شور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے

باہر نکلا تو عزیز تانگے میں اسباب رکھوا رہا تھا۔

میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا۔ ”بمبئی ____ انشااللہ، پھر ملاقات ہو گی۔“

یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونکائٹس ہے، اگر احتیاط نہ برتی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دے کر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا، اس لئے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے۔ یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تکئے میں سر دے کر روتی رہی۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جب کہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت بھی کسی قدر درست تھی بمبئی سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں یہ لکھا تھا ”یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔“ میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونہ ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہو گئی۔

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا ”ایک ضروری کام ہے، فوراً بمبئی چلے آؤ۔“ میرا خیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہو گی۔ لیکن بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونہ سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لئے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بُری طرح چھل گئی تھی۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ“ تو اسے بہت روحانی تکلیف ہوئی۔

نرائن نے مجھے بتایا: ”سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے لفظ سن کر وہ ایک لمحے کے لئے بالکل پتھر ہو گئی میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے بعد یہ ضرور سوچا ہو گا میں گاڑی کے نیچے آ کر کیوں نہ مر گئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے، بہت ہی

نامردانہ ہے۔ بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی اور وہ بھی اس خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث۔ لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا۔ مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ ______ اس کے لہجے میں منٹو کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔ بس ایسا تھا جیسے لنوٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا، چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جانکی موجود نہیں تھی لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا، رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے روز اسٹوڈیو سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک ایکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے، بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا اس لئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے ______ تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کس حالت میں ہے۔"

میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد اس کے پُر خلوص استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔

اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں پر ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔

ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا تو معلوم ہوا وہ صبح ہی سے غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھائیں جن کا منہ ربڑ سے بند تھا: "جانتے ہو یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا معلوم نہیں۔ انجکشن سے لگتے ہیں۔"

نرائن مسکرایا: "انجکشن ہی ہیں لیکن پنسلین کے۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ پنسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی ہے، تھوڑی تھوڑی۔ ملٹری ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔

چنانچہ میں نے نرائن سے پوچھا: "یہ تو بالکل نایاب چیز ہے، تمہیں کیسے مل گئی؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا: "بچپن میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے

بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ آج دائیں ہاتھ سے ملٹری ہوسپٹل کا ریفریجریٹر کھول کر میں نے یہ تین بلب چرائے ہیں.......... چلو جلدی کرو جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل میں لے آؤ۔"

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائن دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔

جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لایا ہوں۔ ہر بار میں نے یہی جواب دیا: "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

اور جب اسے معلوم ہوا۔ یعنی جب نرائن سرنج ہاتھ میں لئے اسے ٹیکہ لگانے کے لئے اس کمرے میں آیا تو نفرت سے ایک طرف اس نے منہ پھیر لیا اور مجھ سے کہا: "سعادت صاحب اس سے کہیے چلا جائے یہاں سے۔"

نرائن مسکرایا: "جان من غصہ تھوک دو۔ یہاں تمہاری جان کا سوال ہے۔" جانکی کو طیش آ گیا نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی: "سعادت صاحب! میں جاتی ہوں یہاں سے یا آپ اس حرام خور کو نکالئے باہر۔"

نرائن نے دھکا دے کر اسے جانکی کو کندھوں سے پکڑ کر لٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا: "یہ حرام خور تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا۔ خبردار جو تم نے مزاحمت کی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا، سرنج مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی اور اس کا ڈنٹر صاف کیا۔ اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی وہ چیخی، لیکن پنسلین اس کے جسم میں جا چکی تھی۔

جب نرائن نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ نرائن نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور اسپرٹ لگی روئی سے انجکشن والا حصہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پہلا انجکشن رات کے نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے بعد دینا تھا۔ نرائن نے مجھے بتایا اگر تین کے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلن کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا، چنانچہ وہ جاگتا رہا تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹوو جلایا، سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔

جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نرائن نے دوسرے

بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرنج کی سوئی اندر کھبو دی۔ جانکی کے ہونٹوں سے پتلی سی چیخ نکلی۔ نرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا: ”اب تیسرا تین بجے“

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آ رہی تھی اور نرائن ہوٹل کے بیرے سے برف کے لئے کہہ رہا تھا کیونکہ اس پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔

نو بجے پانچواں انجکشن دینے کے لئے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے نرائن کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

نرائن مسکرایا: ”کیوں جانِ من! کیا حال ہے؟“

جانکی خاموش رہی۔

نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ”یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں، عشق کے انجکشن نہیں۔ تمہارا نمونیہ دور کرنے کے انجکشن ہیں جو میں نے ملٹری ہوسپٹل سے بڑی صفائی کے ساتھ چرائے ہیں............ لو، اب ذرا الٹی لیٹ جاؤ اور کولہے پر سے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو...... ......کبھی لیا ہے یہاں انجکشن؟“

یہ کہہ کر اس نے جانکی کے کولہے پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی کھبوئی۔ جانکی کی آنکھوں میں مرعوب سی بے رخی پیدا ہوئی۔

جب اس نے کروٹ بدلی تو نرائن نے کہا: ”شاباش؛“

پیشتر اس کے کہ جانکی کوئی مزاحمت کرے نرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی اور مجھ سے کہا: ”اسپرٹ لگاؤ؛“

جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو نرائن نے کہا: ”جانکی! ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ...... میں انجکشن لگا کے رہوں گا۔“

غرض کہ پانچواں انجکشن دے دیا گیا۔ ابھی پندرہ اور باقی تھے، جو نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے۔ اور یہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔

پانچ انجکشن سے گو جانکی کو بظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ لیکن نرائن کو پنسلین

کے اعجاز کا یقین تھا اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نرائن کا نوکر میرے نام ایک تار لے کر آیا۔ پونہ سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلایا تھا اس لئے مجھے جانا پڑا۔

دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل ہی میں ہے۔ ہوٹل بہت دور، شہر میں تھا اس لئے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔

صبح آٹھ بجے ہوٹل پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ میں نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گی۔ اور نرائن نے جو اس کے ساتھ لیٹا تھا، مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا۔ ” آؤ منٹو، آؤ............ میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں...... آؤ یار...... بیٹھو اس کرسی پر ـــــــ ہاں ذرا یہ جانکی کی شلوار دینا:“

☆☆☆

شاردا

مجموعہ: ٹھنڈا گوشت **اشاعت: ۱۹۵۰** **معیار: ۴ ستارے**

نذیر بلیک مارکیٹ سے وسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑے ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھاٹک سے کچھ ادھر سگریٹ والے کی دکان سے اس کو اسکوچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پئے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا۔ ”موسم دیکھ کتنا اچھا ہے۔ پھر وہ اسے وہ بھونڈا سا شعر سنائیگا۔

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور چخ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی، اور اس کے کہنے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دوکان سے وہ بیس پچیس گز دور گیا ہوگا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا۔ چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا۔ ”کیوں بھئی، کہاں ہوتے ہو؟ کبھی نظر ہی نہیں آئے۔“

اس آدمی نے مسکرا کر کہا۔ ”حضور! میں تو یہیں ہوتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے۔“

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا ”میں اب جو تشریف لے آیا ہوں!“

”تو چلئے میرے ساتھ!“

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ ”چلو!“

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنیٰ خیز طریقے پر مسکرایا۔ ”باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔“

یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”کریم — آپ بھول گئے تھے؟“

نذیر کو یاد آ گیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لئے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔ بڑا ایماندار دلال تھا۔ اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ کریم سے اس نے معذرت چاہی۔ ”یار! میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے۔ غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔“

”جی ہاں۔“

”تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا ناکا ہوا کرتا تھا!“

کریم نے بیڑی سُلگائی اور ذرا فخر سے کہا۔ ”وہ میں نے چھوڑ دیا۔ آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔“ نذیر نے اُس کو داد دی۔ ”یہ بہت اچھا کام کیا ہے تم نے۔“

کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجے میں کہا۔ ”دس چھوکریاں ہیں۔ ایک بالکل نئی ہے۔“

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ ”تم لوگ یہی کہا کرتے ہو۔“

کریم کو برا لگا۔ ”قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سؤر کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو۔ پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔ ”آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پسنجر آیا تھا۔ جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو۔“

نذیر نے پوچھا۔ ”کنواری تھی؟“

“جی ہاں۔ دو سو روپے لئے تھے اس پنجر سے۔”

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا۔ “لو، یہیں بھاؤ پکا کرنے لگے!”

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بری لگی۔ “قسم قران کی سور ہو جو آپ سے بھاؤ کرے۔ آپ تشریف لے چلئے۔ آپ جو بھی دیں گے، مجھے قبول ہوگا۔ کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔”

نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا۔ بن پیے مسرور تھا۔ “چلو یار، آج تمام عیاشیاں رہیں—ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیے۔”

کریم نے پوچھا۔ “آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟”

“پینتیس روپے میں۔”

“کون سا برانڈ ہے؟”

“جونی واکر۔”

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا: “میں آپ کو تیس میں لا دوں گا۔”

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیئے۔ “نیکی اور پوچھ پوچھ ——— یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی کرنا۔ تم جانتے ہو میں ایسے معاملوں پر اکیلا نہیں پیا کرتا۔”

کریم مسکرایا۔ “اور آپ کو یاد ہوگا میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔”

نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا۔ “آج دو رہیں!”

“جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔”

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر ’میرینا ہوٹل‘ لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی۔ سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سود خور پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاتوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کرسچین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی۔

چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔ کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔ ایک بڑا، لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا۔ یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا۔ ”تشریف رکھیے۔ لیکن میں یہ عرض کردوں اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا“

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا۔ ”دس روپے زیادہ ہیں یار!“

کریم نے کہا۔ ”بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔ اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پرواہ نہیں کرتے۔“

نذیر نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو — کرایہ پیشگی دے دوں؟“

”جی نہیں ——— آپ پہلے چھوکری تو دیکھیے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔ گھریلو قسم کی ہندو لڑکی، سفید دھوتی باندھے تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔

کریم نے اس سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔“

لڑکی نظریں نیچی کیے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا۔ ”اپنا اطمینان کر لیجیے نذیر صاحب —— میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔“

نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا۔ ”آپ کا نام؟“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے جناب؟“

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”شکنتلا۔“

اور نذیر کو شکنتلا یاد آ گئی جس پر راجہ دشینت عاشق ہوا تھا۔ ”میرا نام دشینت ہے۔“ نذیر مکمل عیاشی پر تلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔ اتنے میں کریم آ گیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں۔ ”مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے۔ برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں۔“

نذیر بہت خوش ہوا۔ تم کمال کرتے ہو۔“ پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ”جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟“

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ کریم نے جواب دیا۔ ”نذیر صاحب! یہ نہیں پیتی۔ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے۔“

یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا۔ ”یہ تو بہت بری بات ہے۔“

کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لئے ایک پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا۔ ”آپ راضی کر لیجئے اسے۔“

نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پیگ پیا۔ فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلود ہو گئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا۔ ”چھوکری پسند ہے نا آپ کو؟“

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنتلا جس پر راجہ دشینت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا، بہت ہی خوبصورت تھی۔ کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ آہو چشم تھی۔ نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بری نہیں تھی۔ آہو چشم تو نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم سے کہا۔ ”ٹھیک ہے یار ——— بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟“

کریم نے آدھا پیگ اپنے لئے انڈیلا اور کہا۔ ”سو روپے!“

نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شکنتلا کے

پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ زبردستی اس کو چوما۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے، اس لئے کہ شکنتلا بالکل الہڑ تھی۔ اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اناڑی تیراک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے دڑبے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا۔ ”کیا بات ہے نذیر صاحب؟“

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا۔ ”کچھ نہیں یار، یہ اپنے کام کی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“

کریم نے شکنتلا کو الگ لیجا کر بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا۔ ”میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔“

نذیر نے اس کو روکا۔ ”جانے دو۔ کوئی اور لے آؤ۔“ لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا۔ ”وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں، انہیں یہاں بھیج دو ——— میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں، آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!“

کریم، نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں۔ نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لئے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی، دور ہوگئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے

اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگریٹ والے کی دوکان سے خریدنے کی بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں لے دے گا۔ چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا۔ ”نذیر صاحب! شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح کی گاڑی سے پہنچی ہے ——— بہت ہٹیلی ہے۔ مگر آپ اس کو ضرور راضی کرلیں گے۔“

نذیر کچھ سوچ نہ سکا۔ اس نے اپنے دل میں اتنا کہا۔ ”چلو دیکھ لیتے ہیں ——“ لیکن اس نے کریم سے کہا۔ ”تم پہلے یار وسکی لے آؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیئے۔

کریم نے نوٹ لے کر نذیر سے کہا۔ ”میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھئے۔“

نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے۔ لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنتلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا۔ جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹانگیں پلنگ پر رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی۔ کریم داخل ہوا۔ اس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا۔ ”نذیر صاحب! آرہی ہے۔ لیکن آپ ہی رام کیجئے گا اسے۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل صورت قریب قریب شکنتلا سے ملتی تھی، تیوری چڑھائے، شکنتلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی بے پروائی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لیجا کر ”آداب۔“ کہا اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”آپ شکنتلا کی بہن ہیں؟“

اس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ”جی ہاں!“

نذیر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شکنتلا سے غالباً تین برس بڑی تھی، بڑے غور سے دیکھا۔ نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ

بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”جناب! آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟“

وہ برس پڑی۔ ”میں ناراض کیوں نہ ہوں ——— یہ آپ کا کریم میری بہن کو جے پور سے اڑا لایا ہے۔ بتائیے آپ میرا خون نہیں کھولے گا، مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟“

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔ ”شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں۔ بہت الہڑ ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید برا مانیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں۔“ اس نے کچھ نہ کہا۔ ”نذیر نے اس سے دریافت کیا۔ ”آپ کا نام؟“

شکنتلا کی بڑی بہن نے مختصراً کہا۔ ”شاردا۔“

نذیر نے پھر اس سے پوچھا۔ ”آپ کا وطن؟“

”جے پور۔“ اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا۔

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا۔ ”دیکھیے، آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ——— کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں، لیکن میرا کوئی قصور نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا۔ ”یہ قصور البتہ میرا ہے۔ اس کی سزا میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔“

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہو گئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے۔ ”بتائیے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں؟“

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈبے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی۔ نذیر نے اسے روکا۔ ”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

وہ ایک دم ماں بن گئی۔ ”منی رو رہی ہے، دودھ کے لئے۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا۔ اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈے لے کر آ گیا۔ اس نے نذیر کے لئے سوڈا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے؟ ـــــــ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹا لیا ہو گا۔“

نذیر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بڑی غصیلی عورت ہے۔“

”جی ہاں ـــــــ صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے۔ آپ ذرا اس کو رام کریں ـــــ شکنتلا خود یہاں آئی تھی، اس لئے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے۔ اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا ـــــ اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے ـــــ آپ منا لیجیے نا اس کو!“

نذیر نے اس سے کہا۔ ”منانے کی کیا بات ہے؟“

کریم نے اس کو آنکھ ماری۔ ”سالی مجھ سے تو مانتی نہیں۔ جب سے آئی ہے، ڈانٹ رہی ہے۔“

اتنے میں شاردا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو غصے سے دیکھا۔ اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔

منی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کا نوٹ دے کر کہا۔ ”جاؤ ایک وکس کی بوتل لے آؤ!“

کریم نے پوچھا۔ ”وہ کیا ہوتی ہے؟“

نذیر نے اس سے کہا۔ ”زکام والی دوا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا۔ ”کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر، منی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ منی خوش شکل نہیں تھی لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لئے دلکش تھی۔ اس نے اس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور شاردا سے

کہا۔ ''اس کی ماں تو میں ہوں۔''

شاردا مسکرائی۔ ''لایئے، میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔''

شاردا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی۔ اب اس کے چہرے پر غصّے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟''

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ شاردا نے غصّے کا اظہار نہ کیا۔ ''جواب دیجئے جناب!''

شاردا خاموش رہی۔ نذیر نے اٹھ کر ایک پیگ پیا تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا۔ ''مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔''

نذیر نے ایک پیگ گلاس ڈالا۔ اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا۔ ''آپ کو اس سے نفرت ہے۔ کیوں؟''

شاردا نے مختصر سا جواب دیا۔ ''بس، ہے۔''

''تو آج سے نہیں رہے گی ——— یہ لیجئے۔'' یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

''میں ہرگز نہیں پیوں گی۔''

''میں کہتا ہوں، تم ہرگز انکار نہیں کرو گی۔''

شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غٹاغٹ پی گئی۔ قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ کر اس نے نذیر سے کہا۔ ''یہ پہلی اور آخری بار ہے۔ لیکن میں نے کیوں پی؟''

نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا۔ ''یہ مت پوچھو۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اس نے نذیر سے کہا۔ ''آپ نے کمال کر دیا ——— آپ سے

سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجئے!"

نذیر، شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔ اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔ وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فیصد صحیح جواب تھی۔ اس نے کریم سے کہا۔ "میں کل ادا کر دوں گا ______ ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔ آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے۔"

کریم نے کہا۔ "کوئی واندہ نہیں ہے ______ میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کر لیا ______ حضور! میری جان کھا گئی تھی۔ اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

کریم چلا گیا ______ شاردا آئی۔ اس کی گود میں منّی تھی۔ نذیر نے اس کو پانچ روپے دیئے لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اس سے مسکرا کر کہا۔ "میں اس کا باپ ہوں۔ تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

شاردا نے روپے لے لئے، بڑی خاموشی کے ساتھ۔

شروع شروع میں وہ بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا۔ "لو بھئی شاردا، میں چلا۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا۔

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کئے۔ ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کو پینے کے لئے کہا تو وہ بولی۔ "میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔"

نذیر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا ______ جب گھر لوٹا وہ بے حد مطمئن تھا۔ پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن۔ شاردا اپنی واجبی شکل و صورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔

نذیر بار بار سوچتا تھا۔ "یہ کیسی عورت ہے ______ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش مگر جسمانی طور پر ایسی پُرگو عورت نہیں دیکھی۔"

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اس کو روپے پیسے سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر ساٹھ روپے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپے ہوٹل والا لے جاتا تھا۔ باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن وضع کر لیتا تھا۔ مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔ نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے بڑی شدّت سے محسوس کیا کہ شاردا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بجائے شاردا ہو۔ یہ بہت بری بات تھی۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا، اس لئے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا۔ ”شاردا! میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی، ختم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا؛ حالانکہ چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں۔“

شاردا نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ ”جتنے روپے میرے پاس ہیں، آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں شکنتلا کو لے کر واپس چلی جاؤں۔“

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا۔ ”بکواس نہ کرو ——— تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہو گیا ہے، بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔“

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اس کو بلایا۔ مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا۔ ”آپ یہ روپے لے لیجئے —— اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے۔“

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیئے۔ شاردا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اس نے آداب عرض کیا اور کہا۔ ”میں آج شام کو جے پور جا رہی ہوں۔“

نذیر نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

شاردا نے مختصر جواب دیا: ”مجھے معلوم نہیں۔“ اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اسے بلا کر لائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔

وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا: ”نذیر صاحب! آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟“

نذیر نے اس سے کہا۔ ”بھائی میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں ——— ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل کے اور اوپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تو دیوالہ پٹ گیا ہے ——— خدا کی قسم، مقروض ہو گیا ہوں۔“

یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا۔ نذیر نے اس سے کہا۔ ”بھئی میں مجبور تھا۔ کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔“

کریم نے کہا۔ ”نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی۔“

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لئے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد منی پیدا ہوئی، جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے۔ کئی پسنجر آتے تھے۔ ایک رات کے دو دو سو روپے دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“

وہ جواب دیتی۔ ”اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔“

شاردا نے نذیر سے ایک بار اس کا فوٹو مانگا تھا جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا۔ یہ وہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی۔ اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا ——— جب

دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔ نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی۔ لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا، وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی۔ نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہوگیا کیونکہ وہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہوگئی تھی۔ اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔ کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔ شاردا کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا، اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لا کر اسے دی۔ سارے خط وہی کھولا کرتی تھی ــــــ ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا۔ ”معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی۔“

نذیر نے خط لے کر دیکھا۔ اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گجراتی۔ الگ ٹرے میں رکھ دیا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا۔ ”ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔ تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔“

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا۔ ”ہندی ہے۔“ اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا۔ ”جے پور ــــ پریے نذیر صاحب۔“ اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی۔ ”آداب۔ آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔“ نعیمہ کا رنگ سرخ ہوگیا۔ اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا۔ ”کوئی شاردا ہے۔“

نذیر اٹھا۔ جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا۔ ”خدا معلوم کون ہے ــــ “میں باہر جا رہا ہوں۔ اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوا لاؤں گا۔“ اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبئی سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اس کو اتنے بڑے مصور سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنا دی۔ بیوی نے

شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا۔ ’’عرصہ ہوا ہے، میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا۔ مصوّری کا اسے بھی شوق تھا۔‘‘

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔ اس کو بھی نذیر نے اسی طریقے سے گول کیا اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے، صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اس نے اس طرح وصول کئے۔ اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن خط اس اظہار سے پُر ہوتے تھے۔ گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب کیا لکھے اس لئے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا، اور نذیر کہہ دیتا تھا۔ ’’ٹھیک ہے!‘‘

شاردا بمبئی آنے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوایا کہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے۔ ’’میں کچھ دیر وہاں رہوں گی۔ اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی ورنہ آپ بھی وہیں چلے آیئے گا۔‘‘

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا۔ مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لئے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں، اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آ رہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور

سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سٹپٹایا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک۔ اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ ”میں اپنے نوکر کو رازدار بنالوں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کردیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا۔“

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیئر میل آئی، مگر شاردا تلاش کے باوجود اسے نہ ملی۔ اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔

اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہالکشمی اترتا تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا۔ ”شاردا!“

شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”نذیر صاحب!“

”تم یہاں کہاں؟“

شاردا نے شکایتاً کہا۔ ”آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا۔ ”تم یہاں ٹھہرو، میں دفتر سے چھٹی لے کر ابھی آتا ہوں۔“

شاردا کو بینچ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر وہاں چپراسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی، لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا۔ ”تم نہالو، میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں۔“

شاردا نہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کردے۔ اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پیگ جو دو کے برابر تھا، گلاس میں انڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔

وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہا دھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گو تھی، اکثر خاموش رہتی تھی، مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا۔ ”یہ محبت کیا ہے ——— اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے۔ مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں۔ مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنا رہی ہے۔“

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر ناک بند کر کے وہ پیگ پی لیا۔ برا سا منہ بنایا۔ پانی لے کر کلی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا۔ دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔ ”تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو، آ گئے ہیں پھر وہی دن، بلکہ راتیں بھی۔ ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں، صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کچیلے دن۔ یہاں ہر چیز اجلی ہے۔ ہر چیز صاف ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں۔ کریم بھی نہیں۔ یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول فضول باتیں، گلے، شکوے، آہیں، راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک اور پیگ پیا اور سوچا۔ ”کون تارے گنتا ہے۔ گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو ——— بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ بستر صاف تھا۔ شاردا صاف تھی۔ وہ خود صاف تھا۔ کمرے کی فضا بھی صاف تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی، نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا شاید اس نے کم پی ہے۔ اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی دفعہ میں ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا۔ شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی ہجر و فراق کی باتیں۔ وہی گلے شکوے۔ نذیر اکتا گیا، اور اس اکتاہٹ نے اس

کے جسم کو کند کر دیا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہوگئی ہے۔ اس کے جسم کے جذبات کو اب وہ تیز نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ پھر بھی اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنی بیوی کے پاس۔ مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے اور اس کی بیوی لاہور میں، تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا، مگر وہ فضا نہیں تھی۔ وہ سودے بازی نہیں تھی۔ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی —— ہوٹل کی وہ غلاظت نہیں تھی یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں۔ وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا۔ اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس اس کے تحت الشعور میں تھا، اسی لئے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا اتنی دیر کے بعد ملی ہے، دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا، وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی جے پور میں تھی، ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لئے، اس کی پھنسیوں کے لئے، اس کے گلے کے لئے دوائیں منگوایا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ بھری چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے۔ اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا ماں بننا کتنا اچھا ہے —— اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔ کسی کو پالنا —— اپنے بچے ہی کو سہی، کتنی شاندار چیز ہے۔"

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔

اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا اب وہ شاردا نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا، وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی، لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو کچھ تھا، نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گزارنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لئے ایک سویٹر بُن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لئے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف تھرموس میں ڈالی ہوتی۔ صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی۔ پانی گرم کرا کے اس کو دیتی۔ وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کرتی۔ گھر کی صفائی کراتی۔ خود جھاڑو دیتی۔ نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے۔ مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے، اس لئے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔ مگر یہ نذیر کے لئے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی، اور وہ جاگتا رہتا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے ——— کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے، مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہوگا ——— محبت وغیرہ سب بکواس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات تھی، وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس بے پور جانا چاہئے۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار گناہ کئے تھے مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا۔ لیکن اب اس نے بڑی شدّت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے ——— اپنی سادہ لوح بیوی سے، جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہو گئی۔ وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی

ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔ پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت الجھن ہوئی۔ ”یہ عورت کیا پورا ایک مہینے یہاں رہی ہے؟ ——— میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں ——— اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو ایک خط لکھتا ہوں جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں ——— جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟

وہ اس کے متعلق سوچتا۔ مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی۔ ”میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی۔ جب اس نے تار بھیجا، لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔“

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ رُوکھا ہو گیا۔ اس رُوکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی۔ اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو اس کے اس رویے سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا اس لئے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا۔ ”بکواس نہ کرو، میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔

دفتر کے پاس کی دوکان سے اس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے مگر

ادھار مل گئے تھے، اس لئے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا کہ شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا۔ ''یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟''

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا: ''اندر الماری میں پڑا تھا۔''

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا۔ ''اندر الماری میں پڑا تھا۔'' نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا۔ ''شاردا! تم بکواس کرتی ہو۔ تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لئے ہر روز سگریٹ خریدا کرو''۔ شاردا نے بڑے پیار سے کہا۔ ''آپ بھول جاتے ہیں، اسی لئے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔''

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا۔ ''میرا دماغ خراب ہے ——— لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں''۔

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا۔ ''میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔''

نذیر نے ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہئے، اس لئے کہ وہ، اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غدّاری کر رہا تھا، چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بکواس نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے، دے دوں گا۔''

شاردا نے کچھ نہ کہا۔ رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی، مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھیں۔ پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بینک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا۔ ''میں بینک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔''

بینک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا، بالکل نزدیک تھی۔ وہ دو سو روپے نکلوا کر

فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لے کر رخصت کر دے گا۔ مگر جب وہ گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ “کہاں؟”

نوکر نے بتایا۔ “جی مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا ——— اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں۔”

نذیر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگریٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا!

☆☆☆

ممی

مجموعہ: یزید **اشاعت: 1951** **معیار: ۴ ستارے**

نام اس کا مسز اسٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن اسٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی ☆۔

وہ پونہ میں کیسے آئی، کب سے وہاں تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پونہ کے ہر ذرّے سے وابستہ تھی۔ ہوسکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو، مگر پونہ میرے لئے وہی پونہ ہے، اور اس کے وہی ذرّے، اس کے تمام ذرّے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں ——— اور ممی کی عجیب وغریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پونہ ہی میں ہوئی......... میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر وسیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں، آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھئے گا کہ میں عنقریب کنچن چنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی چوٹی کو سر کرنے کے لئے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔

☆ ایک مرتب نے ماہ وسال کا حساب لگا کر منٹو کی تحریر کردہ ابتدائی سطور کو اس طرح درست کیا تھا ——— ”اس کا خاوند پچھلی سے پچھلی جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا۔ اس کی پنشن اسٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔“

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونہ گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں.........ٹھہریے میں حساب لگالوں.........آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا، اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لئے پونہ ہو آؤں۔ وہ بھی اس لئے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا، جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگہ لے چکے تھے۔ سست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لئے آیا تھا، اس لئے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔

ایک دو گردے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ اس نے کہا کہ۔ ”دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں، وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہوگا۔ جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔“ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا ——— دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا ایک تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا۔ ”اوئے منٹو کے گھوڑے!“

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا رد عمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔

"اوئے منٹو کے

گھوڑے!" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوا لیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا۔ "ممی! جسٹ اے منٹ۔" تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا۔ "تم —— تم یہاں کیسے آئے؟" پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا۔ "بھابی جان —— آپ نے کمال کر دیا —— اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

چڈے نے اونچے سروں میں کہا۔ "ایک کام سے جا رہا ہوں —— تم ایسا کرو، سیدھے"...... وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو، صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ —— کرایہ ورایہ مت لینا ان سے۔" ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نبٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا۔ "تم جاؤ۔ نوکر وہاں ہو گا —— باقی تم دیکھ لینا۔"

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا۔ "چلیے صاحب......"

میں نے پوچھا۔ "کہاں؟"

اس نے جواب دیا۔ "چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے۔"

"اوہ۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ پونہ ہی کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ تکدر دور

کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے، اس لئے دن رات اُڑے گی ________ میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا، وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا۔ ''چلو!''

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا؛ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا بنگلہ بنایا تھا، تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہوسکتا ہے جو فلموں کا ہیرو ہو، اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گنجے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے سوچا تھا کہ چڈہ آجائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش بر جان درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لاابالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا، جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی، دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا۔ ''رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے، معلوم نہیں کدھر گئے''۔

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا: ''کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں۔''

'تیل لینے جانا' بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا۔ ''نہیں صاحب .... میں .... تپاس کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔''

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا جیسے وہی اس کی جگہ تھی، اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔ ''دیٹ از دیٹ ——— تو تم آ گئے اولڈ بوائے ——— چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی .... آج شام کو ....'' میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ ''بھابی جان کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا''؟ پھر اور زور سے ہنسا۔ ''مولویوں کی ایسی تیسی! اٹھو منٹو، بھابی جان یہاں بیٹھتی ہیں، ہم ابھی آ جائیں گے!''

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی: چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کے چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کیے اور ہم پون گھنٹہ میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی، حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمگی اختیار کر گئی۔ ہر شئے گرد آلود تھی، اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا، جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوہیمی فضا کی تکمیل کے لئے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ

دے کر کہا۔ "چین کے شہزادے........ دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ ——— میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی، اور نصف درجن گلاس"۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں، دنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آجاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا ——— اس وقت چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے اسپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس رم کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا: "دیٹ از دیٹ ——— تو آفٹر آل تم ادھر آہی نکلے ———" لیکن ایک دم متفکر ہو گیا۔ "یار، بھابی کا کیا ہو........ وہ تو گھبرا جائے گی۔"

چڈہ بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "یہ احساسِ کمتری ہے۔ جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں، ساری تیاری کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں۔"

رم فوراً ہی آگئی، اور گلاس بھی۔ چڈے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے ان کی کوئی پروا نہ کی۔ اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا۔ "تمہارے پونہ آنے کی خوشی میں۔"

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیئے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا۔ "میں شور کرتا ہوں، ان کی نیند کھل جائے گی ——— پھر ایسا کریں گے........ ٹھہرو ——— پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی۔ "جمیکا کے شہزادے!"

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چڈے نے اس سے کہا۔ "دیکھو، ممی سے کہو ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے ——— ایک دم!"

نوکر چلا گیا۔ چڈّے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا۔ "میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈّے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرّت کا اظہار کیا۔ "می ازاے جیول............" پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔

اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا۔ "آؤ!"

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڈّے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا۔ "حاضر ہے بیگم صاحب!"

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا۔ لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا، اس لئے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی۔ اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!"

میں نے جواب نہ دیا مگر چڈّے نے جھک کر بڑے ایماندار طور پر کہا—— "جی ہاں، یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے، لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔"

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھِل کھلا کے ہنسا۔ "ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سؤر ہیں............ جن پر ہر حرام شئے حلال ہے —— چلئے اب ہم آپ کو مسجد تک چھوڑ آئیں!"

میری بیوی کو پھر چڈّے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈّے ہی سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہیئے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڈّہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا، اس لئے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پھاند جاتا تھا۔ مگر چڈّے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی ان ڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی۔ "کبابستان کے شہزادے

ایک عدد تانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔''

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جایا کرتے ہیں، جو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کنفیوشسانہ نصیحت کو پلّے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا تانگہ لے کر آ گیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی، چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا۔ ''خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی، بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''چلو منٹو، اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں۔''

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔ ''یہ تو ہو گیا ——— اب کیا پروگرام ہے؟'' پھر کھل کھلا کر ہنسا۔ ''ممی ——— گریٹ ممی!''

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا یہ ممی کس توتخ آمون کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا۔ مگر چڈہ اس کو کبیدہ کاٹیج کہتا تھا، اس لئے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے۔ حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر، کوئی اس کا نائب در نائب۔ ہر دوسرا

کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا۔ اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ پکچر ضرور دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ۔ جیتتے شاذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لئے موٹر گراج بھی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید، محض یکسانیت توڑنے کے لئے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں وہ کب آتا تھا اور کب جاتا تھا کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی، اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معزز حصہ چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹر تھے۔ مگر ہیرو نہیں تھے ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا ــــــــ چڈہ کہا کرتا تھا۔ "سعیدہ کاٹیج اسی خرذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے، ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا۔" خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لئے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا، مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لئے تھے، وہ بھی چڈے کے لئے کہ اس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائگی لازم ہو گئی تھی۔ ادبِ لطیف قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور

برعکس نام نہند نام زنگی با کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین، یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز، شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کالج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اس کو سودا سلف لا دیا، کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور کبھی اس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا، سب کے سب مسرور تھے، شاید اپنی کبیدگی پر۔ وہ اپنے حالات کی نامساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آرہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیئے اور کہا۔ ''چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجئے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔''

غریب نواز کے حیدرآبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا ——————

''یہ مسٹر ونٹو ہیں........ لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پئے ہیں۔ شام کو اسکاچ آجائے تو........ لیکن آپ جائیے۔''

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی۔ ''قزاقستان کے شہزادے!''

جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ پی گیا ہے کم بخت!''

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا۔ ''یار بھابی کو تم خوامخواہ یہاں لائے — خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔'' پھر اس نے خود ہی اپنے کو تسکین دی۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ —— بور نہیں ہوں گی وہاں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی۔'' اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ پسے ہوئے گُڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے، اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ ادھر سے کسی نے بآوازِ بلند چڈّہ کا نام پکارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹر ون کترے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے، حبشی ہے آریہ ہے یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کسی خدوخال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آجاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا مگر شیواجی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی۔ جو اس کے خیال کے مطابق ان سُروں کے لئے بہت ضروری تھی جن کا تعلق براہِ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلایا۔ ''منٹو —— منٹو سیٹھ!''

چڈّے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ ''سیٹھ کی ایسی تیسی...... چل، اندر آ''۔ وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی۔ ''میں سالا ادھر ممّی کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ تمہارا فرینڈ آئے لا...... میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے...... سالا معلوم نہ تھا اپنا منٹو ہے۔''

چڈّے نے ون کترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی۔ ''اب چپ کر سالے کے...... تو رم لے آیا...... بس ٹھیک ہے۔ ون کترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لئے پیگ تیار کیا۔ ''منٹو...... یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے...... میں ایک دم کڑکا...... سوچا کیا کروں۔''

چڈّے نے ایک اور دھپّا اس کے سر پر جمایا۔ ''بیٹھ بے جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔''

''سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا — تیرے باپ نے دیا مجھ کو۔'' ون کترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڈّے نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اس

ے پوچھا۔ ''تو یہ تو بتا کہ ممّی کیا بولی؟ —— پولی تھی؟ —— موذیل کب آئے گی؟ ارے ہاں.......... وہ پلیٹینم بلونڈ!''

ون کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڈے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا۔ ''منٹو — خدا کی قسم کیا چیز ہے —— سنا کرتے تھے کہ ایک شئے پلیٹینم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا —— بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار —— گریٹ —— خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ.......... ممّی زندہ باد!'' پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا۔ ''کن کترے کے بچے — نعرہ کیوں نہیں لگاتا —— ممّی زندہ باد!''

چڈے اور ون کترے دونوں نے مل کر ''ممّی زندہ باد'' کے کئی نعرے لگائے۔ اس کے بعد ون کترے نے چڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اس نے اسے خاموش کر دیا۔

''چھوڑو یار —— میں جذباتی ہو گیا ہوں —— اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں۔ جنہیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے —— مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے ——'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا —— ''منٹو۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں —— چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا —— معلوم نہیں پلیٹینم کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی —— کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے —— فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے۔ ون کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔'' اور اس میں تھوڑی سی تھری ایکس رم مکس کر دی جائے۔''

چڈے نے بھنّا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی '' —— بکواس نہ کر۔'' پھر اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''یار —— میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں —— ہاں —— وہ رنگ —— خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے۔ وہ تم نے دیکھا ہے —— وہ جو مچھلیوں کے پیٹ میں ہوتا ہے —— نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے —— پومفریٹ مچھلی —— اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟ —— نہیں نہیں —— سانپوں کے —— وہ ننھے ننھے کھپرے ——

ہاں کھپرے ـــــ بس ان کا رنگ .... کھپرے ـــــ یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا۔ اتنی خوبصورت چیز اور اتنا واہیات نام .... پنجابی میں ہم انہیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چنچناہٹ ہے .... وہی .... بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے .... لٹیں ننھی ننھی، سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں ....''

وہ ایک دم اٹھا۔ ''سنپولیوں کی ایسی تیسی، میں جذباتی ہو گیا ہوں۔''

ون کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا۔ ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

چڈے نے جواب دیا۔ ''سنٹی منٹل .... لیکن تو کیا سمجھے گا بالا جی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی

اولاد ....''

ون کترے نے اپنے لئے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے میں، انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹری کولیٹ ہوں .... سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا .... اس نے ....''

چڈے نے چڑ کر کہا۔ ''اس نے تجھے تان سین بنا دیا .... تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں .... بچپن ہی میں اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور دودھ پینے کے لئے تو میاں کی توڑی میں رویا کرتا تھا۔ اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں .... اور تو نے پہلی بات پٹ دیپک کی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ .... جگت استاد تھا۔ بیجو باورے کے بھی کان کاٹتا تھا۔ .... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے۔ اسی لئے تیرا نام کن کترے ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''منٹو .... یہ سالا جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے .... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا۔ اور اس نے اسے میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی۔ اے۔ کی ڈگری پھاڑ کر پھینک دوں۔''

ون کترے نے اس بوچھار کی مدافعت کرنا چاہی، مگر چڈے نے اس کو وہیں دبا دیا۔

''چپ رہ .... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی مینٹل ہو گیا ہوں .... ہاں، وہ رنگ ....

.... پومفریٹ مچھلی کے .... نہیں نہیں ———— سانپ کے ننھے ننھے کھپرے .... بس انہی کا رنگ .... ممیّ نے خدا معلوم اپنی بین پر کون سا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا!"

ون کترے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "پیٹی منگاؤ، میں بجاتا ہوں۔"

چڈہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ "بیٹھ بے میٹریکولیٹ کے چاکولیٹ ...." اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا۔ "منٹو، اگر یہ پلیٹینم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا ...." اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ون کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی۔ "منٹو ملگی ایک دم چانگلی ہے ...."

میں نہ کہا۔ "دیکھ لیں گے۔"

"آج ہی .... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ مہتا جی نے تمہاری وجہ سے وہ ایڈوانس دے دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی .... آج کی رات ...... آج کی رات ...." چڈے نے بڑے بھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا ——

"آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ"

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔

دونوں کے پاس اسکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انہوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے مگر بے تکلف نہیں، اس لئے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اُس پلیٹنم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پیگ پیے تھے۔ نشے کے معاملے میں ان سب کی سطح اب ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لئے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں

اس نئی لڑکی پر بہت بری طرح فریفتہ تھے جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام نی لس تھا۔ پونہ میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا، جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدرآباد میں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر بھی اس داؤ پر لگانے کے لئے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا ——— اپنا قبول صورت ہونا۔ ون کترے کا بزعم خود یہ خیال تھا کہ اس کی چپٹی سن کردہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا۔ لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھئے ممی کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹینم بلونڈ نی لس کو وہ عورت، جسے میں نے چڈے کے ساتھ تانگے میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

نی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا۔ ” جہنم میں جائے یہ لونڈیا ——— چلو یار .... بھابی وہاں کباب ہو رہی ہوگی — لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی مینٹل نہ ہو جاؤں .... خیر ——— تم مجھے سنبھال لینا۔“ اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی۔ ”ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے!“

ممیوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کھاد کے باہر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا۔ ”دو عدد تانگے لاؤ .... جو مصری رتھ معلوم ہوں۔“

تانگے آگئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے ——— میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس دور دراز جگہ پر بھی اس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا۔ چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیظ و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے، جو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تھا، بڑی پر لطف باتیں کیں اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا۔ ”کوئی گانا فلما رہے ہیں آپ؟“

ہریش نے جواب دیا۔ ”جی نہیں ………… وہ کل کا پروگرام ہے ………… میرا خیال ہے آپ کل چلئے گا۔“

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی، اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا۔ ”ہاں کل ٹھیک رہے گا —— آج تو انہیں سفر کی تھکن بھی ہے۔“

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پر لطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا۔ ”چلو یار —— تم چلو میرے ساتھ!“ اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”ان کو چھوڑو ………… سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔“

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا۔ ”ان سے اجازت لے لو۔“

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا۔ ”میں نے بمبئی سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلئے۔ پر انہوں نے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں —— اب یہ کہانی کیا سنائیں گے؟“

ہریش نے کہا۔ ”زبانی سنا دے گا۔“ پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔“

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا۔ ”تو بھئی ہم چلتے ہیں۔“ اور وہ تینوں اٹھ کر نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے —— پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا۔ ”راجہ ہریش چندر زندہ باد ………“

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹیج تھی۔ شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی، مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتا چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی، پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہو گا مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے، لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ

نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی تو میں نے سوچا کہ گردوپیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں، بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں — ان کی عمر جو تھی وہ وہیں کی وہیں رہی ہے........ لیکن جب میں نے اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گردوپیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ ومتین طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے اس سے میرا تعارف کرایا جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا۔ ”یہ ممی ہیں.............. دی گریٹ ممی ......“

ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔ اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا: ”تم نے چائے منگوائی تھی۔ حسبِ معمول نہایت افراتفری میں ——— معلوم نہیں انہیں پسند بھی آئی ہوگی یا نہیں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ مسٹر منٹو، میں بہت شرمندہ ہوں........ اصل میں سارا قصور تمہارے دوست چڈے کا ہے ——— جو میرا ناقابل اصلاح لڑکا ہے۔“

میں نے مناسب وموزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا۔ ”رات کا کھانا تیار ہے........ یہ میں نے اس لئے کہا کہ تم عین وقت کے میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے ......“

چڈے نے ممی کو گلے سے لگا لیا۔ ”یو آر اے جیول ممی.......... یہ کھانا اب ہم کھائیں گے۔“

ممی نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا؟........ نہیں ہرگز نہیں۔“

چڈے نے اسے بتایا۔ ”مسز منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں۔“

ممی چلائی۔ خدا تمہیں غارت کرے۔ یہ تم نے کیا کیا ———!“

چڈہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”آج پارٹی جو دی جانے والی تھی۔“

”وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔“ ممی نے اپنا سگریٹ سلگایا۔

چڈے کا دل ڈوب گیا۔ ”خدا اب تمہیں غارت کرے.......... اور یہ سب پلان ہم

نے صرف اس پارٹی کے لئے بنایا تھا۔" وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے کے ہر ذرّے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "لو سارے خواب ملیامیٹ ہو گئے............ پلیٹینیم بلونڈ .... اوندھے سانپ کے ننھے ننھے کھپروں جیسے رنگ والے بال.........." ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ "کینسل کی تھی ـــــ اپنے دل میں کینسل کی تھی نا ـــــــ لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں۔" اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور بآواز بلند پکارا۔ "ہرّے ـــــــ!"

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی! چنانچہ اس نے بڑی شفقت سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا۔ "تم فکر نہ کرو.......... میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔"

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چڈے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا۔ "جنرل ون کترے ـــــــ جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری توپیں لے آؤ۔"

ون کترے نے سلیوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اس کے چڈے کا نوکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا۔ "آؤ آؤ۔ میر کوہ قاف کے شہزادے.......... وہ ـــــ وہ سانپ کے کھپروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہیں ـــــــ تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔"

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے" والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چڈے کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انہوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسب عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں، غریب نواز، رنجیت کمار اور چڈہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چڈہ مطمئن ہے کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا، اس لئے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا، اس لئے

وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے .... شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ .... اس کا تصوّر ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا — ہر فضا، ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے .... اس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس میں کوئی سُر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے، ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابلِ فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھرّیوں کی توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے، غریب نواز اور رون کترے کے لیے موجود ہے .... اور خدا معلوم اور کس کس کے لئے ....

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا۔ ”یار، یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟“

”اس لئے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے .... تمہارے اور میرے جیسے اُلو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں، جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور .... اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے .... ہم، جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں اُلو کے پٹھے ہیں .... میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں .... بیساکھی کا میلہ تھا .... تمہارے امرتسر میں .... رام باغ کے اس بازار میں جہاں ٹکھیائیاں رہتی ہیں .... جاٹ گزر رہے تھے .... ایک صحت مند جوان نے .... خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے جس کی نئی جوتی اس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی، اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت واہیات رنگوں میں لپی پتی ایک سیاہ فام ٹکھیائی کی طرف دیکھا جس کی تیل میں چپڑی ہوئی ببریاں، اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں، اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹھوکا دے کر کہا .... ”اوئے لہناسیاں .... ویخ اوئے، اُپر ویخ .... اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای ....“ آخری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا، حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھل کھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا۔

''اس جاٹ کے لئے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ قاف کی پری تھی .... اور اس کے گاؤں کی حسین و جمیل مٹیاریں، بے ڈول بھینسیں .... ہم سب چغد ہیں .... درمیانے درجے کے .... اس لئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اوّل درجے کی نہیں .... تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی .... لیکن .... لیکن فی لس .... خاص الخاص درجے کی چیز ہے .... وہ سانپ کے کھپروں ....''

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا۔ ''کھپرے .... کھپرے .... تمہارا مستک پھر گیا ہے۔''

چڈے نے ماتھے پر سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیئے اور ون کترے سے کہا۔ ''لے اب سنا .... تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ .... میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے!''

ون کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بائی گاڈ .... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا .... میں ففتھین ایرز کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی۔''

چڈہ زور سے ہنسا۔ ''تمہیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے .... بھگوان اسے سورگ میں کسیریل کی چٹی دے کہ وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لئے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈ تا رہے۔''

ون کترے اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ''منٹو .... میں جھوٹ نہیں کہتا .... میری وائف ایک دم بیوٹی فل ہے .... ہماری فیملی میں ....''

''تمہاری فیملی کی ایسی تیسی .... فی لس کی بات کرو .... اس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا۔'' چڈے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے۔

''گن پاؤڈر پلاٹ کے بانیوں .... سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی ——— میدان چڈے کے ہاتھ رہے گا .... کیوں، ویلز کے شہزادے؟''

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔

غریب نواز اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کر باتیں تو کرتے رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنٰی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

ممیؔ چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط و الوان کی۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھیلما ....اور وہ ہیجڑا نما لڑکا ....اس کو چڈہ سسّی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈے کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹینم بلونڈ کی پتلی کمر میں حمائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیت کمار کا ردِّ عمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ نمائشی فتح مندانہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی بری کہ ون کترے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ناکت اور تاتھئی تھئی کی ون، ٹو، تھری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا، ادھر چڈہ باقی لڑکیوں کی جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے لمرک سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے ——— ممیؔ سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت کمار سگریٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا، اور غریب نواز ممیؔ سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے اپنے پلیٹینمی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چڈے نے بد دلی کا اظہار کیا تو ممیؔ نے فی لس کے لئے ہلکا سا شرب

تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا۔ "بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ۔"

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا اور اس نے اسی خوشی میں بیس پچیس اور لمرک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے—میں نے سوچا عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردِ عمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکشا پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل یک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لئے نجات مل جاتی ہے......

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش، جوان لڑکیوں میں گھلی ملی، چڈے کے ننگے لمرک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی ——— اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں......... میں نے سوچا آخر لوگ کیوں فرار کو بُرا سمجھتے ہیں .... وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اس کا ظاہر گو بدنما تھا لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا......

اس پر کوئی بناؤ سنگھار، کوئی غازہ، کوئی اُبٹنا نہیں تھا۔

پولی تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرا لی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بے کار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے ——— اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا؛ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یک مشت ملنے کی ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی، وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسبِ معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کئے جا رہا تھا۔ تھیلما، ون کترے سے تانڈو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے، مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا۔ اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کٹی دونوں پئے جا رہی

تھیں اور آپس میں کسی آدمی کی بات کر رہی تھیں۔ جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔ اور چڈّہ، فی لس کے سانپ کے کھپرے ایسے رنگ کے بالوں کو پگھلے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ فی لس کا ہیجڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی......... اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلّی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کئے سستاتی ہے مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا......... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غالب کہتا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ——— اس نجات کے لئے کون ملک الموت کا انتظار کرے......... کیوں آدمی چند لمحات کے لئے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لئے ممتا تھی ——— میں نے سوچا، شاید اس لئے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو......... اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی......... اس نے شفقت اور محبت کے لئے چند آدمی چن لئے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چڈہ ایک تگڑا پیگ فی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے نہیں، سب کے سامنے۔ مگر ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی۔ فی لس نشے میں تھی۔ ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کئے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے

تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ون کترے تھیلما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ سالا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈ ہی میں اس نے اس کی شادی بنادی تھی۔ اس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے .... اور غریب نواز، ڈولی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں —— تپائی کے اردگرد فی لس اور اس کا ہیجڑا نما ساتھی اور ممیؔ بیٹھے تھے۔ چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا —— ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا —— غریب نواز اور ڈولی اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں .... ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر تھیلما کی طرف جو اس کے پاس بیٹھی تھی، اور اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لئے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممیؔ میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ فی لس نے دونوں میں مصلحت کی مہین مہین کوشش کی مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آجائے مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممیؔ سے کہہ رہا تھا۔ ”تم دیوانی ہو گئی ہو .... بوڑھی دلالہ .... فی لس میری ہے —— پوچھ لو اس سے!“

ممی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ ”چڈہ مائی سن .... تم کیوں نہیں سمجھتے .... شی از ینگ —— شی از ویری ینگ!“

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس اور اس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا۔ اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ بمشکل پندرہ برس کی.......... اس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

چڈے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا —— ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی۔

"چڈہ.......... چھوڑ دو.......... فور گاڈز سیک.......... چھوڑ دو اسے۔"

جب چڈے نے فی لس کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا۔ "گٹ آؤٹ.......... گٹ آؤٹ!"

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا آیا۔

سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون، قمیض اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑی میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی جو گیراج سے باہر آرہی تھی۔ میں رک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "وہ لاجواب عورت ہے —— خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے.......... دعا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔"

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی —— معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا —— میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا —— ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس

کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونہ میں کافی تفریح ہو گئی تھی، اس لئے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ رسماً اس نے ہمیں روکنا چاہا، مگر سعیدہ کاٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لئے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے ——

ہم چل دیئے........ راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کو من و عن سنا دیا۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ فی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ یا وہ اسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی، جب ہی اس نے چڈے سے لڑائی کی........ میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا، جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا ”میں اس روز حیوان بن گیا تھا —— لعنت ہو مجھ پر!“

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونہ جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ گیراج سے باہر نکل کر شیریں کے خورد سال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کمار آ گیا کچھوے کی چال چلتا، اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڈہ اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا تھا۔ وہ اس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی........ رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونہ میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا، اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڈے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے........ بخار رہتا ہے، مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا —— سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا، اس کا رخ گیراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گیراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے خود کو تیار ہی

کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڈّے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے تانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بے ہوش ہو گیا .... میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ تانگے والے نے بیہوش چڈّے کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہو گا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہئے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ ”ابھی آتا ہوں“ کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈّے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا میرے بیٹے کو؟“

ون کترے نے جب اسے بتایا کہ چڈّہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصّے کے ساتھ کہا۔ ”تم کیسے لوگ ہو ــــــ مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔“ پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈّے کی پاؤں سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈّے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گیراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے۔ جیسے چڈّے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈّے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈّے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے ــــــ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گیراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، ون کترے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا۔ ''ممی یو آر گریٹ!''

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''میرے بیٹے .... میرے غریب بیٹے!''

چڈے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''نہیں ——— تمہارا بیٹا اوّل درجے کا اسکاؤنڈرل ہے .... جاؤ اپنے مرحوم شوہر کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو!''

ممی نے چڈے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا۔ ''فضول بکواس نہ کرو!'' پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لڑکو ___ چڈہ بیمار ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے ——— سمجھے؟''

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کونسی آفت آ گئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا، مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا ——— ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے۔ یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیوٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی، اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور

اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ دن بعد لوٹا تو میری بیوی

نے چڈے کا ایک خط دیا جس میں صرف یہ لکھا تھا۔ ''عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔''

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا۔ ''ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں۔''

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناوالا بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونہ پہنچا، اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب جب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھی۔ ایل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے کیونکہ انہیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لئے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائریکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لوناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سین کے کمرے میں چونکہ جگہ

خالی تھی اس لئے اس نے وہیں اپنا ڈیرا جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یک مشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا۔ ”میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ ——— ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے میرا تو خیال ہے، یہی بہتر ہے۔“

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا، اس لئے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیضیں اور شلواریں لٹک رہی تھی جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونہ میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا مسٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ ”کچھ پروا نہ کرو اس سالے کی .... جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے ——— بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔“

ہریش ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب ولہجہ میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسبِ معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما، تھیلما وغیرہ سب آتی تھیں۔ ون کترے بدستور تھیلما کو کتھاکلی اور تانڈو ناچ کی تاتھئی، اور دھانی تاکت کی ون ٹو تھری بنا بنا کر بتاتا تھا اور وہ اسے سیکھنے کی پرخلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسبِ توفیق قرض دے رہا تھا، اور رنجیت کمار جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا ——— چڈے کے ننگے ننگے لمرک سن کر اسی طرح قہقہے برپا

ہوتے تھے............ایک صرف وہ نہیں تھی............وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لئے صحیح تشبیہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا۔ ''چڈہ یو آر اے ڈیمڈ بروٹ!''

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرا دیتی تھی، جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے۔ ''ڈونٹ ٹاک روٹ۔''

ون کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آ کر جب وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا، اور اپنا میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

ممی وہی ممی تھی ———— پولی کی ممی ڈولی کی ممی، رنجیت کمار کی ممی

سوڈے کی بوتلوں، گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے ساز و سامان کے انتظام میں وہ اسی پرشفقت انہماک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈر کر سمٹ کر، وہ دوڑ گئے تھے...... چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا...... ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھی۔

ون کترے کی خوبصورت بیوی کا جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے، تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی

روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنادی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کٹی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔

اس نے کٹی سے کہا تھا۔ ”تم اس وقت اسے دے دو ـــــــ بعد میں لیتی رہنا“۔ اور مجھ سے اس نے پندرہ روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچّے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچّہ کیوں نہیں ہوا۔

وہ رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی۔ ”ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو“۔ چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ۔ ”مجھے یہ آدمی اوپرا اوپرا سا معلوم ہوتا ہے ـــــ فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں“۔ یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی لئے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کڈھب، بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونہ ٹیلی فون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتے کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے، خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و حواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آگئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے

ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا، مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔

سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا۔ ”بھاپا جی ——— مر گیا؟“

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا۔

”مجھے چھوڑ دیجئے میں بھاگوں گا نہیں۔“

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا۔ ”بیٹا گھبراؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے، سچ سچ بتا دو“ ——— اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیئے تھے کہ سین نے اس کو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا، اور سین بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آ کر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں، جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے، مگر ایک بڑی نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی، بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات

بیان کیے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا۔ ”اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے ——— اور اس کا سہرہ میری بڈھی ممی کے سر ہے۔“

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل برادرز، شکیل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لئے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمائے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انہوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لئے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انہوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا۔ ”اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے۔“

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر خلاف معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کئی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیئے۔ اور رنجیت کمار سے اس نے کہا۔ ”تم ان بیچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسے نہ دیا کرو............ ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو، مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی............ کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!“

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لئے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا ——— شیریں نے سفر کے لئے اس کا کھانا پکا دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں، جب مجھے ایک ضروری کام سے پونہ جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزارہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پُر کر لیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا شیریں کے

گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لئے کہیں سے دو پیدا کئے تھے، ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لئے لے آیا تھا۔ چڈے نے آخری دولنڈ واس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا۔ ''تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے —— بڑا کمال کیا ہے تو نے ...... اب اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔''

ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا۔ ''سالے میں اب کوئی پے لا ہوں...... وہ تو دارو بولا کرتی ہے...... ویسے بائی گاڈ...... میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے......''

چڈے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لئے لکھ رہا تھا۔

کہانی کی باتوں سے اکتا جانے کے بعد کچھ دیر تک شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولودِ مسعود ہے، اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا، لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

چڈے نیون کترے کی بات پر بے تحاشہ قہقہہ لگایا تھا مگر میں نے سعیدہ کاٹیج پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ ہے، جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قتل کی ٹریجڈی؟ ...... معلوم نہیں کیا وجہ تھی ...... لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے بولتے تھے، مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ ون کترے بھی غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم

نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو۔ اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں، اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے؟''

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی ——— ''ہاں.......... دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے۔''

''کہاں ہے یہ ہزار؟'' یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

''میری جیب میں!''

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا۔ ''آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا ——— ایک پارٹی ہے۔''

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت ہی کرنے والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی، بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا ——— میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا، کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گراج کے باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے اور نل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ،

رنجیت کمار گئی اور ریلما کے ساتھ اور رون کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ، ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کود رہا تھا ـــــــ سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور نیم بدیسی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی ـــــــ ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا۔ "کِس می ڈیئر!"

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ ایک دم پکارا "بند کرو ـــــــ اب شراب کا دور چلے گا"۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی۔ "اسکاٹ لینڈ کے شہزادے ـــــــ وسکی کی نئی بوتل لاؤ"۔

اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دُھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا۔ "ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی ـــــ جانے دو یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط سی تقریر شروع کی۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین.......... آپ سب جہنم میں جائیں.......... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ـــــــ وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے.......... مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے.......... کنویں میں اترنے والے.......... کنویں میں اترنے والے" .... اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"افسوس کہ یہاں کوئی ہندوستوڑا نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے۔ اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی ہو تو کہے گا پرسوں آپ سے ملا تھا ـــــــ لعنت ہو اس کے نظام حیدر آباد پر، جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑ ہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں.......... ہاں.......... وہ کنویں میں اترنے والے.......... میں نے کیا کہا تھا، کہ سب بکواس ہے.......... پنجابی میں جنہیں ٹوبے کہتے ہیں.......... وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں.......... اس لئے میں کہتا ہوں.........."

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا۔ ”یہ سب سازش ہے ـــــــ اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہر ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا.......... تم سب مردہ باد.......... لیکن پہلے میں.......... میں..........“

وہ جذباتی ہو گیا۔ ”میں.......... جس نے اس رات اس.......... سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لئے اپنی ممی کو ناراض کر دیا.......... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوآن سمجھتا تھا.......... لیکن نہیں.......... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم! ایک ہی بوسے میں اس پلیٹینیم بلونڈ کے کنوارپنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا.......... لیکن یہ ایک.......... یہ ایک نامناسب حرکت تھی...... وہ کم عمر تھی.......... اتنی کم عمر، اتنی کمزور، اتنی کیریکٹرلس.......... اتنی..........“

اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”بتاؤ یار اسے اُردو فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے.......... کیریکٹرلس.......... لیڈیز اینڈ جنٹلمین.......... وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی یا اسے قطعاً بھول جاتی.......... ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا.......... مجھے اس کا دکھ ہوتا ـــــــ اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا.......... میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا.......... میں ایک پیگ اور پیتا ہوں“۔

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جُھرّیاں بھی، ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے کوئی چیز کھونے کے لئے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے ـــــــ میں نے اس سے ایک بار پوچھا۔ ”کیا بات ہے چڈے؟“

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ ”کچھ نہیں.......... بات یہ ہے کہ آج وکی

میرے دماغ کے جوڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی"۔

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

ون کترے نے تھیلما کو ایک طرف سرکنے کے لئے کہا اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چُن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین کی بات نکلی تو اس نے کہا ——

"مسٹر منٹو —— وہ ایک دم بلکٹ آدمی تھا —— کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں .... جھوٹ بالکل جھوٹ .... وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا ....."

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جڑ بگ بند کیا۔ کتّی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر ون کترے کے کدو ایسے سر پر دھپا مار کر بولا۔ "بکواس بند کر بے .... اور کچھ گا .... لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا۔"

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی۔ مرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گاتا تھا، پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے، جن سے فضا بہت اداس ہو گئی۔ ممّی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے .... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا۔ "حیدرآباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے .... موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے۔"

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور ایلما کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توے پر ریکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممّی کو پھر گود میں اٹھا لیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا، ان میراثیوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سُروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتے ہیں۔

اس اچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے

چڈے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بس، اب ختم!''

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا۔

''چلو منٹو چلیں!''

میں نے اٹھ کر ممّی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ـــــ ''آج کوئی الوداع نہیں کہے گا۔''

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈے سے کہا۔ ''ٹھہرو دیکھیں کیا بات ہے'' مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا۔ ''اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے۔''

ممّی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس سے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ ''مجھے سخت نیند آرہی ہے۔'' اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ غریب نواز گراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا۔ ''ممّی چلی گئی!''

''کہاں؟''

''معلوم نہیں''۔ یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔

چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممّی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ''چلی گئی ـــــ صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑنا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''مگر کیوں؟''

چڈے کے لہجے میں تلخی آگئی۔ ''حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں ـــــ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں، اس لئے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی۔ .... وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے .... ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔

آخر حکومت، پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہوگئی اور اس کو تڑی پار کر دیا ...... شہر بدر کر دیا ...... وہ اگر قحبہ تھی۔ دلاّلہ تھی ـــــ اس کا وجود سوسائٹی کے لئے مہلک تھا، تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا ـــــ پونہ کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ، اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو؟''

چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے افسوس ہے منٹو، کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھوڈالا ـــــ لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہئے ـــــ وہ پونہ سے چلی گئی ہے ...... مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی ...... میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں ـــــ زندہ باد ممی ...... زندہ باد! ـــــ چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہوگی۔ ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ـــــ وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔''

میں نے دیکھا چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں!

☆☆☆

موذیل

مجموعہ: سڑک کے کنارے   اشاعت: ۱۹۵۳   معیار: ۵ ستارے

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رہا۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اُٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رُواں رُواں، تروتازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اُوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا، کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان .... محلّے میں تھا، جو کٹر مسلمانوں کا مرکز

تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ـــــ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ، مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ـــــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی، باپ مفلوج۔ بھائی تھا وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ ''نرنجن یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزار کر لیا کرتا ہے۔'' مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ ''یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبئی ہے بمبئی۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس سے۔''

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے، اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے۔ یا وہ کہانیوں کا کوئی قلعہ ہے۔ جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ محلّہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں!

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کیلئے اچھا تھا۔ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک

روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب بھی کرپال کور سے اس کی بات ہوئی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگھر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے، جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اسکے نقش پتلے پتلے تھے جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ـــــــ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ ـــــــ پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی، جو بڑی نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو ”گوڈے گوڈے“ عشق ہو گیا تھا ـــــــ

ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر میں دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون، اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی، جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ——— جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رُک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں ——— جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ ”یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے“۔ اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوریڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے

عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خودسر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُڑکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت اکھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں ''گوڈے گوڈے'' دھنس جائے گا۔ اور وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موزیل کے لئے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سردرد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا، جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی۔ ''تم سکھ ہو۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔''

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا۔ ''کون سی نازک باتیں۔ تمہارے پرانے یاروں کی؟''

موزیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی ٹنگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی۔ ''یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ——— ہاں وہ میرے یار ہیں۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو''۔

ترلوچن بڑے دلیلانہ انداز میں پوچھتا ہے۔ "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔ "تم سچ مچ سکھ ہو ـــــ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ـــــ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کس سکھنی سے شادی کر لو ـــــ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"

ترلوچن نرم ہو جاتا ـــــ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرستان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیا کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔ "موذیل ـــــ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔ "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ـــــ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"۔

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ـــــ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ـــــ تم خوبصورت ہو"۔

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں ـــــ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیے۔

موذیل نے ایک دم ''پھُوں پھُوں'' کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی ـــــ ''میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ـــــ تم تکلیف نہ کرو''۔

ترلوچن چلایا۔ ''موذیل''۔

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔ جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں۔ ''غدا کی قسم ـــــ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کر ـــــ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میری نیوی بلو اسکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہو ـــ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی''۔

ترلوچن غصّے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ـــــ اس میں جو پنیں لگی تھیں، وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کے کھُلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ یہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔ ''تمہارے بال بہت ملائم ہیں ـــ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میری نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ـــــ ترلوچن ـــــ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی''۔

اب تو ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے

مخاطب ہوا۔ ’’میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔ تم کیوں اڑاتی ہو —— دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں —— میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟‘‘

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ ’’مجھے معلوم ہے‘‘۔

’’پھر‘‘۔ ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ ’’تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ----- میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں‘‘۔

’’مجھے معلوم ہے‘‘۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ ’’میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی‘‘۔

ترلوچن اچھل پڑا۔ ’’سچ‘‘؟

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لئے چمکے۔ ’’ہاں!‘‘

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ تو......تو کب؟‘‘

موذیل الگ ہٹ گئی۔ ’’جب —— تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!‘‘

ترلوچن اس وقت ’’جو ہو سو ہو‘‘ بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔ ’’میں کل ہی کٹوا دوں گا‘‘۔

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ تم بکواس کرتے ہو ترلوچ —— تم میں اتنی ہمت نہیں ہے‘‘۔

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ ’’تم دیکھ لوگی‘‘۔

’’دیکھ لوں گی‘‘۔ اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور ’’پھُوں پھُوں‘‘ کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا کیا سوچا---- وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے،

اس لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹنکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر ”مائی ڈارلنگ ترلوچ“ کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی اسکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے اسکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔ ”نیچے کچھ پہن تو لیا کرو“۔

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ ”مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ایسے ہی چلتا ہے“

ترلوچن کو پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ ”شادی کل ہو گی!“

”ضرور“۔ موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونہ میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کاروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ ترلوچن وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟ ــــــــ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ــــــــ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو یک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی۔ اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے؟ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب وگل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا

تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی۔ "تم سکھ ہو ــــــ مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتّی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس۔ لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا۔ مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی۔ "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ــــــ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا ــــــ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ــــــ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ــــــ تم سکھ ہو ــــــ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ــــــ شرم آنی چاہئے تمہیں! اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آتا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں۔ اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رُک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کرپال کور ــــــ ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلّے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلّے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا، وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ـــــ آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹنکی کے پاس موذیل کو دیکھا جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ـــــ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا۔ ”یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟“۔

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ـــــ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ـــــ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی ننھی داڑھی دیکھنے لگی۔ ”تم پھر سکھ بن گئے ترلوچ؟“

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ ”اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلو اسکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے“۔

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔ ”بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟“

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ صرف وہ پہلے سے

کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔ ’’بیمار رہی ہو؟‘‘

’’نہیں‘‘۔ موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

’’کمزور دکھائی دیتی ہو؟‘‘

’’میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں‘‘۔ موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ ’’تم گویا ـــــــ اب پھر ـــــــ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو‘‘۔

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ ’’ہاں!‘‘

’’مبارک ہو۔‘‘ موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔ ’’کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟‘‘

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ’’ہاں!‘‘

’’مبارک ہو۔ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟‘‘

’’نہیں‘‘۔

’’یہ بہت بری بات ہے‘‘۔ موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔

’’ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے‘‘۔

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔ ’’کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟‘‘

’’نہیں‘‘

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے ’’نہیں‘‘ کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ ’’تم اب یہ داڑھی منڈوا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو میں تم سے شادی کر لوں گی‘‘۔

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف باعصمت، اور پاک طینت

کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بے وفا ہے۔ بے مرّوت ہے۔ مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا۔ ”موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ـــــ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے“۔

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ ”وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟“

”اس کو ابھی تک معلوم نہیں ـــــ داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی۔ محض انتقامی طور پر ـــــ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے“۔ ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجانی شروع کی۔ ”یہ بہت اچھا ہے ـــــ مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ـــــ دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے“۔

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا، انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں“۔ یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکّر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔ ”ترلوچ۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ ”تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو۔ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟“

”مشکل! ـــــ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ـــــ کسی

بھی معاملے کی نزاکت —— تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو —— یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ "افسوس بی ڈیمڈ سلی ایڈی —— تم یہ سوچو کہ تمہاری اس کو —— کیا نام اس کا —— اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے —— تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو۔ اور بہت ڈرپوک —— مجھے نڈر مرد چاہئے —— لیکن چھوڑو ان باتوں کو —— چلو آؤ تمہاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔ "کہاں سے؟"

"وہیں سے جہاں وہ ہے۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔ چلو آؤ میرے ساتھ"۔

"مگر سنو تو —— کرفیو ہے"۔

"موذیل کے لئے نہیں —— چلو آؤ"۔

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا۔ "یہ تمہاری داڑھی۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ سکھ ہو"۔

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"۔

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔ "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"۔

"کیوں ٹھیک نہیں"۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا —— وہ یہی سمجھتی

ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا"۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو۔ گدھے کہیں کے ــــــ اس کی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو؟"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی"۔

موذیل چڑ گئی۔ "اوہ تمہاری محبت بی ڈیمڈ ــــــ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔ اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے"۔

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں"۔

بہت اچھا کرتے ہو۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلّے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیے جاؤ گے"۔

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ "مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے۔ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ــــــ تمہاری وہ ــــ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ــــــ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان نہ رہے گا ــــــ تم سکھ ہو ــــ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچ بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ "ڈارلنگ، چلو، جیسے تمہاری مرضی ــــــ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی؟"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ”نہیں ـــــ چلے گا اسی طرح“۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگریٹ پی رہی تھی، بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔ ”تم بہت ذلیل ہو“۔

موذیل مسکرائی۔ ”یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس سے پہلے تم سے کئی اور مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔“ پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ ”یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔“

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے ـــــ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیماری معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا بھی کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے!

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ ''اے ـــــــ کدھر جا رہا ہے''

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ ''اوہ، تم ــــ ہم کو پہچانا نہیں تم نے ـــــــ موذیل....'' پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اِدھر اِس باجو.... ہماری بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے...''

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا۔ ''لو پیو''۔

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگریٹ نکالا اور اس سے کہا۔

''ہیراز لائٹ!''

سپاہی نے سگریٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی جس میں سے گزر کر انہیں محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطرہ سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے ڈر ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔

موذیل رُک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا۔ ترلوچ ڈیئر۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ـــــ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ سچ کہتی ہوں یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے''۔

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور

رہتی تھی، تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رُک گئی۔ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ“۔

دونوں چلنے لگے ـــــ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے ـــــ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔ ”اے کیا کرتا ہے۔ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے“۔ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ”کریم۔ اٹھاؤ۔ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر“۔

اس آدمی نے نیفے سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔ ”عیش کر سالی عیش کر“۔ پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔ ”کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے!“

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”کوئی ذلیل حرکت نہیں ـــــ سب چلتا ہے آؤ“۔

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ـــــ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے، جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا۔ ”کس گلی میں جانا ہے؟“

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ”تیسری گلی میں ـــــ نکڑ والی بلڈنگ!“

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے

دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ''ترلوچ ڈیئر۔ یہ پگڑی اتار دو!''

ترلوچن نے جواب دیا۔ ''میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اُتار سکتا!''

موذیل جھنجلا گئی۔ ''تمہاری مرضی۔ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے؟''

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ـــــ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی۔ اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔ ''دیکھو ایسا کرو ـــــ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ـــــ تم میرے پیچھے آنا ـــــ بڑی تیزی سے جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو سمجھے ـــ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو''۔

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ـــــ سٹیرھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔ ''کونسا مالا؟''

ترلوچن نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''دوسرا''۔

''چلو''

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہولیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دُور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پہ دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی ''مہنگا سنگھ جی ـــ مہنگا سنگھ جی!''

اندر سے مہین آواز آئی۔ ''کون!''

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا — جو بے حد سہی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھ — پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگالیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سُرخ ہوگیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "ڈرو نہیں! ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے"۔

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف سہی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہوگئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں — اور اپنی ماتا جی سے بھی — لیکن جلدی کرو"۔

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں، جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ "اسے پکڑ لیا انہوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا۔ "کسے!"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ "پکڑ لیا تو اچھا ہوا — تم یہ کپڑے اُتارو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آنافانا اس کی قمیض اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہوگئی۔

ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اُتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اُتار کر ترلوچن سے کہنے لگی۔ "جاؤ، اسے لے جاؤ — لیکن ٹھہرو"۔

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دئے اور اس سے کہا۔ "جاؤ — جلدی نکل جاؤ"۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ ’’آؤ‘‘۔ مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

’’تم جاتے کیوں نہیں ہو؟‘‘ موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ’’اس کے ماں باپ بھی تو ہیں‘‘۔

’’جہنم میں جائیں وہ ـــــ تم اسے لے جاؤ‘‘۔

’’اور تم؟‘‘

’’میں آجاؤں گی‘‘۔

ایک دم اُوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اُترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا، جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا ـــــ

’’سُنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں ـــــ‘‘

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ ’’دروازہ‘‘۔

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔ ’’میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔ تم میرے پیچھے بھاگنا ـــــ میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے ـــــ‘‘

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ ’’پھر؟‘‘۔

موذیل نے کہا۔ ’’یہ تمہاری ـــــ کیا نام ہے اس کا ـــــ موقعہ پاکر نکل جائے ـــــ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا‘‘۔

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔ وہ لوگ جو

دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ـــــ اُوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ اُلجھتی وہ نیچے آ رہی ـــــ پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اُترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد جمع ہوگئے ـــــ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جابجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔ ''موذیل ـــــ موذیل''!

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اُتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ ـــــ میرا انڈرویئر وہاں ہے کہ نہیں ـــــ میرا مطلب ہے وہ ـــــ ـــــ''

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔ ''تم سچ مچ سکھ ہو ـــــ جاؤ دیکھ کر آؤ''۔

ترلوچن اُٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ میاں بھائی ہے ـــــ لیکن بہت دادا قسم کا ـــــ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں''۔

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ ''او ڈیم اِٹ ـــــ'' یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اَٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ''آل رائٹ ڈارلنگ ـــــ بائی بائی''۔

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔ ''لے جاؤ اس کو ـــــ اپنے اس مذہب کو''۔ اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

☆☆☆

ٹھنڈا گوشت

مجموعہ: ٹھنڈا گوشت **اولین اشاعت: ۱۹۴۹** **معیار: ۴ ستارے**

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اُٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پُراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لئے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولھے تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اُٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سُرمئی غبار۔ ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے مگر اس کے قدوقامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لئے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔ ’’ایشر سیاں......‘‘

ایشر سنگھ نے گردن اُٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی۔ ''ایشر سیاں...... '' لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اُٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ''کہاں رہے تم اتنے دن؟''

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''مجھے معلوم نہیں''۔

کلونت کور بھنا گئی۔ ''یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے!''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جواب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ''کلونت!''

اس کی آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔ ''ہاں جانی۔'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپہ مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے......''

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ''ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟''

''برے کی ماں کے گھر......'' ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے اُبھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔ ''قسم واہگورو کی، بڑی جاندار عورت ہو۔''

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا۔ ''تمہیں میری قسم، بتاؤ، کہاں رہے...... ؟ شہر گئے تھے؟''

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جُوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔ ’’نہیں۔‘‘

کلونت کور چڑ گئی۔ ’’نہیں تم ضرور شہر گئے تھے...... اور تم نے بہت سارا روپیہ لُوٹا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔‘‘

’’وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے......‘‘

کلونت کور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی لیکن فوراً ہی بھڑک اُٹھی۔ ’’لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا......؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لُوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپّیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اُٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے......‘‘

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا۔ ’’دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا...... ایشر سیّاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے!‘‘

’’تیری جان کی قسم، کچھ بھی نہیں۔‘‘

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’ایشر سیّاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟‘‘

ایشر سنگھ ایک دم اُٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اُس پر حملہ کیا ہو۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ ’’جانی، میں وہی ہوں...... گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی......‘‘

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔ ’’تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟‘‘

’’برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔‘‘

’’بتاؤ گے نہیں؟‘‘

’’کوئی بات ہو تو بتاؤں۔‘‘

’’مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔‘‘

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ

دیے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی ـــــ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اُتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''آؤ جانی!، ایک بازی تاش کی ہو جائے!''

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا۔ ''چل دفان ہو......''

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولھے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ''نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے......''

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اُتار کے پھینک دیا اور کہا۔ ''لو، پھر ہو جائے ترپ چال......''

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اُتارتے ہیں، اُسی طرح اس کو اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اُس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ ''کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو......''

کلونت کور اپنے بازو پر اُبھرتے ہوئے لال دھبّے کو دیکھنے لگی' ''بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟''

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔ ''ہونے دے آج ظلم۔'' اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے ـــــ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا، کان کی لوؤں کو کاٹا، اُبھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لئے، چوس چوس کر اُس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا ـــــ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گُر اور جتنے داؤ اُسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا۔

"ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتّا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا۔ لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اُتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اُتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھُلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایشر سیاں وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تُو اتنے دن رہ کر آیا ہے، اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟"

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصّے سے اُبلنے لگی۔ "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ چڈو...... کون ہے وہ الفتی...... کون ہے وہ چور پتّا؟"

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا "کوئی بھی نہیں کلونت! کوئی بھی نہیں......"

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی...... کھا واہگورو جی کی قسم......

کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں...... تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا ...... لے اب کھا واہگورو جی کی قسم...... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں......؟"

ایشر سنگھ نے بڑے دُکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اُٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلّی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی:

”جانے دے اب کلونت، جانے دے......!“

اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اُڑ اُڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گِلے کی مِلی جُلی نگاہوں سے دیکھا ”میری جان! تم نے بہت جلدی کی......لیکن جو ہوا، ٹھیک ہے......“

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔ ”مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟“

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

”اور میں......اور میں......بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں......اسی کرپان سے......“

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔ ”میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟“

ایشر سنگھ کی آنکھیں دُھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔ ”گالی نہ دے اُس بھڑوی کو......“

کلونت چلاّئی۔ ”میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟“

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رُندھ گئی۔ ”بتاتا ہوں......“

یہ کہہ کر اُس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مُسکرایا۔ ”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے......“

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔ ”ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر......“

ایشر سنگھ کی مُسکراہٹ اس کی بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔ ”مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں...... گلا چرا ہے ماں یا میرا...... اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا......“

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ ”کلونت میری جان! میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا......؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔ شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں۔ نے بھی اس میں حصہ لیا...... گہنے پاتے اور روپے

پیسے جو بھی ہاتھ لگے، وہ میں نے تمہیں دے دیے...... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی......"

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا۔ "جس مکان پر...... میں نے دھاوا بولا تھا...... اس میں سات...... اس میں سات...... آدمی تھے...... چھ میں نے...... قتل کر دیے...... اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے...... چھوڑ اسے...... سُن...... ایک لڑکی تھی، بہت ہی سُندر...... اس کو اُٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔"

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اُڑایا۔ "کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سُندر تھی...... میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا، نہیں ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ......"

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا۔ "ہوں......!"

"...... اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا...... راستے میں...... کیا کہہ رہا تھا میں......؟ ہاں راستے میں...... نہر کی پٹڑی کے پاس تھوہر کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا...... پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں......" یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ "میں نے...... میں نے پتا پھینکا...... لیکن لیکن......" اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا۔ "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ "وہ...... وہ مری ہوئی تھی...... لاش تھی...... بالکل ٹھنڈا گوشت...... جانی، مجھے اپنا ہاتھ دے......"

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

☆☆☆

ننگی آوازیں

مجموعہ: خالی بوتلیں خالی ڈبے   اشاعت: 1950   معیار: ۵ ستارے

بھولو اور گاما دو بھائی تھے ——— بے حد محنتی۔ بھولو قلعی گر تھا، صبح دھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں ''بھانڈے قلعی کرا لو'' کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا۔ اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی بچا لیتا تھا۔ مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیئے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولو نے گاما کو، جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ، دیکھو یہ شراب کی لت بہت بری ہے۔ شادی شدہ ہو، بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ یہی جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر رکھو تو بھابھی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ ننگی بُچی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنے گھر والی؟ گاما نے اس کان سنا، اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے۔ ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا، وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر کو جو کہ دوسری منزل پر تھا، اپنی رہائش کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئیں۔ گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا۔ بیوی تھی، اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں

تھا۔ ایک گاما ہی کو یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلّن کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے اردگرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلّن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند دنوں ہی میں بانس وغیرہ گاڑ کر ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا ——— یوں ہوا تو رُک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے ہر حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا تھا نا بھائی، میں اپنے نروئے پنڈے پر جونکیں نہیں لگوانا چاہتا۔ لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن میں ہی اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ ”میری شادی کر دو ——— نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

گاما نے جب یہ سنا تو اس نے کہا۔ ”یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں؟“

بھولو بہت سنجیدہ ہو گیا۔ ”تمہیں نہیں معلوم ——— پندرہ راتیں ہو گئیں مجھے جاگتے ہوئے۔“

گاما نے پوچھا ”کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں یار ——— دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے — عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی خاک!“

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا۔ ”وہ جو کلّن ہے، اس نے تو حد ہی کر دی ہے ——— سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی ——— بچے پڑے رو رہے ہیں مگر وہ ....“

گاما حسبِ معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل نیند نہیں آتی۔ اس کا

باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے۔ جب یہ لوگ بھولو سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا۔ ''ہاں بھائی، کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے؟'' کوئی کہتا۔ ''میاں مفت میں مزے لیتے ہو —— ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو —— سو فیصدی گاتی بولتی۔''

بعضوں نے گندے گندے مذاق کئے۔ بھولو چڑ گیا۔

ایک دن جب گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا۔ ''تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا ہے —— دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے —— تم میری شادی کا بندوبست کر دو، ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا —— بھابھی کے پاس میرا پانچ سو روپیہ جمع ہے —— جلدی کر دو بندوبست!''

گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا، پھر کہا۔ ''اچھا ہو جائے گا بندوبست۔ تمہاری بھابھی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔''

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ، گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔

خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھا۔ تندرست تھا۔ جون کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا۔ مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دلہن کے لئے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش پر گاڑے —— ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کئے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر آ کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا۔ وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا۔ مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔

پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تر بتر ہو گیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں۔ اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا؟ ——— کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اس کی مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہتی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے۔ پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے ——— لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں؟ ——— ایک کوٹھا ہے۔ اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے۔ اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے، سینکڑوں آنکھیں، سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ، پوری تصویر بن کر سامنے آ جاتی ہے ——— یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے، سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کلن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما لیٹا ہے۔ تہہ بند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عیدو حلوائی کی کنواری بیٹی شاداں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔

شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے، مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد ضرور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ۔

اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو ——— میرے ساتھی اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی مجھے بھی ——— بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دلہن کی ڈولی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارک بادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے، انھوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لئے کئی کامیاب گر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابھی نے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیے کے پاس رکھ دیئے۔ ایک دوست

اس کے لئے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بے چاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے، گھونگھٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتہ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل غائب ہی ہوگئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا۔ نیچے کوارٹر میں ہی رات کاٹے گا۔ مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دلہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے اپنی دلہن سمیت داخل ہو جائے گا۔ اور صبح منہ اندھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہنچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دلہن نے شرمائے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی، چونک کر جاگ پڑی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے۔ کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں ادھر ادھر ابھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ بیوی سے بات کی تو ساتھ ہی کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ دور کونے میں جہاں کلن کی جگہ تھی وہاں چارپائی کی 'چہ چوں۔ چہ چوں' ہونے لگی۔ یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی ——— عیدو حلوائی کی کنواری لڑکی شاداں نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دلہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے۔ اور ساری چارپائیاں 'چہ چوں۔ چہ چوں' کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھری سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی، پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں ——— آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ ناآشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آوازیں ——— وہ تصویر کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا ——— الف ننگا۔ جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی ——— بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں۔ کلن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے؟ چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کر ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگزشت پوچھی۔ پھوجے درزی نے اسے دور ہی سے آواز دی۔ ”کیوں استاد بھولو، کیسے رہے، کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے؟“

چھاگے ٹین ساز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔“

باگے نے اس کے کاندھے پر بڑے زور سے دھپا مارا۔ ”کیوں پہلوان کیسا رہا دنگل؟“

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت

کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموشی رہی تھیں لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھسر، وہی چر چوں چر چوں، وہی کھانستا کھنکارنا۔۔۔۔ وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے ——— کروٹوں پر کروٹیں، دبی دبی ہنسی ——— بھولو ساری رات اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دلہن کو دیکھ لیتا ——— اور دل میں کڑھتا۔ ''مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ——— یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر تنگ آ کے بھولو نے اپنی دلہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گذر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا۔ ''یار تم بڑے عجیب وغریب آدمی ہو، نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ تم اکیلے سوتے کیسے ہو؟''

بھولو نے صرف اتنا کہا۔ ''ٹھیک ہے!''

گاما نے پوچھا۔ ''ٹھیک کیا ہے ——— جو بات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟''

''یہ بات نہیں ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے تو اور کیا بات ہے؟''

بھولو بات گول کر گیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابھی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی۔ ''تم جو کہتے ہو نا کہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی، یہ غلط ہے۔''

گاما کی آواز آئی ''تو اور کیا بات ہے؟ ——— بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''دلچسپی کیا ہو۔'' کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا ——— ''نہیں نہیں ——— یہ تم سے کس نے کہا۔'' گاما کی بیوی بولی۔ ''عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا ——— بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔'' بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔'' بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔

☆☆☆

کھول دو

مجموعہ: نمرود کی خدائی   **اوّلین اشاعت:** ۱۹۴۹   **معیار:** ۴ ستارے

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی —— راستے میں کئی آدمی مارے گئے، متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر اُدھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچّوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں۔ اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا —— یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا —— کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر غرق میں ہے —— مگر اس کے ہوش وحواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدّین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں تو تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے ذہن میں کئی تصویریں دوڑ گئیں —— لوٹ، آگ...... بھاگم بھاگ...... اسٹیشن...... گولیاں...... رات اور سکینہ......!

سراج الدّین ایک دم کھڑا ہوگیا اور پھر اس نے پاگلوں کی طرح اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ ”سکینہ...... سکینہ......“ پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہ چلا —— چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی ہوئی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی ——

سراج الدّین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنے حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی ـــــ لیکن سوچتے سوچتے اس کا دھیان سکینہ کی ماں کی لاش پر جم گیا جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں ـــــ وہ اس سے آگے کچھ اور نہ سوچ سکا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدّین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا ـــــ لیکن سکینہ کہاں ہے، جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا۔ ''.......... مجھے چھوڑو، فوراً سکینہ کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ......''

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی ـــــ اور وہ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ دوپٹہ اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا اور سکینہ نے چلّا کر کہا تھا۔ ''.......... ابا جی، چھوڑیئے.......... !'' لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ـــــ یہ دھیان آتے ہی اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا۔ سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا ـــــ لیکن سکینہ کہاں ہے؟

سراج الدّین نے اپنے تھکے ہوئے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا.......... کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئی تھی؟ کیا راستے میں گاڑی کے رکنے پر اور بلوائیوں کے گاڑی میں گھس آنے پر وہ بیہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے..........؟

سراج الدّین کے ذہن میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی نہ تھا ـــــ سراج الدّین کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے، سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی ـــــ اس نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھ روز کے بعد سراج الدّین کے ہوش و حواس کسی طرح درست ہوئے تو وہ ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے ـــــ وہ آٹھ نوجوان تھے۔ ان کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ اس نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا۔ ''گورا رنگ ہے اس کا۔ اور بہت ہی خوبصورت ہے وہ.......... مجھ پر نہیں ہے، اپنی ماں پر ہے.......... عمر سترہ برس کے قریب ہے.......... آنکھیں بڑی بڑی، بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل.......... میری اکلوتی لڑکی ہے

........ڈھونڈ لاؤ اسے، خدا تمہارا بھلا کرے گا..........''

رضا کار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا ـــــ لیکن دس روز گزر جانے پر بھی انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ پھر اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھہرٹے کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی ـــــ لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

رضا کاروں نے لاری روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا ـــــ لڑکی خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا سا تل تھا۔

ایک نوجوان نے لڑکی سے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں ....! کیا تمہارا نام سکینہ ہے......؟''

لڑکی کا رنگ اور زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب تمام نوجوانوں نے اسے دم دلاسا دیا تو لڑکی کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھوں رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی ـــــ اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا، لاری میں بیٹھایا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ وہ بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔

وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا لیکن کہیں بھی اسے بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا، جنھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی..........

ایک دن سراج الدین نے کیمپ میں ان رضا کار نوجوانوں کو دیکھا ـــــ وہ لاری میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا ـــــ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔

''بیٹا........ میری سکینہ کا پتہ چلا..........؟''

سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ''چل جائے گا، چل جائے گا..........'' اور لاری چل پڑی۔

اس نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کی دعا مانگی ——— اور یوں اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

اسی شام کیمپ میں جہاں سراج الدّین بیٹھا ہوا تھا، اس کے پاس ہی کچھ گڑ بڑ ہوئی ——— چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔

اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی، لوگ اسے اٹھا کر لا رہے ہیں۔

سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ان لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کیا اور چلے گئے۔

وہ کچھ دیر تک ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔

ایک کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، بس ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔

سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔

سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا ——— اور چلایا۔

''سکینہ......!''

ڈاکٹر نے، جس نے کمرے میں روشنی کی تھی، اس سے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

اس کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا۔ ''جی میں.........جی میں اس کا باپ ہوں......''

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا، پھر لاش کی نبض ٹٹولی اور اس سے کہا۔ ''کھڑکی کھول دو......''

مردہ جسم میں جنبش ہوئی ——— بے جان ہاتھوں نے ازار بند کھولا ——— اور شلوار نیچے سرکا دی ——— بوڑھا سراج الدّین خوشی سے چلایا۔ ''زندہ ہے.........میری بیٹی زندہ ہے.........'' ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔

☆☆☆

سہائے

مجموعہ: خالی بوتلیں خالی ڈبے   اشاعت: 1950   معیار: ۴ ستارے

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں ——— یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں — اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے۔ لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ہلکی سے خراش بھی نہیں آئی ——— وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کئے جاسکتے ہیں ——— مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت — یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے ——— چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے۔؟"

ممتاز اس روز بہت ہی پرجوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے — وہ ایک غیر متعین عرصے کے لئے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا — پاکستان، جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے۔ مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا، غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ جگل کو لاہور سے خط ملا کہ

فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا ”میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔“

ممتاز نے اس سے پوچھا۔ ”کیا کرو گے؟“

جگل نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔“

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ کی۔ جگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے ”میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے، میں تمہیں مار ڈالوں۔“ غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں ـــــ ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا ـــــ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا ـــــ خاص طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔

صبح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لئے جا رہا ہے ـــــ خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا۔ کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابل بیان مسرّت محسوس کر رہا ہے۔ لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کے لئے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں۔ اشارۃً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پیگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے۔ ڈاکٹروں کی فیسیں دینی

تھیں۔ لانڈری سے کپڑے لانے تھے —— یہ سب کام اس نے ہنستے کھیلتے کیے۔ لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا ''یاد ہے، برج —— آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ اُدھار دیا تھا۔''

راستے میں ممتاز خاموش رہا، مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر۔ لیکن وہ کچھ ایسی پُر خلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصہ لیتے رہے۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو جگل بھی شامل ہو گیا۔ لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں۔ حتّٰی کہ ٹیکسی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی۔ ہزار ہا ریفیوجی جا رہے تھے۔ خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ —— بے پناہ ہجوم تھا۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں، جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا۔

جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا —— ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے، ممتاز دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ یہ محض فریبِ نظر ہے —— آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا —— لیکن یہ فریب نظر کس قدر دلکش ہے —— یہ ملاپ!

جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی۔ ''میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں۔''

ممتاز نے جہاز کے بار سے برانڈی منگوائی، کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا —— ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک ہی جرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا ''مجھے معاف کر دینا ممتاز —— میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ

پہنچایا تھا۔"

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا" جب تم نے کہا تھا، "میں سوچ رہا ہوں — بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں" — کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا — نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔"

جگل نے اثبات میں سر ہلایا" — لیکن مجھے افسوس ہے!"

"تم مجھے مار ڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔" ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو — ایک مسلمان کو — ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے ——— وہ اگر حرامزادہ تھا تو تم نے اس کی حرامزدگی کو نہیں بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے —— وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں اس کی ہستی کو ختم کیا ہے ——— اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا، لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ "ہو سکتا ہے میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے، لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا۔ مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں ——— مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے، جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں ——— لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا — تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا — بتاؤ تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟ ——— اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے؟"

"میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتّے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار، بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے —"

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت زیادہ جذباتی ہو گیا۔ لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت — یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔"

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا۔ "نہیں، بالکل

ٹھیک نہیں — میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے۔ لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا۔ مذہب سے میری مُراد یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں جس میں ہم میں سے ننانوے فیصدی مبتلا ہیں — میری مُراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں جُداگانہ حیثیت بخشتی — وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے — لیکن یہ چیز کیا ہے؟ افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر دکھا نہیں سکتا، یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کیا۔ "لیکن اس میں وہ کون سی خاص بات تھی؟ — کٹر ہندو تھا — پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟"

میں نے پوچھا۔ "کس کی؟"

"ایک بھڑوے کی۔"

ہم تینوں چونک پڑے۔ ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا، اس لئے میں نے سنجیدگی سے پوچھا "ایک بھڑوے کی؟"

ممتاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عرف عام میں ایک بھڑوا تھا — عورتوں کا دلال — لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا۔"

ممتاز تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا، جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے — چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں — کچھ سہائے تھا — بنارس کا رہنے والا، بہت ہی صفائی پسند۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا — پردے کا معقول انتظام تھا۔ چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے۔ لیکن گدیلے اور گاؤ تکئے موجود تھے، چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اُجلے رہتے تھے۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا — صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام — اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا۔ دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا۔ رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے۔ تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجئے — اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپایا نہیں کرتا تھا — اور تو اور اس

نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے — ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر — اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے — معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں، زیادہ کیوں نہیں — اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزازی کی دکان کھولے گا — میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا آرزومند کیوں تھا۔"

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا "عجیب وغریب آدمی تھا"۔

ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے — ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے میں شریک تھیں، اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لئے بعید از فہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاونٹ کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابلِ یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے — اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی — ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اس نے مجھ سے کہا امینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں — میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جا کر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں — یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں' ------ میں یہ سن کر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے — ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی، لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحب کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اب اس نے سہائے کے لئے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جا کر بزازی کی دکان کھول سکے۔ یہ سن کر میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا، چونکہ میں مسلمان ہوں، اس لئے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

میں نے ممتاز سے پوچھا "تمہارا خیال غلط تھا؟"

"بالکل — اس کے قول و فعل میں کوئی بُعد نہیں تھا — ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں — مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا"۔

جگل نے سوال کیا۔ ”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”اس کی موت پر۔“ یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے“۔ فسادات شروع ہو چکے تھے — میں علی الصباح اٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا۔ کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی۔ ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی۔ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا، تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھری سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کہ کوئی پانی والا (مزدور) سو رہا ہے — لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رُک گیا۔ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی —— میں پھر رُک گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، مگر خون کے دھبّوں سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا — اس کی ٹول کی سفید قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی — زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے ایک دو بار میں نے اس کو نامکمل نام سے بھی پکارا — میں اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں — دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا — پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا ”۔ آپ؟ — آپ؟“

میں نے اس سے تلے اُوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔ وہ کیسے ادھر آیا۔ کس نے اس کو زخمی کیا۔ کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے — سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں؟

اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ جب میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے“۔ ”میرے دن پورے ہو چکے تھے — بھگوان کو یہی منظور تھا!“

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس احساس کے ساتھ مرتے

دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا — میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اُس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا، ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں، دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لئے ضرور دھر لیا جاؤں گا — ایک بار یہ خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنا بدلہ لینے کے خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچے، مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں — اس قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا — بلکہ یوں کہیے کہ بھاگنے والا تھا کہ سہائے نے مجھے پکارا — میں ٹھہر گیا — نہ ٹھہرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رُک گئے — میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے — اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے، بڑی مشکلوں سے اپنی قمیض کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا، مگر جب کچھ اور کرنے کی اس کی ہمت نہ رہی تو اس نے مجھ سے کہا "— نیچے بنڈی ہے — ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں — یہ — سلطانہ کا مال ہے...... میں نے...... میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا...... آج اسے...... آج اسے بھیجنے والا تھا...... کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے...... آپ اسے دے دیجئے گا...... اور کہیے گا فوراً چلی جائے...... لیکن...... اپنا خیال رکھے گا!"

ممتاز خاموش ہو گیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز، سہائے کی آواز میں جو جے جے ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر اُبھری تھی، دور، ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے، حل ہو رہی ہے۔

جہاز نے وسل دیا تو ممتاز نے کہا — "میں سلطانہ سے ملا — اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے"۔

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا — اس کا داہنا ہاتھ ہل رہا تھا —

میں جگل سے مخاطب ہوا۔ "کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز، سہائے کی روح کو بلا رہا ہے — ہم سفر بنانے کے لیے؟"

جگل نے صرف اتنا کہا۔ "کاش، میں سہائے کی روح ہوتا!"

☆☆☆

رام کھلاون

مجموعہ: خالی بوتلیں خالی ڈبے　　اشاعت: 1950　　معیار: ۴ ستارے

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا ـــــ میں نے اس تصویر سے اس کو پُر کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دھلے ہوئے کپڑوں کا اسٹاک ختم ہو جاتا تھا ـــ مجھے اسٹاک تو نہیں کہنا چاہیے، اس لئے کہ مفلسی کے اس زمانے میں میرے پاس صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضع داری قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں ماہم جا رہا تھا۔ دھوبی شریف آدمی تھا۔ یعنی ڈھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو میری نادہندگی سے تنگ آکر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے، جو کہ بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بُو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ دھوبی آگیا۔ ’’ساب سلام‘‘۔ کر کے اس نے اپنی گٹھری کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیئے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور ایک عجیب وغریب آواز حلق

سے نکالی۔ ''ہے ہے ہے ہیں؟''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے دھوبی؟''

دھوبی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں۔ ''یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہے؟''

''تم جانتے ہو انہیں؟''

دھوبی نے زور سے سر ہلایا۔ ''ہاں............ دو بھائی ہوتا ـــــ اُدھر کولابا میں ان کا کوٹھی ہوتا ـــ ساعید شالیم بالشٹر ـــــ میں ان کا کپڑا دھوتا ہوتا''۔

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہوگی۔ کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبئی میں پریکٹس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ ''دو برس پہلے کی بات کرتے ہو تم۔''

دھوبی نے زور سے سر ہلایا۔ ''ساعید شالیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی دیا ـــ ایک دھوتی دیا ـــ ایک کُرتہ دیا ـــ نیا ـــ بہت اچھا لوگ ہوتا ـــ ایک کا داڑھی ہوتا ـــ یہ بڑا''۔ اس نے ہاتھ سے داڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ چھوٹا ہوتا ـ اس کا تین باوا لوگ ہوتا۔ لڑکا، ایک لڑکی ـــ ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا ـــ کولابے میں کوٹھی ہوتا ـــ بہت بڑا......''

میں نے کہا۔ ''دھوبی یہ میرے بھائی ہیں''۔

دھوبی نے حلق سے عجیب وغریب آواز نکالی۔ ''ہے ہے ہے ہیں؟ ـــ ساعید شالیم بالشٹر؟؟''

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''یہ تصویر سعید حسن بھائی جان کی ہے ـــ داڑھی والے محمد حسن ہیں ـــ ہم سب سے بڑے''۔

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا ـــ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، بجلی کی لائٹ سے محروم۔ ایک میز تھی۔ ایک کرسی اور ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزار ہا کھٹمل تھے۔ دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشٹر کا بھائی ہوں، لیکن جب میں نے اس کو ان کی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا۔ ''ساعید شالیم بالشٹر کولابے میں رہتا اور تم کھولی میں!''

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی۔ کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔ پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں"۔

"ہاں ساب —— تم برو بر کہتا ہے"۔ یہ کہہ کر دھوبی نے گٹھری اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک جانے آنے کے لئے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھہرایا اور کہا۔ "دھوبی —— کپڑوں کا حساب یاد رکھنا —— خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں"۔

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا۔ "ساب، ہم حساب نہیں رکھتا —— ساعید شالیم بالشٹر کا ایک برس کام کیا —— جو دے دیا، لے لیا —— ہم حساب جانت ہی ناہیں"۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی —— میری شادی ہو گئی۔ حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سیکنڈ پیرخان اسٹریٹ کی کھولی سے، جس کا کرایہ نو روپے ماہوار تھا کلئیر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کرایہ پینتیس روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوبی کو ماہ بماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا۔ "بیگم ساب — ساب کا بھائی ساعید شالیم بالشٹر بڑا آدمی ہوتا —— ادھر کولابہ میں رہتا ہوتا...... جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا —— تمہارا ساب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوتا"۔

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا تھا —— جب دے دیا، جو دے دیا، اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی —— لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت ہو گئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا۔ "چار برس میرا کام کرتا رہا ہے —— اس

نے کبھی حساب نہیں کیا''۔

جواب یہ ملا۔ ''حساب کیوں کرتا ـــــ ویسے دوگنے چوگنے وصول کر لیتا ہوگا''۔

''وہ کیسے؟''

''آپ نہیں جانتے ـــــ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو ایسے لوگ بے وقوف بنانا جانتے ہیں''۔

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا۔ ''بیگم ساب ـــــ ہم حساب جانت ناہیں۔ تم جھوٹ ناہیں بولے گا ـــــ ساعید شالیم بالشٹر جو تمہارے ساب کا بھائی ہوتا۔ ہم ایک برس اس کا کام کیا، ہوتا۔ بیگم ساب بولتا دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا ـــ ہم بولتا، ٹھیک ہے!''

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزمانے کے لئے اس سے کہا۔ ''دھوبی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے''۔

اس نے کہا ''ٹھیک ہے ـــــ بیگم ساب، تم جھوٹ ناہیں بولے گا۔''

میری بیوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیئے تو اس نے ماتھے کے ساتھ روپے چھوا کر سلام کیا اور چلنے لگا۔ میری بیوی نے اسے روکا ''ٹھہرو دھوبی ـــــ ساٹھ نہیں، ڈھائی سو کپڑے تھے ـــــ لو اپنے باقی روپے، میں نے مذاق کیا تھا۔

دھوبی نے صرف اتنا کہا ''بیگم ساب تم جھوٹ ناہیں بولے گا''۔ باقی کے روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلّی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا، پھر واپس بمبئی آ گیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کئے کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے، کبھی دھلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانا دھوبی یاد آنے لگا۔ ایک روز جب کہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے، وہ اچانک آ گیا اور کہنے لگا ''ساب کو ہم نے ایک دن بس میں دیکھا ـــــ ہم بولا، ایسا کیسا، ـــــ ساب تو دلّی چلا گیا تھا...... ہم نے ادھر بائی کلہ میں تپاس کیا۔''

چھاپہ والا بولا، اُدھر ماہم میں تپاس کرو ـــــ باجو والی چالی میں ساب کا دوست

ہوتا —— اس سے پوچھا اور آگیا"۔

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

کانگریس برسر اقتدار آئی تو امتناع شراب کا حکم نافذ ہوگیا۔ انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہوگئی۔ ننانوے فی صدی دھوبی شراب کے عادی تھے —— دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی —— ہمارا دھوبی بیمار ہوگیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہوگئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا اور رات کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی۔ نوکر اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا، چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب، آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے"۔

ڈاکٹر مسکرایا۔ "تو آدھا آدھا کر لیجئے"۔

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی۔

دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سے دور ہوگئی۔ نقاہت تھی، وہ آہستہ آہستہ مقوی دواؤں کے استعمال سے ختم ہوگئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا۔ بھگوان ساب کو ساعید شالیم بالشٹر بنائے —— ادھر کولابے میں ساب رہنے کو جائے —— باوا لوگ ہوں —— بہت بہت پیسہ ہو —— بیگم ساب دھوبی کو لینے آیا —— موٹر میں۔ ادھر کلے (قلعے) میں بہت بڑے ڈاکڈر کے پاس لے گیا جس کے پاس میم ہوتا —— بھگوان بیگم ساب کو خس رکھے ......"

کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے۔ دھوبی بلاناغہ اتوار کو آتا رہا۔ اس کی صحت اب بہت اچھی تھی۔ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا۔ ہمیشہ

دعائیں دیتا۔ شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی۔ شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا کرتا تھا۔ پر اب نام تک نہ لیتا تھا۔ سارا دن پانی میں رہنے کے بعد تھکن دور کرنے کے لئے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے۔ بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کئے جانے لگے۔ میری بیوی لاہور چلی گئی۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوبی سے کہا۔ ”دیکھو دھوبی اب تم کام بند کردو —— یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے، ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے“۔

دھوبی مسکرایا۔ ”ساب اپن کو کوئی نہیں مارتا۔“

ہمارے محلّے میں کئی وارداتیں ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا۔

ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحے پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعداد و شمار —— میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آ گیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کی تو دھوبی نے ہنس ہنس کے باتیں شروع کر دیں، ساعید شالیم بالشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا۔ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا۔ تمہارا بیگم ساب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا —— باہر کام گیا ہے نا؟ —— اپنے ملک میں؟ —— ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو...... موٹر لے کر آیا ہماری کھولی میں —— ہم کو اتنا جلاب آتا ہوتا —— ڈاکٹر نے سوئی لگایا —— ایک دم ٹھیک ہو گیا —— ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو —— بولو رام کھلاون بولتا ہے، ہم کو بھی کاگج لکھو ——“

میں نے اس کی بات کاٹ کر ذرا تیزی سے کہا۔ ”دھوبی —— دارو شروع کر دی؟“

دھوبی ہنسا ”دارو؟ —— دارو کہاں ملتی ہے ساب؟“

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گٹھری بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے۔ لاہور سے تار پر تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑو اور جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔ لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوبی کے پاس تھے۔ میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کر لے آؤں، چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہالکشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اس لئے آمد و رفت جاری تھی، ٹرامیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پل کے پاس پہنچی تو ایک دم شور برپا ہوا۔ لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے —— ہجوم چھدرا ہوا تو دیکھا، دور بھٹیوں کے پاس بہت سے دھوبی لاٹھیاں ہاتھ میں لئے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل پڑا —— جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوبی سے پوچھا۔ ”رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟“

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، جھومتا ہوا اس دھوبی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا تھا۔ ”کا پوچھت ہے؟“

”پوچھت ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟“

شراب سے دھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا۔ ”تم کون ہے؟“

”میں؟ —— رام کھلاون میرا دھوبی ہے“۔

”رام کھلاون تہار دھوبی ہے —— تو کس دھوبی کا بچہ ہے؟“

ایک چلّایا ”ہندو دھوبی کا یا مسلمین دھوبی کا“۔

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں چور تھے مکّے تانتے اور لاٹھیاں گھماتے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا۔ مسلمان ہوں یا ہندو؟ —— میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔ نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کے لئے پکارتا —— اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی۔ ”رام کھلاون ہندو ہے...... ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے...... اس کی کھولی کہاں ہے...... دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے...... بہت بیمار تھا——

ہم نے اس کا علاج کرایا تھا ــــ ہماری بیگم ...... ہماری میم صاحب یہاں موٹر لے کر آئی تھی ...... یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کے لئے کتنی نیچی سطح پر اُتر آتا ہے۔ اس احساس نے جرأت پیدا کردی چنانچہ میں نے ان سے کہا۔ "میں مسلمین ہوں"۔

"مارڈالو ــــ مارڈالو" کا شور بلند ہوا۔

دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا۔ "ٹھہرو ــــ اسے رام کھلاون مارے گا"۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لئے لڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کردیں۔ ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "رام کھلاون!"

رام کھلاون دہاڑا۔ "چپ کر بے رام کھلاون کے ......"

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آپہنچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا۔ "مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟"

رام کھلاون نے وار کرنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا ــــ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر سکڑیں۔ ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا۔ "ساب!"

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "یہ مسلمین نہیں ــ یہ میرا ساب ہے ــ بیگم ساب کا ساب ...... وہ موٹر لے کر آیا تھا ...... ڈاکڈر کے پاس لے گیا تھا۔ جس نے میرا جلاب ٹھیک کیا تھا۔"

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے ــــ سب شرابی تھے۔ تُوتُو میں میں شروع ہوگئی۔ کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف ہوگئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آگئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا اسامان تیار تھا۔ صرف جہاز کے ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بے قرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے جذبات اُبل رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آ جائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہو گئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کر لے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آ گئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

"ساب سلام!"

"سلام۔"

'میں اندر آ جاؤں؟"

"آؤ۔"

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھری کھول کر اس نے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھے۔ دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "آپ جا رہے ہیں ساب؟"

"ہاں۔"

اس نے رونا شروع کر دیا۔ "ساب، مجھے ماف کر دو——یہ سب دارو کا قصور تھا......اور دارو......دارو آج کل مفت ملتی ہے——سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو......مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب......ہم کو ماف کر دو——ہم پئے لا تھا......ساعید شالیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا——ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا......بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا۔ جلاب سے ہم مرتا ہوتا——وہ موٹر لے کر آتا۔ ڈاکٹڈر کے پاس لے جاتا۔ اتنا پیسہ خرچ کرتا——تم ملک جاتا"۔

اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ گٹھری کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا۔ تو میں نے روکا "ٹھہرو رام کھلاون!"

لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آخری سیلوٹ

مجموعہ: یزید | **اشاعت: 1951** | **معیار: ۴ ستارے**

یہ کشمیر کی لڑائی بھی کچھ عجیب و غریب تھی۔ صوبیدار رب نواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔

پچھلی بڑی جنگ میں وہ کئی محاذوں پر لڑ چکا تھا۔ مارنا اور مرنا جانتا تھا۔ چھوٹے بڑے افسروں کی نظروں میں اس کی بڑی توقیر تھی، اس لئے کہ وہ بڑا بہادر، نڈر اور سمجھدار سپاہی تھا۔ پلاٹون کمانڈر مشکل کام ہمیشہ اسے ہی سونپتے تھے اور وہ ان سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ دل میں بڑا ولولہ، بڑا جوش تھا، بھوک پیاس سے بے پرواہ صرف ایک ہی لگن تھی، دشمن کا صفایا کر دینے کی۔ مگر جب اس سے سامنا ہوتا تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں۔ بعض دوست دکھائی دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست جو پچھلی لڑائی میں اس کے دوش بدوش اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔

صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں ـــــــ پچھلی بڑی جنگ کا اعلان۔ بھرتی، قد اور چھاتیوں کی پیمائش، پی ٹی، چاند ماری اور پھر محاذ۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، آخر جنگ کا خاتمہ۔ پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی۔ اوپر تلے کتنی چیزیں ـــــــ رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تا کہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔

اتنی بات تو صوبیدار رب نواز کی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ کشمیر حاصل کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کشمیر کیوں حاصل کرنا ہے، یہ بھی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ پاکستان کی بقا کے لئے اس کا الحاق اشد ضروری ہے۔ مگر نشانہ باندھتے ہوئے اسے جب کوئی جانی پہچانی شکل نظر آجاتی تھی تو وہ کچھ دیر کے لئے بھول جاتا تھا کہ وہ کس غرض کے لئے لڑ رہا ہے، کس مقصد کے لئے اس نے بندوق اٹھائی ہے۔ اور وہ یہ غالباً اسی لئے بھولتا تھا کہ اسے بار بار خود کو یاد کرانا پڑتا تھا کہ اب کی وہ صرف تنخواہ، زمین کے مربعوں اور تمغوں کے لئے نہیں بلکہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے۔ یہ وطن پہلے بھی اس کا وطن تھا۔ وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اب اسے اپنے اُسی ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ ہوتا تھا، جس کے خاندان سے پشت ہا پشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا، پر اب اس کی خاطر ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ جاؤ یہ جگہ جہاں تم نے ابھی اپنے گھر کے لئے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں، جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزہ بھی ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا، تمہارا وطن ہے —— جاؤ اس کی خاطر پاکستان سے لڑو —— اس پاکستان سے جس کے عین دل میں تم نے اپنی عمر کے اتنے برس گزارے ہیں۔

رب نواز سوچتا تھا کہ یہی حال ان مسلمان فوجیوں کا ہے جو ہندوستان میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ وہاں ان سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا، یہاں آکر انہیں اور تو کچھ نہیں ملا البتہ بندوقیں مل گئی ہیں۔ اسی وزن کی، اسی شکل کی، اسی مار کے اور چھاپ کی۔

پہلے وہ سب مل کر ایک ایسے دشمن سے لڑتے تھے جن کو انھوں نے پیٹ اور انعام و اکرام کی خاطر اپنا دشمن یقین کر لیا تھا۔ اب وہ خود دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے سب ہندوستانی فوجی کہلاتے تھے۔ اب ایک پاکستانی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔ ادھر ہندوستان میں مسلمان ہندوستانی فوجی تھے۔ رب نواز جب ان کے متعلق سوچتا تو اس کے دماغ میں ایک عجیب گڑبڑ سی پیدا ہو جاتی۔ اور جب وہ کشمیر کے متعلق سوچتا تو اس کا دماغ بالکل جواب دے جاتا —— پاکستانی فوجی کشمیر کے لئے لڑ رہے تھے یا کشمیر کے مسلمانوں کے لئے؟ اگر انہیں کشمیر کے مسلمانوں ہی کے لئے لڑایا جا رہا تھا تو حیدرآباد اور جوناگڑھ کے مسلمانوں کے لئے کیوں

انہیں لڑنے کے لئے نہیں کہا جاتا تھا اور اگر یہ جنگ ٹھیٹ اسلامی جنگ ہے تو دنیا میں دوسرے اسلامی ملک ہیں، وہ اس میں کیوں حصّہ نہیں لیتے؟

رب نواز بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باریک باتیں فوجی کو بالکل نہیں سوچنا چاہئیں۔ اس کی عقل موٹی ہونی چاہئے۔ کیونکہ موٹی عقل والا ہی اچھا سپاہی ہو سکتا ہے۔ مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کر ہی لیتا تھا اور بعد میں اپنی اس حرکت پر خوب ہنستا تھا۔

دریائے کشن گنگا کے کنارے اس سڑک کے لئے جو مظفر آباد سے کرن جاتی ہے، کچھ عرصے سے لڑائی ہو رہی تھی۔ عجیب و غریب لڑائی تھی۔ رات کو بعض اوقات آس پاس کی پہاڑیاں فائروں کے بجائے گندی گندی گالیوں سے گونج اٹھتی تھیں۔

ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پلاٹون کے جوانوں کے ساتھ شب خون مارنے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ دور نیچے ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناچ رہے ہیں اور زور زور کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ بڑبڑایا۔ ”خنزیر کی دُم ——— یہ کیا ہو رہا ہے؟“

ایک جوان نے گونجتی ہوئی آوازوں سے مخاطب ہو کر یہ بڑی گالی دی اور رب نواز سے کہا۔ ”صوبیدار صاحب! گالیاں دے رہے ہیں اپنی ماں کے یار۔“

رب نواز یہ گالیاں سن رہا تھا جو بہت اکسانے والی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ بزن بول دے مگر ایسا کرنا غلطی ہوئی، چنانچہ وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر جوان بھی چپ رہے، مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو انھوں نے بھی گلا پھاڑ پھاڑ کے گالیاں لڑھکانا شروع کر دیں ——— رب نواز کے لئے اس قسم کی لڑائی بالکل نئی چیز تھی۔ اس نے جوانوں کو دو تین مرتبہ خاموش رہنے کے لئے کہا، مگر گالیاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ جواب دیئے بنا انسان سے نہیں رہا جاتا۔

دشمن کے سپاہی نظر سے اوجھل تھے۔ رات کو تو خیر اندھیرا تھا مگر وہ دن کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ان کی گالیاں نیچے پہاڑی کے قدموں سے اٹھتی تھیں اور پتھروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ہوا میں حل ہو جاتی تھیں۔ رب نواز کی پلاٹون کے جوان جب ان گالیوں کا جواب دیتے تھے تو اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ نیچے نہیں جاتیں، اوپر کو اڑ جاتی ہیں۔ اس سے اس کو خاصی کوفت ہوتی

تھی ـــــ چنانچہ اس نے جھنجھلا کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔

رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی ۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھی اور اترائی کی طرف گنجی۔ کشمیری ہتو کے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ چیڑ کے لمبے تناور درخت، جن کے بٹے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے تھے۔

جس پہاڑی پر صوبیدار رب نواز کی پلاٹون تھی، اس کی اترائی درختوں اور جھاڑیوں سے بے نیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ حملہ بہت ہی خطرناک تھا مگر سب جوان بخوشی تیار تھے۔ گالیوں کا انتقام لینے کے لئے وہ بہت بے تاب تھے۔ حملہ ہوا اور کامیاب رہا۔ دو جوان مارے گئے۔ چار زخمی ہوئے۔ دشمن کے تین آدمی کھیت رہے۔ باقی رسد کا کچھ سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

صوبیدار رب نواز اور اس کے جوانوں کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ دشمن کا کوئی زندہ سپاہی ان کے ہاتھ نہ آیا جس کو وہ گالیوں کا خاطر خواہ مزا چکھاتے۔ مگر یہ مورچہ فتح کرنے سے وہ ایک بڑی اہم پہاڑی پر قابض ہو گئے تھے ـــــ وائرلیس کے ذریعے سے صوبیدار رب نواز نے پلاٹون کمانڈر میجر اسلم کو فوراً ہی اپنے حملے کے اس نتیجے سے مطلع کر دیا تھا اور شاباشی وصول کر لی تھی۔

قریب قریب ہر پہاڑی کی چوٹی پر پانی کا ایک تالاب سا ہوتا تھا۔ اس پہاڑی پر بھی تالاب تھا، مگر دوسری پہاڑیوں کے تالابوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا۔ اس کا پانی بھی بہت صاف اور شفاف تھا۔ گو موسم سخت سرد تھا، مگر سب نہائے۔ دانت بجتے رہے مگر انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔ وہ ابھی اس شغل میں مصروف تھے کہ فائر کی آواز آئی۔ سب ننگے ہی لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد صوبیدار رب نواز خاں نے دوربین لگا کر نیچے ڈھلوانوں پر نظر دوڑائی، مگر اسے دشمن کے چھپنے کی جگہ کا پتا نہ چلا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ایک اور فائر ہوا۔ دور اترائی کے فوراً بعد ایک نسبتاً چھوٹی پہاڑی کی داڑھی سے اسے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ اس نے فوراً ہی اپنے جوانوں کو فائر کا حکم دیا۔

اِدھر سے دھڑ دھڑ فائر ہوئے اور اُدھر سے بھی جواباً گولیاں چلنے لگیں ـــــ صوبیدار رب نواز نے دوربین سے دشمن کی پوزیشن کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ غالباً بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے محفوظ تھے۔ مگر یہ محافظ دیوار بہت ہی چھوٹی تھی۔ زیادہ دیر تک وہ جمے نہیں رہ سکتے تھے۔ ان

میں سے جو بھی اِدھر اُدھر ہٹتا، اس کا صوبیدار رب نواز کی زد میں آنا یقینی تھا۔

تھوڑی دیر فائر ہوتے رہے۔ اس کے بعد رب نواز نے اپنے جوانوں کو منع کر دیا کہ وہ گولیاں ضائع نہ کریں، صرف تاک میں رہیں ـــــ جونہی دشمن کا کوئی سپاہی پتھروں کی دیوار سے نکل کر اِدھر یا اُدھر جانے کی کوشش کرے، اس کو اڑا دیں ـــــ یہ حکم دے کر اس نے اپنے الف ننگے بدن کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا: ''خنزیر کی دُم............ کپڑوں کے بغیر آدمی حیوان معلوم ہوتا ہے''۔

لمبے لمبے وقفوں کے بعد دشمن کی طرف سے اِکّا دُکّا فائر ہوتا رہا۔ اِدھر سے بھی اس کا جواب کبھی کبھی دے دیا جاتا۔ یہ کھیل پورے دو دن جاری رہا ـــــ موسم یک لخت بہت سرد ہو گیا تھا۔ اس قدر سرد کہ دن کو بھی خون منجمد ہونے لگتا تھا، چنانچہ صوبیدار رب نواز نے چائے کے دور شروع کرا دیئے۔ ہر وقت آگ پر کیتلی دھری رہتی۔ جونہی سردی زیادہ ستاتی، ایک دور اس گرم گرم مشروب کا ہو جاتا۔ ویسے دشمن پر برابر نگاہ تھی۔ ادھر ایک جوان ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ فوراً دور بین لے کر بیٹھ جاتا۔

ہڈیوں تک اتر جانے والی سرد ہوا چل رہی تھی ـــــ جب اس جوان نے جو پہرے دار تھا، بتایا کہ پتھروں کی دیوار کے پیچھے کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے تو صوبیدار رب نواز نے اس سے دور بین لی اور غور سے دیکھا۔ اسے حرکت نظر نہ آئی لیکن فوراً ہی ایک آواز بلند ہوئی اور دیر تک اس کی گونج آس پاس کی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ رب نواز اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اس کے جواب میں اس نے اپنی بندوق داغ دی۔ اس کی گونج دبی تو پھر اُدھر سے آواز بلند ہوئی جو صاف طور پر ان سے مخاطب تھی۔ رب نواز چلّایا۔ ''خنزیر کی دم۔ بول کیا کہتا ہے تُو!''

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ رب نواز کے الفاظ دشمن تک پہنچ گئے، کیونکہ وہاں سے کسی نے کہا۔ ''گالی نہ دے بھائی!''

رب نواز نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا اور بڑے جھنجھلائے ہوئے تعجب کے ساتھ کہا۔ ''بھائی ....''؟ پھر وہ اپنے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر چلّایا۔ ''بھائی ہو گا تیری ماں کا جنا ـــــ یہاں سب تیری ماں کے یار ہیں!''

ایک دم اُدھر سے ایک زخمی آواز بلند ہوئی۔ ''رب نواز!''

رب نواز کانپ گیا ـــــ یہ آواز آس پاس کی پہاڑیوں سے سر پھوڑتی رہی اور مختلف انداز میں "رب نواز ـــــ رب نواز" دُہراتی بالا آخر خون منجمد کر دینے والی سرد ہوا کے ساتھ جانے کہاں اُڑ گئی۔

رب نواز بہت دیر کے بعد چونکا۔ "یہ کون تھا؟" پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ "خنزیر کی دُم!"

اس کو اتنا معلوم تھا کہ ٹیٹوال کے محاذ پر سپاہیوں کی اکثریت ۹/۶ رجمنٹ کی ہے۔ وہ بھی اسی رجمنٹ میں تھا ـــــ مگر یہ وہ آواز تھی کس کی؟ وہ ایسے بیشمار آدمیوں کو جانتا تھا جو کبھی اس کے عزیز ترین دوست تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن سے اس کی دشمنی تھی، چند ذاتی اغراض کی بنا پر۔ لیکن یہ کون تھا جس نے اس کی گالی کا بُرا مان کر اسے چیخ کر پکارا تھا؟

رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا، مگر پہاڑی کی ہلتی ہوئی چھدری داڑھی میں اُسے کوئی نظر نہ آیا۔ دنوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر پھر اس نے زور سے اپنی آواز اُدھر پھینکی۔ "یہ کون تھا؟ ـــــ میں رب نواز بول رہا ہوں ـــــ رب نواز ـــــ رب نواز۔"

"رب نواز" بھی کچھ دیر تک پہاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا رہا۔

رب نواز بڑبڑایا۔ "خنزیر کی دُم!"

فوراً ہی ادھر سے آواز بلند ہوئی۔ "میں ہوں ـــــ میں ہوں رام سنگھ!"

رب نواز یہ سن کر یوں اچھلا جیسے وہ چھلانگ لگا کر دوسری طرف جانا چاہتا ہے۔ پہلے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "رام سنگھ!" پھر حلق پھاڑ کے چلایا: "رام سنگھ ـــ اوئے رام سنگھا ـــ خنزیر کی دُم!"

"خنزیر کی دُم" ابھی پہاڑیوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر پوری طرح گم نہیں ہوئی تھی کہ رام سنگھ کی پھٹی پھٹی آواز بلند ہوئی۔ "اوئے کمہار کے کھوتے!"

رب نواز پھوں پھوں کرنے لگا۔ جوانوں کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ "بکتا ہے ـــــ خنزیر کی دُم۔" پھر اس نے رام سنگھ کو جواب دیا۔ "اوئے بابا ٹل کے کڑاہ پرشاد ـــــ اوئے خنزیر کے جھٹکے"!

رام سنگھ بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ رب نواز بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ پہاڑیاں یہ

آوازیں بڑے کھلنڈرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف اچھالتی رہیں —— صوبیدار رب نواز کے جوان خاموش تھے۔

جب ہنسی کا دورہ ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی۔ ''دیکھو یار، ہمیں چائے پینی ہے!''

رب نواز بولا۔ ''پیو —— عیش کرو۔''

رام سنگھ چلّایا۔ ''اوئے عیش کس طرح کریں .... سامان تو ہمارا ادھر پڑا ہے۔''

رب نواز نے پوچھا۔ ''کدھر''؟

رام سنگھ کی آواز آئی۔ ''ادھر —— جدھر تمہارا فائر ہمیں اڑا سکتا ہے۔''

رب نواز ہنسا۔ ''تو کیا چاہتے ہو تم —— خنزیر کی دم!''

رام سنگھ بولا۔ ''ہمیں سامان لے آنے دے۔''

''لے آ!'' یہ کہہ کر اس نے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔

رام سنگھ کی تشویش بھری آواز بلند ہوئی۔ ''تُو اڑا دے گا کمہار کے کھوتے!''

رب نواز نے بھنّا کر کہا۔ ''بک نہیں اوئے سنتو کھسر کے پھوے۔''

رام سنگھ ہنسا۔ ''قسم کھا تو ہمیں نہیں مارے گا!''

رب نواز نے پوچھا۔ ''کس کی قسم کھاؤں؟''

رام سنگھ نے کہا۔ ''کسی کی بھی کھا لے!''

رب نواز ہنسا۔ ''اوئے جا .... منگوا لے اپنا سامان!''

چند لمحات خاموشی رہی۔ دوربین ایک جوان کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے صوبیدار رب نواز کی طرف دیکھا۔ وہ بندوق چلانے ہی والا تھا کہ رب نواز نے اسے منع کیا۔ ''نہیں —— نہیں!''

پھر اس نے دوربین لے کر خود ہی دیکھا۔ دشمن کا ایک آدمی ڈرتے ڈرتے پنجوں کے بل پتھروں کے عقب سے نکل کر جا رہا تھا۔ تھوڑی دور اس طرح چل کر وہ اٹھا اور تیزی سے بھاگا۔ اور کچھ دور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان تھا۔ ایک لحظے کے لئے وہ رکا۔ پھر تیزی سے پتھروں کی محفوظ دیوار کی

طرف بھاگا اور بالآخر وہاں پہنچ گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو رب نواز نے اپنی بندوق چلادی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی رب نواز کا قہقہہ بلند ہوا۔

دونوں آوازیں مل کر کچھ دیر جھنجھناتی رہیں۔ پھر رام سنگھ کی آواز آئی۔ ”تھینک یو۔“

”نومینشن۔“ رب نواز نے یہ کہہ کر جوانوں کی طرف دیکھا۔ ”ایک راؤنڈ ہو جائے۔“ تفریح کے طور پر دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ پھر خاموشی ہوگئی۔ رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا ——— پہاڑی کی داڑھی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پکارا۔ ”چائے تیار کرلی رام سنگھا؟“

جواب آیا۔ ”ابھی کہاں اوئے کمہار کے کھوتے!“

رب نواز ذات کا کمہار تھا۔ جب کوئی اس کی ذات کی طرف اشارہ کرتا تھا تو غصے سے اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ایک صرف رام سنگھ کے منہ سے وہ کمہار برداشت کرلیتا تھا اس لئے کہ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ایک ہی گاؤں میں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں کی عمر میں صرف چند دن کا فرق تھا۔ دونوں کے باپ، پھر اُن کے باپ بھی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک ہی اسکول میں پرائمری تک پڑھے تھے اور ایک ہی دن فوج میں بھرتی ہوئے تھے اور پچھلی بڑی جنگ میں کئی محاذوں پر اکٹھے لڑے تھے۔

رب نواز اپنے جوانوں کی نظروں میں خود کو خفیف محسوس کرکے بڑبڑایا۔ ”خنزیر کی دُم ——— اب بھی باز نہیں آتا۔“

پھر وہ رام سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ”بک نہیں اوئے کھوتے کی جوں۔“

رام سنگھ کا قہقہہ بلند ہوا۔

رب نواز نے ایسے ہی شست باندھی ہوئی تھی۔ تفریحاً اس نے لبلبی دبادی۔ تڑاخ کے ساتھ ہی ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ رب نواز نے فوراً دوربین لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی نہیں رام سنگھ پیٹ پکڑے، پتھروں کی دیوار سے ذرا ہٹ کر دوہرا ہوا اور گر پڑا۔

رب نواز زور سے چیخا۔ ”رام سنگھ!“ اور اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔

ادھر سے بیک وقت تین چار فائر ہوئے۔ ایک گولی رب نواز کا دایاں بازو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ فوراً ہی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

اب دونوں طرف سے فائر شروع ہو گئے۔ ادھر سے فائر جاری تھے مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھا۔ رب نواز نے اپنے جوانوں کو اترنے کا حکم دیا۔ تین فوراً ہی مارے گئے، لیکن افتاں و خیزاں باقی جوان دوسری پہاڑی پر پہنچ گئے۔

رام سنگھ خون میں لت پت پتھریلی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹمٹما اٹھیں۔ مسکرا کر اس نے کہا۔ ”اوئے کمہار کے کھوتے! یہ تو نے کیا کیا؟“

رب نواز، رام سنگھ کا زخم اپنے پیٹ میں محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ مسکرا کر اس پر جھکا اور دو زانو ہو کر اس کی پیٹی کھولنے لگا۔ ”خنزیر کی دُم! تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا۔“

پیٹی اتارے جانے کے دوران سے رام سنگھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ درد سے وہ چلا پڑا۔

جب پیٹی اتر گئی اور رب نواز نے زخم کا معائنہ کیا، جو بہت خطرناک تھا تو رام سنگھ نے رب نوازا کا ہاتھ دبا کر کہا۔ ”میں اپنا تجھے آپ دکھانے کے لئے باہر نکلا تھا کہ تو نے .... اوئے رب نواز کے پُتر، فائر کر دیا۔“

رب نواز کا گلا رندھ گیا۔ ”قسم وحدہ لاشریک کی .... میں نے تو ایسے ہی بندوق چلائی تھی .... مجھے کیا معلوم تھا کہ تو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے .... مجھے افسوس ہے رام سنگھ!“

رام سنگھ کا خون کافی بہہ چکا تھا۔ رب نواز اور اس کے جوان ساتھی کئی گھنٹوں کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ اس عرصے تک تو ایک پوری مشک خون کی خالی ہو سکتی تھی۔

رب نواز کو حیرت تھی کہ اتنی دیر تک رام سنگھ زندہ رہ سکا ہے۔ اس کو امید نہیں تھی کہ وہ بچے گا۔ اسے ہلانا جلانا غلط تھا، چنانچہ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعے پلاٹون کمانڈر سے درخواست کی کہ جلدی ایک ڈاکٹر روانہ کیا جائے، اس کا دوست رام سنگھ زخمی ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کا وہاں تک پہنچنا اور پھر وقت پر پہنچنا بالکل محال تھا۔ رب نواز کو یقین تھا کہ رام سنگھ چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ پھر بھی وائرلیس پر پیغام پہنچا کر اس نے مسکرا کر رام سنگھ سے کہا۔ ”ڈاکٹر آ رہا ہے کوئی فکر نہ کر!“

رام سنگھ بڑی نحیف آواز میں، سوچتے ہوئے بولا۔ ”فکر کس بات کی .... اچھا یہ بتا

میرے کتنے جوان مارے ہیں تم لوگوں نے؟''

رب نواز نے جواب دیا۔ ''صرف ایک۔''

رام سنگھ کی آواز اور زیادہ نحیف ہوگئی۔ ''تیرے کتنے مارے گئے؟''

رب نواز نے جھوٹ بولا۔ ''چھ۔'' اور یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے جوانوں کی طرف دیکھا۔

''چھ ——— چھ!'' رام سنگھ نے ایک ایک آدمی اپنے دل میں گنا۔ ''جب میں زخمی ہوا تو وہ بہت بد دل ہوگئے تھے......... پر میں نے کہا......... کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے......... چھ......... ٹھیک ہے!'' پھر وہ ماضی کے دھندلکوں میں چلا گیا۔ ''رب نواز......... یاد ہیں وہ دن تمھیں؟.........''

اور رام سنگھ نے بیتے دن یاد کرنے شروع کر دیئے۔ کھیتوں کھلیانوں کی باتیں۔ اسکول کے قصے۔ ۹/٦ جاٹ رجمنٹ کی داستانیں ——— کمانڈنگ افسروں کے لطیفے اور باہر کے ملکوں میں اجنبی عورتوں سے معاشقے۔

ان کا ذکر کرتے ہوئے رام سنگھ کو ایک بہت دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ہنسنے لگا تو اس کے ٹیس اٹھی مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ زخم سے اوپر ہی اوپر ہنس کر کہنے لگا۔ ''اوئے سور کے تل......... یاد ہے تمھیں وہ میڈم.........''

رب نواز نے پوچھا۔ ''کون؟''

رام سنگھ نے کہا۔ ''وہ ——— اٹلی کی......... کیا نام رکھا تھا ہم نے اس کا......... بڑی مارخور عورت تھی!''

رب نواز کو فوراً ہی وہ عورت یاد آگئی۔ ''ہاں، ہاں......... وہ......... مڈام منیتا فنیتو......... پیسہ ختم، تماشہ ختم......... پر تجھ سے کبھی کبھی رعایت کر دیتی تھی مسولینی کی بچی!''

رام سنگھ زور سے ہنسا......... اور اس کے زخم پن سے جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا باہر نکل آیا۔ سرسری طور پر رب نواز نے پٹی باندھی تھی وہ کھسک گئی۔ اسے ٹھیک کر کے اس نے رام سنگھ سے کہا۔ ''اب خاموش رہو۔''

رام سنگھ کو بہت تیز بخار تھا۔ اس کا دماغ بھی تپ رہا تھا۔ بولنے کی طاقت نہیں تھی مگر بولے چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی رک جاتا جیسے یہ دیکھ رہا ہو کہ ٹنکی میں کتنا پٹرول باقی ہے۔

کچھ دیر کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، لیکن کچھ ایسے وقفے بھی آتے تھے کہ اس کے ہوش و حواس سلامت ہوتے تھے۔ انہی وقفوں میں اس نے ایک مرتبہ رب نواز سے سوال کیا۔ ''یار! سچ سچ بتا، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیے؟''

رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا۔ ''ہاں رام سنگھا!''

رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا۔ ''نہیں...... میں نہیں مان سکتا...... تمھیں ورغلایا گیا ہے۔''

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔ ''تمھیں ورغلایا گیا ہے...... قسم پنجتن پاک کی......''

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''قسم نہ کھا...... ٹھیک ہی ہو گا۔'' لیکن اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کو رب نواز کی قسم کا یقین نہیں۔

دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے پلاٹون کمانڈنٹ میجر اسلم آیا۔ اس کے ساتھ چند سپاہی تھے، مگر ڈاکٹر نہیں تھا۔

رام سنگھ بے ہوشی اور نزع کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مگر اس کی آواز اس قدر کمزور اور شکستہ تھی کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

میجر اسلم بھی ۶/۹ جاٹ رجمنٹ ہی کا تھا اور رام سنگھ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ رب نواز سے سارے حالات دریافت کرنے کے بعد اس نے رام سنگھ کو بلایا۔ ''رام سنگھ —— رام سنگھ!''

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ پھر آنکھیں پھاڑ کر اس نے ایک لحظے کے لیے غور سے میجر اسلم کی طرف دیکھا اور لیٹے لیٹے اٹینشن ہو کر اس نے سیلوٹ کیا۔ لیکن اس کا سیلوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ جھنجھلا کر اس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ''کچھ نہیں اوئے رام سیاں...... بھول ہی گیا تو سور کے تلا —— کہ یہ لڑائی —— یہ لڑائی......''

رام سنگھ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے رب نواز کی طرف نیم سوالیہ انداز میں دیکھا اور سرد ہو گیا کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

ٹیٹوال کا کُتا

مجموعہ : یزید　　**اشاعت: 1951**　　**معیار: ۴ ستارے**

کئی دن سے طرفین اپنے مورچے پر جمے ہوئے تھے۔ دن میں اِدھر اور اُدھر سے دس بارہ فائر ہو جاتے جن کی آواز کے ساتھ کوئی انسانی چیخ بلند نہیں ہوتی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہوا خودرو پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی اونچائیوں اور ڈھلوانوں پر جنگ سے بے خبر قدرت اپنے مقررہ اشغال میں مصروف تھی۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے تھے۔ پھول اسی طرح کھل رہے تھے اور شہد کی سُست رو مکھیاں اسی پرانے ڈھنگ سے ان پر اونگھ اونگھ کر رس چوستی تھیں۔

جب پہاڑیوں میں کسی فائر کی آواز گونجتی تو چہچہاتے ہوئے پرندے چونک کر اڑنے لگتے۔ جیسے کسی کا ہاتھ ساز کے غلط تار سے جا ٹکرایا ہے اور ان کی سماعت کو صدمہ پہنچانے کا موجب ہوا ہے۔ ستمبر کا انجام اکتوبر کے آغاز سے بڑے گلابی انداز میں بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ موسم سرما اور گرما میں صلح صفائی ہو رہی ہے۔ نیلے نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی ایسے پتلے پتلے اور ہلکے ہلکے بادل یوں تیرتے تھے جیسے اپنے سفید بجروں میں تفریح کر رہے ہیں۔

پہاڑی مورچوں میں دونوں طرف کے سپاہی کئی دن سے بڑی کوفت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی فیصلہ کن بات کیوں وقوع پذیر نہیں ہوتی! اُکتا کر ان کا جی چاہتا تھا کہ موقع بے موقع ایک دوسرے کو شعر سنائیں۔ کوئی نہ سنے تو ایسے ہی گنگناتے رہیں۔ پتھریلی زمین پر اوندھے یا

سیدھے لیٹے رہتے تھے۔ اور جب حکم ملتا تھا ایک دو فائر کر دیتے تھے۔

دونوں کے مورچے بڑی محفوظ جگہ تھے۔ گولیاں پوری رفتار سے آتی تھیں اور پتھروں کی ڈھال کے ساتھ ٹکرا کر وہیں چت ہو جاتی تھیں۔ دونوں پہاڑیاں جن پر یہ مورچے تھے قریب قریب ایک قد کی تھیں۔ درمیان میں چھوٹی سی سبز پوش وادی تھی جس کے سینے پر ایک نالا موٹے سانپ کی طرح لوٹتا رہتا تھا۔

ہوائی جہازوں کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ توپیں ان کے پاس تھیں نہ ان کے پاس، اس لئے دونوں طرف بے خوف و خطر آگ جلائی جاتی تھی۔ ان سے دھوئیں اٹھتے اور ہواؤں میں گھل مل جاتے۔ رات کو چونکہ بالکل خاموشی ہوتی تھی اس لئے کبھی کبھی دونوں مورچوں کے سپاہیوں کو ایک دوسرے کے کسی بات پر لگائے ہوئے قہقہے سنائی دے جاتے تھے۔ کبھی کوئی لہر میں آ کے گانے لگتا تو اس کی آواز رات کے سناٹے کو جگا دیتی۔ ایک کے پیچھے ایک بازگشت صدائیں گونجتیں تو ایسا لگتا کہ پہاڑیاں آموختہ دہرا رہی ہیں۔

چائے کا دور ختم ہو چکا تھا۔ پتھروں کے چولھے میں چیڑ کے ہلکے پھلکے کوئلے قریب قریب سرد ہو چکے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ موسم میں خنکی تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک نہیں تھی۔ جیسے رات کو انہوں نے اپنے عطر دان بند کر لئے تھے البتہ چیڑ کے پسینے یعنی بروزے کی بو تھی مگر یہ بھی کچھ ایسی ناگوار نہیں تھی۔

سب کمبل اوڑھے سو رہے تھے، مگر کچھ اس طرح کہ ہلکے سے اشارے پر اٹھ کر لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔ جمعدار ہرنام سنگھ خود پہرے پر تھا۔ اس کی راسکوپ گھڑی میں دو بجے تو اس نے گنڈا سنگھ کو جگایا اور پہرے پر متعین کر دیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سو جائے، پر جب لیٹا تو آنکھوں سے نیند کو اتنا دور پایا جتنے کہ آسمان کے ستارے تھے —— جمعدار ہرنام سنگھ چت لیٹا ان کی طرف دیکھتا رہا —— اور گنگنانے لگا ——

جتی لینی آں ستاریاں والی۔ ستاریاں والی۔ وے ہرنام سنگھا
ہو یارا، بھاویں تیری مہیں وک جائے

اور ہرنام سنگھ کو آسمان پر ہر طرف ستاروں والے جوتے بکھرے نظر آئے جو جھلمل جھلمل کر رہے تھے ——

جتی لے دوں ستاریاں والی — ستاریاں والی — نی ہرنام کورے ہونارے ، بھاویں میری مہیں وک جائے یہ گا کر وہ مسکرایا۔ پھر یہ سوچ کر کہ نیند نہیں آئے گی، اس نے اٹھ کر سب کو جگا دیا۔ نار کے ذکر نے اس کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اوٹ پٹانگ گفتگو ہو جس سے اس بولی کی ہرنام کوری کیفیت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ باتیں شروع ہوئیں مگر اکھڑی اکھڑی رہیں۔ بنتا سنگھ جوان سب میں کم عمر اور خوش آواز تھا، ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ باقی اپنی بظاہر پُر لطف باتیں کرتے اور جمائیاں لیتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بنتا سنگھ نے ایک دم اپنی پرسوز آواز میں ہیر گانا شروع کر دی ——

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں، کون روٹھڑے یار مناوندائی
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندائی
اک بازتو کانگ نے کونج کھوئی دیکھاں چپ ہے کہ کرلاوندائی
دکھاں والیاں نوں گلاں سکھدیاں نی قصے جوڑ جہان سناوندائی

پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے ہیر کی ان باتوں کا جواب رانجھے کی زبان میں گایا۔

جیہڑے بازتوں کانگ نے کونج کھوئی صبر شکر کر بازفناہ ہویا
اینویں حال ہے اس فقیر دانی دھن مال گیا تے تباہ ہویا
کریں صدق تے کم معلوم ہووے تیرا رب رسول گواہ ہویا
دنیا چھڈ اداسیاں پہن لیاں سید وارثوں ہُن وارث شاہ ہویا

بنتا سنگھ نے جس طرح ایک دم گانا شروع کیا تھا، اسی طرح وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاکستری پہاڑیوں نے بھی اداسیاں پہن لی ہیں۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد کسی غیر مرئی چیز کو موٹی سی گالی دی اور لیٹ گیا۔ دفعتاً رات کے آخری پہر کی اس اداس فضا میں کتے کے بھونکنے کی آواز گونجی۔ سب چونک پڑے۔ آواز قریب سے آئی تھی۔

صوبیدار ہرنام سنگھ نے بیٹھ کر کہا۔ ”یہ کہاں سے آ گیا بھونکو؟“

کتا پھر بھونکا۔ اب اس کی آواز اور بھی نزدیک سے آئی تھی۔ چند لمحات کے بعد دور، جھاڑیوں میں آہٹ ہوئی۔ بنتا سنگھ اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک آوارہ سا کتا تھا جس کی دُم ہل رہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ ”جمعدار صاحب! میں ہُو کمز ادھر بولا تو

کہنے لگا۔ ''میں ہوں چپڑ جھن جھن!''

سب ہنسنے لگے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے کُتے کو پکارا۔ ''ادھر آ چپڑ جھن جھن!''

کتا دم ہلاتا ہرنام سنگھ کے پاس چلا گیا اور یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، زمین کے پتھر سونگھنے لگا۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے تھیلا کھول کر ایک بسکٹ نکالا اور اس کی طرف پھینکا۔ کُتے نے اسے سونگھ کر منہ کھولا، لیکن ہرنام سنگھ نے لپک کر اسے اٹھالیا۔ ''ٹھہر، کہیں پاکستانی تو نہیں!''

سب ہنسنے لگے۔ سردار بنتا سنگھ نے آگے بڑھ کر کُتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور جمعدار ہرنام سنگھ سے کہا۔ ''نہیں جمعدار صاحب چپڑ جھن جھن ہندوستانی ہے۔''

جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا اور کتے سے مخاطب ہوا۔ ''نشانی دکھا اوئے۔''

کتا دم ہلانے لگا۔

ہرنام سنگھ ذرا کھل کے ہنسا۔ ''یہ کوئی نشانی نہیں۔ دم تو سارے کتے ہلاتے ہیں۔''

بنتا سنگھ نے کتے کی لرزاں دم پکڑ لی۔ ''شرنارتھی ہے بیچارہ!''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بسکٹ پھینکا جو کُتے نے فوراً دبوچ لیا۔ ایک جوان نے اپنے بوٹ کی ایڑی سے زمین کھودتے ہوئے کہا۔ ''اب کُتوں کو بھی یا ہندوستانی ہونا پڑے گا یا پاکستانی۔''

جمعدار نے اپنے تھیلے میں سے ایک بسکٹ نکالا اور پھینکا۔ ''پاکستانیوں کی طرح پاکستانی کُتے بھی گولی سے اُڑا دیئے جائیں گے۔''

ایک سپاہی نے زور سے نعرہ بلند کیا۔ ''ہندوستان زندہ باد!''

کتا جو بسکٹ اٹھانے کے لئے آگے بڑھا تھا، ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دم ٹانگوں کے اندر گھس گئی۔ جمعدار ہرنام سنگھ ہنسا۔ ''اپنے نعرے سے کیوں ڈرتا ہے چپڑ جھن جھن ...... کھالے، ایک اور لے۔'' اس نے تھیلے سے ایک اور بسکٹ نکال کر اسے دیا۔

باتوں باتوں میں صبح ہوگئی۔ سورج ابھی نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چار سُو اجالا ہوگیا۔ جس طرح بٹن دبانے سے ایک دم بجلی کی روشنی ہوتی ہے، اسی طرح سورج کی شعاعیں دیکھتے ہی دیکھتے اس پہاڑی علاقے میں پھیل گئیں جس کا نام ٹیٹوال تھا۔ اس علاقے میں کافی دیر سے لڑائی جاری تھی۔ ایک ایک پہاڑی کے لئے درجنوں جوانوں کی جان جاتی تھی، پھر بھی قبضہ غیر یقینی ہوتا

تھا۔ آج یہ پہاڑی ان کے پاس ہے کل دشمن کے پاس، پرسوں پھر ان کے قبضے میں۔ اس سے دوسرے روز وہ پھر دوسروں کے پاس چلی جاتی تھی۔

صوبیدار ہرنام سنگھ نے دوربین لگا کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ سامنے پہاڑی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ چائے وغیرہ تیار ہو رہی ہے۔ ادھر بھی ناشتے کی فکر ہو رہی تھی۔ آگ سلگائی جا رہی تھی ادھر والوں کو بھی یقیناً ادھر سے دُھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتے پر سب جوانوں نے تھوڑا تھوڑا کتے کو دیا جو اس نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ سب اس سے دلچسپی لے رہے تھے، جیسے وہ اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے آنے سے کافی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہر ایک اس کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پچکار کر ''چپڑ جھن جھن'' کے نام سے پکارتا اور اسے پیار کرتا۔

شام کے قریب دوسری طرف پاکستانی مورچے میں صوبیدار ہمت خان اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو جن سے بے شمار کہانیاں وابستہ تھیں، مروڑے دے کر ٹیٹوال کے نقشے کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وائرلیس آپریٹر بیٹھا تھا اور صوبیدار ہمت خان کے لئے پلاٹون کمانڈر سے ہدایات وصول کر رہا تھا۔ کچھ دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے اور اپنی بندوق لئے بشیر ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

چن کتھے گوائی آئی رات دے —— چن کتھے گوائی آئی.........

بشیر نے مزے میں آ کر آواز ذرا اونچی کی تو صوبیدار ہمت خان کی کڑک آواز بلند ہوئی۔ ''اوئے کہاں رہا ہے تو رات بھر؟''

بشیر نے سوالیہ نظروں سے ہمت خان کو دیکھنا شروع کیا۔ جو بشیر کے بجائے کسی اور سے مخاطب تھا۔ ''بتا اوئے!''

بشیر نے دیکھا کچھ فاصلے پر وہ آوارہ کتا بیٹھا تھا جو کچھ دن ہوئے ان کے مورچے میں بن بلائے مہمان کی طرح آیا تھا اور وہیں ٹک گیا تھا۔ بشیر مسکرایا اور کتے سے مخاطب ہو کر بولا ——

''چن کتھے گوائی آئی رات دے —— چن کتھے گوائی آئی؟''

کتے نے زور سے دُم ہلانا شروع کی جس سے پتھریلی زمین پر جھاڑو سی پھرنے لگی۔

صوبیدار ہمت خاں نے ایک کنکر اٹھا کر کُتّے کی طرف پھینکا۔ ''سالے کو دُم ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔''

بشیر نے ایک دم کُتّے کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اس کی گردن میں کیا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ اٹھا، مگر اس سے پہلے ایک اور جوان نے کُتّے کو پکڑ کر اس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی اتاری۔ اس میں گتّے کا ایک ٹکڑا پرویا ہوا تھا جس پر کچھ لکھا تھا۔ صوبیدار ہمت خاں نے یہ ٹکڑا لیا اور اپنے جوانوں سے پوچھا۔ ''لنڈے ہیں۔ جانتا ہے تم میں سے کوئی پڑھنا؟''

بشیر نے آگے بڑھ کر گتّے کا ٹکڑا لیا۔ ''ہاں ـــــ کچھ کچھ پڑھ لیتا ہوں۔'' اور اس نے بڑی مشکل سے حرف جوڑ جوڑ کر یہ پڑھا۔ ''چپ .... جھن .... جھن .... چپڑ جھن جھن .... یہ کیا ہوا؟''

صوبیدار ہمت خاں نے اپنی بڑی بڑی تاریخی مونچھوں کو زبردست مروڑا دیا۔ ''کوڈ ورڈ ہوگا کوئی۔'' پھر اس نے بشیر سے پوچھا۔ ''کچھ اور لکھا ہے بشیرے؟''

بشیر نے جو حروف شناسی میں مشغول تھا، جواب دیا۔ ''جی ہاں .... یہ یہ .... ہند .... ہند .... ہندوستانی .... یہ ہندوستانی کُتّا ہے۔''

صوبیدار ہمت خاں نے سوچنا شروع کیا، ''مطلب کیا ہوا اس کا ـــــــ کیا پڑھا تھا تم نے ـــــ چپڑ؟''

بشیر نے جواب دیا۔ ''چپڑ جھن جھن!''

ایک جوان نے بڑے عاقلانہ انداز میں کہا۔ ''جو بات ہے، اسی میں ہے۔''

صوبیدار ہمت خان کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ ''ہاں، کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔''

بشیر نے گتّے پر لکھی ہوئی پوری عبارت پڑھی۔ ''چپڑ جھن جھن ـــــ یہ ہندوستانی کُتّا ہے۔''

صوبیدار ہمت خان نے وائرلیس سیٹ لیا اور کانوں پر ہیڈفون جما کر پلاٹون کمانڈر سے خود اس کُتّے کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ کیسے آیا تھا۔ کس طرح ان کے پاس کئی دن پڑا رہا، پھر ایکا ایکی غائب ہوگیا اور رات بھر غائب رہا۔ اب آیا ہے تو اس کے گلے میں رسّی نظر آئی جس میں گتّے کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس پر جو عبارت لکھی تھی، وہ اس نے تین چار مرتبہ دوہرا کر پلاٹون

کمانڈر کو سنائی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بشیر الگ کُتے کے پاس بیٹھ کر اسے پچکار کر، کبھی ڈرا کر پوچھتا رہا کہ وہ رات کہاں غائب رہا تھا اور اس کے گلے میں وہ رسّی اور گتے کا ٹکڑا کس نے باندھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ جو سوال کرتا، اس کے جواب میں کُتا اپنی دُم ہلا دیتا۔ آخر غصّے میں آ کر بشیر نے اسے پکڑ لیا اور زور سے جھٹکا دیا۔ کُتا تکلیف کے باعث 'چاؤں چاؤں' کرنے لگا۔

وائرلیس سے فارغ ہو کر صوبیدار ہمت خان نے کچھ دیر نقشے کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور سگریٹ کی ڈبیا کا ڈھکنا کھول کر بشیر کو دیا۔ ''بشیرے لکھ اس پر گورمکھی میں............ان کیڑے مکوڑوں میں............''

بشیر نے سگریٹ کی ڈبیا کا گتا لیا اور پوچھا۔ ''کیا لکھوں صوبیدار صاحب؟''

صوبیدار ہمت خان نے مونچھوں کو مروڑے دے کر سوچنا شروع کیا۔ ''لکھ دے...... بس لکھ دے!''

یہ کہہ کر اس نے جیب سے پنسل نکال کر بشیر کو دی۔ ''کیا لکھنا چاہیے؟''

بشیر پنسل کے منہ کو لب لگا کر سوچنے لگا۔ پھر ایک دم سوالیہ انداز میں بولا۔ ''سپڑ سُن سُن............'' لیکن فوراً ہی مطمئن ہو کر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے ــــ چپڑ جھُن جھُن کا جواب سپڑ سُن سُن ہی ہو سکتا ہے............ کیا یاد رکھیں گے اپنی ماں کے سکھڑے۔''

بشیر نے پنسل سگریٹ کی ڈبیا پر جمائی۔ ''سپڑ سُن سُن!''

''سولہ آنے ــــ لکھ ــ سپ ــــ پڑ ــــ سُن سُن!'' یہ کہہ کر صوبیدار ہمت خاں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''اور آگے لکھ............ یہ پاکستانی کُتا ہے!''

صوبیدار ہمت خاں نے گتا بشیر کے ہاتھ سے لیا۔ پنسل سے اس میں ایک طرف چھید کیا اور رسّی میں پرو کر کُتے کی طرف بڑھا۔ ''لے جا، یہ اپنی اولاد کے پاس!''

یہ سن کر سب جوان ہنسے۔ صوبیدار ہمت خان نے کُتے کے گلے میں رسّی باندھ دی۔ وہ اس دوران میں اپنی دُم ہلاتا رہا۔ اس کے بعد صوبیدار نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو دوست، غدّاری نہ کرنا............ یاد رکھو غدّاری کی سزا موت ہوتی ہے!''

کُتا دُم ہلاتا رہا۔ جب وہ اچھی طرح کھا چکا تو صوبیدار ہمت خان نے رسّی سے پکڑ کر

اس کا رخ پہاڑی کی اکلوتی پگڈنڈی کی طرف پھیرا اور کہا۔ ''جاؤ........ ہمارا خط دشمنوں تک پہنچا دو ——— مگر دیکھو واپس آ جانا ——— یہ تمہارے افسر کا حکم ہے، سمجھے؟''

کُتے نے اپنی دُم ہلائی اور آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن میں جاتی تھی، چلنے لگا۔ صوبیدار ہمت خان نے اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں ایک فائر کیا۔

فائر اور اس کی بازگشت دوسری طرف ہندوستانیوں کے مورچے میں سنی گئی۔ اس کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ جمعدار ہرنام سنگھ معلوم نہیں کس بات پر چڑچڑا ہو رہا تھا، یہ آواز سن کر اور بھی چڑچڑا ہو گیا۔ اس نے فائر کا حکم دے دیا۔ آدھے گھنٹے تک چنانچہ دونوں مورچوں سے گولیوں کی بیکار بارش ہوتی رہی۔ جب اس شغل سے اکتا گیا تو جمعدار ہرنام سنگھ نے فائر بند کرا دیا اور داڑھی میں کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے جالی کے اندر سارے بال بڑے سلیقے سے جمائے اور بنتا سنگھ سے پوچھا۔ ''اوئے بنتاں سیاں! چپڑ جھن جھن کہاں گیا؟''

بنتا سنگھ نے چیڑ کی خشک لکڑی سے بروزہ اپنے ناخنوں سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

''کُتے کو گھی ہضم نہیں ہوا۔''

بنتا سنگھ محاورے کا مطلب نہ سمجھا۔ ''ہم نے تو اسے گھی کی کوئی چیز نہیں کھلائی تھی۔''

یہ سن کر جمعدار ہرنام سنگھ بڑے زور سے ہنسا۔ ''اوئے ان پڑھ! تیرے ساتھ تو بات کرنا پچانوے کا گھاٹا ہے۔''

اتنے میں وہ سپاہی جو پہرے پر تھا اور دوربین لگائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، ایک دم چلاّیا ——

''وہ آ رہا ہے!''

سب چونک پڑے۔ جمعدار ہرنام سنگھ نے پوچھا۔ ''کون؟''

پہرے کے سپاہی نے کہا۔ ''کیا نام تھا اس کا؟ ——— چپڑ جھن جھن!''

''چپڑ جھن جھن!'' یہ کہہ کر جمعدار ہرنام سنگھ اٹھا۔ ''کیا کر رہا ہے؟''

پہرے کے سپاہی نے جواب دیا۔ ''آ رہا ہے۔''

جمعدار ہرنام سنگھ نے دوربین اس کے ہاتھ سے لی اور دیکھنا شروع کیا ———

''ادھر ہی آ رہا ہے........ رسی بندھی ہوئی ہے گلے میں........ لیکن........ یہ تو ادھر سے

آرہا ہے دشمن کے مورچے سے۔'' یہ

کہہ کر اس نے کُتّے کی ماں کو بہت بڑی گالی دی۔ اس کے بعد اس نے بندوق اٹھائی اور شست باندھ کر فائر کیا۔ نشانہ چوک گیا۔ گولی کُتّے سے کچھ فاصلے پر پتھروں کی کرچیں اُڑاتی زمین میں دفن ہوگئی۔ وہ سہم کر رک گیا۔

دوسرے مورچے میں صوبیدار ہمت خان نے دوربین میں سے دیکھا کہ کُتّا پگڈنڈی پر کھڑا ہے۔ ایک اور فائر ہوا تو وہ دُم دبا کر الٹی طرف بھاگا۔ صوبیدار ہمت خان کے مورچے کی طرف۔ وہ زور سے پکارا۔ ''بہادر ڈرا نہیں کرتے .... چل واپس!'' اور اس نے ڈرانے کے لئے ایک فائر کیا۔

کُتّا رک گیا۔ ادھر سے جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق چلائی۔ گولی کُتّے کے کان سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اچھل کر زور زور سے دونوں کان پھڑ پھڑانے شروع کئے۔ ادھر سے صوبیدار ہمت خان نے دوسرا فائر کیا جو اس کے اگلے پنجوں کے پاس پتھروں میں پیوست ہوگیا۔ بوکھلا کر کبھی ادھر دوڑا، کبھی ادھر۔ اس کی اس بوکھلاہٹ سے ہمت خان اور ہرنام دونوں بہت مسرور ہوئے اور خوب قہقہے لگاتے رہے۔ کُتّے نے جمعدار ہرنام سنگھ کے مورچے کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس نے یہ دیکھا تو بڑے تاؤ میں آکر موٹی سی گالی دی اور اچھی طرح شست باندھ کر فائر کیا۔ گولی کُتّے کی ٹانگ میں لگی۔ ایک فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اپنا رخ بدلا۔ لنگڑا لنگڑا کر ہمت خاں کے مورچے کی طرف دوڑنے لگا تو ادھر سے بھی فائر ہوا، مگر وہ صرف ڈرانے کے لئے کیا گیا تھا۔ ہمت خان فائر کرتے ہی چلّایا۔ ''بہادر پرواہ نہیں کیا کرتے زخموں کی...... کھیل جاؤ اپنی جان پر ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ!''

کُتّا فائر سے گھبرا کر مڑا۔ ایک ٹانگ اس کی بالکل بیکار ہوگئی تھی۔ باقی تین ٹانگوں کی مدد سے اس نے خود کو چند قدم دوسری جانب گھسیٹا کہ جمعدار ہرنام سنگھ نے نشانہ تاک کر گولی چلائی جس نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

صوبیدار ہمت خاں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ ''چچ چچ .... شہید ہوگیا بے چارہ!''

جمعدار ہرنام سنگھ نے بندوق کی گرم گرم نالی اپنے ہاتھ میں لی اور کہا۔ ''وہی موت مرا جو کُتّے کی ہوتی ہے!''

☆☆☆

دو قومیں

مجموعہ: خالی بوتلیں خالی ڈبے **اشاعت: ۱۹۵۰** **معیار: ۴ ستارے**

مختار نے شاردا کو پہلی مرتبہ جھرنوں میں سے دیکھا۔ وہ اوپر کوٹھے پر کٹا ہوا پتنگ لینے گیا تو اسے جھرنوں میں سے ایک جھلک دکھائی دی۔ سامنے والے مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی کھلی تھی ایک لڑکی ڈونگا ہاتھ میں لئے نہا رہی تھی۔ مختار کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی، کیونکہ سامنے والے مکان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تھیں، بیاہی جا چکی تھیں۔ صرف روپ کور تھی۔ اس کا پلپلا خاوند کالومل تھا۔ ان کے تین لڑکے تھے اور بس۔

مختار نے پتنگ اٹھایا اور ٹھٹک کے رہ گیا ـــــ لڑکی بہت خوبصورت تھی اس کے ننگے بدن پر سنہرے روئیں تھے۔ ان میں پھنسی ہوئی پانی کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ ہلکا سانولا تھا۔ سانولا بھی نہیں۔ تانبے کے رنگ جیسا۔ پانی کی ننھی ننھی بوندیں ایسی لگتی تھیں جیسے اس کا بدن پگھل کر قطرے قطرے بن کر گر رہا ہے۔

مختار نے جھرنے کے سوراخوں کے ساتھ اپنی آنکھیں جما دیں اور اس لڑکی کو جو ڈونگا ہاتھ میں لئے نہا رہی تھی، دلچسپی اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی تھی گیلے سینے پر اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں جن پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے بڑی دلفریب تھیں۔ اس کو دیکھ کر مختار کے دل و دماغ میں سفلی جذبات پیدا نہ ہوئے۔ ایک جوان، خوبصورت اور بالکل ننگی لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ مختار کے اندر شہوانی ہیجان برپا ہو جاتا، مگر وہ بڑے ٹھنڈے انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا، جیسے کسی مصور کی تصویر دیکھ رہا ہو۔

لڑکی کے نچلے ہونٹ کے اختتامی کونے پر بڑا سا تل تھا —— بے حد متین بے حد سنجیدہ، جیسے وہ اپنے وجود سے بے خبر ہے، لیکن دوسرے اس کے وجود سے آگاہ ہیں، صرف اس حد تک کہ اسے وہیں ہونا چاہئے تھا جہاں کہ وہ تھا۔ بانہوں پر سنہرے روئیں پانی کی بوندوں کے ساتھ لپٹے ہوئے چمک رہے تھے۔ اس کے سر کے بال سنہرے نہیں، بھوسلے تھے جنہوں نے شاید سنہرے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جسم سڈول اور گدرایا ہوا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مختار دیر تک جھرنے کے ساتھ آنکھیں جمائے رہا۔

لڑکی نے بدن پر صابن ملا۔ مختار تک اس کی خوشبو پہنچی۔ سلونے تانبے جیسے رنگ والے بدن پر سفید سفید جھاگ بڑے سہانے معلوم ہوتے تھے۔ پھر جب یہ جھاگ پانی کے بہاؤ سے پھسلے تو مختار نے محسوس کیا جیسے اس لڑکی نے اپنا بلبلوں کا لباس بڑے اطمینان سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر لڑکی نے تولئے سے اپنا بدن پونچھا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ کپڑے پہنے۔ کھڑکی کے ڈنڈے پر دونوں ہاتھ رکھے اور سامنے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں شرماہٹ کی جھیلوں میں غرق ہو گئیں۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ مختار بے اختیار ہنس پڑا۔

لڑکی نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھولے اور بڑے غصّے میں جھرنے کی طرف دیکھا۔ مختار نے کہا۔ ”میں قصوروار بالکل نہیں —— آپ کیوں کھڑکی کھول کر نہا رہی تھیں؟“

لڑکی نے کچھ نہ کہا، غیض آلود نگاہوں سے جھرنے کو دیکھا اور کھڑکی بند کر لی۔

چوتھے دن روپ کور آئی۔ اس کے ساتھ یہی لڑکی تھی۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں سلائی اور کروشیئے کے کام کی ماہر تھیں۔ گلی کی اکثر لڑکیاں ان سے یہ کام سیکھنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ روپ کور بھی اس لڑکی کو اسی غرض سے لائی تھی کیونکہ اس کو کروشیئے کے کام کا بہت شوق تھا۔ مختار اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو اس نے روپ کور کو پرنام کیا۔ لڑکی پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ سمٹ سی گئی۔ مختار مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔

لڑکی روزانہ آنے لگی، مختار کو دیکھتی تو سمٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کا یہ ردِ عمل دُور ہوا اور اس کے دماغ سے یہ خیال کسی قدر محو ہوا کہ مختار نے اسے نہاتے دیکھا تھا۔

مختار کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شاردا ہے۔ روپ کور کے چچا کی لڑکی ہے، یتیم ہے چچو کی

ملیاں میں ایک غریب رشتہ دار کے ساتھ رہتی تھی۔ روپ کور نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ انٹرنس پاس ہے۔ بڑی ذہین ہے، کیونکہ اس نے کروشئے کا مشکل سے مشکل کام یوں چٹکیوں میں سیکھ لیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اس دوران میں مختار نے محسوس کیا کہ وہ شاردا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہوا۔ جب مختار نے اس کو پہلی بار جھرنے میں سے دیکھا تھا تو اس وقت اس کے سامنے ایک نظارہ تھا ——— بڑا فرحت ناک نظارہ۔ لیکن اب شاردا آہستہ آہستہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے، اس لئے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مختار نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے محبت کے جذبے کو مٹا نہ سکا۔ شاردا اب اس سے باتیں کرنے لگی تھی مگر کھل کے نہیں۔ اس کے دماغ میں مختار کو دیکھتے ہی یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ وہ ننگی نہا رہی تھی اور مختار جھرنے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ایک روز گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں کسی عزیز کے چالیسویں پر گئی ہوئی تھیں۔ شاردا حسب معمول اپنا تھیلا اٹھائے صبح دس بجے آئی۔ مختار صحن میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ شاردا نے اس سے پوچھا ”بہن جی کہاں ہیں؟“

مختار کے ہاتھ کانپنے لگے ”وہ۔ وہ کہیں باہر گئی ہے“۔

شاردا نے پوچھا ”ماتا جی؟“۔

مختار اٹھ کر بیٹھ گیا ”وہ ——— وہ بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہیں۔“

”اچھا!“ یہ کہہ کر شاردا نے کسی قدر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے مختار کو دیکھا اور نمستے کر کے چلنے لگی۔ مختار نے اس کو روکا۔ ”ٹھہرو شاردا؟“

شاردا کو جیسے بجلی کے کرنٹ نے چھو لیا۔ چونک کر رک گئی۔ ”جی؟“

مختار چارپائی سے اٹھا ”بیٹھ جاؤ ——— وہ لوگ ابھی آجائیں گے!“

”جی نہیں ——— میں جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر بھی شاردا کھڑی رہی۔

مختار نے بڑی جرأت سے کام لیا، آگے بڑھا، اس کی ایک کلائی پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مختار اور شاردا دونوں کو ایک لحظے کے لئے بالکل پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد دونوں لرزنے لگے۔ مختار نے صرف اتنا کہا۔ ”مجھے معاف کر دینا!“

شاردا خاموش کھڑی رہی۔ اس کا تانبے جیسا رنگ سرخی مائل ہو گیا۔ ہونٹوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی، جیسے وہ چھیڑے جانے پر شکایت کر رہے ہیں۔ مختار اپنی حرکت اور اس کے نتائج بھول گیا۔ اس نے ایک بار پھر شاردا کو اپنی طرف کھینچا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا ــــــ شاردا نے مزاحمت نہ کی۔ وہ صرف مجسمۂ حیرت بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سوال بن گئی تھی ــــ ایک ایسا سوال جو اپنے آپ سے کیا گیا ہو۔ وہ شاید خود سے پوچھ رہی تھی یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ــــ کیا اسے ہونا چاہئے تھا ــــ کیا ایسا کسی اور سے بھی ہوا ہے؟

مختار نے اسے چارپائی پر بٹھا لیا اور پوچھا۔ ”تم بولتی کیوں نہیں ہو شاردا؟“

شاردا کے دوپٹے کے پیچھے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مختار کو اس کا یہ سکوت بہت پریشان کن محسوس ہوا۔ ”بولو شاردا ــــ اگر تمہیں میری یہ حرکت بُری لگی ہے تو کہہ دو ــــ خدا کی قسم میں معافی مانگ لوں گا ــــ تمہاری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔ میں نے کبھی ایسی جرأت نہ کی ہوتی لیکن جانے مجھے کیا ہو گیا ہے ــــ دراصل ــــ دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔“

شاردا کے ہونٹ ہلے۔ جیسے انہوں نے لفظ محبت ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختار نے بڑی گرمجوشی سے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے معلوم نہیں تم محبت کا مطلب سمجھتی ہو کہ نہیں ــــ میں خود اس کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہیں چاہتا ہوں ــــ تمہاری ساری ہستی کو اپنی اس مٹھی میں لے لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں اپنی ساری زندگی تمہارے حوالے کر دوں گا ــــ شاردا تم بولتی کیوں نہیں ہو؟

شاردا کی آنکھیں خواب گوں ہو گئیں۔ مختار نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ ”میں نے اس روز جھرنے میں سے تمہیں دیکھا۔ نہیں تم مجھے خود دکھائی دیں ــــ وہ ایک ایسا نظارہ تھا جو میں تا قیامت نہیں بھول سکتا ــــ تم شرماتی کیوں ہو؟ ــــ میری نگاہوں نے تمہاری خوبصورتی چرائی تو نہیں ــــ میری آنکھوں میں صرف اس نظارے کی تصویر ہے ــــ تم اسے زندہ کر دو تو میں تمہارے پاؤں چوم لوں گا۔“ یہ کہہ کر مختار نے شاردا کا ایک پاؤں چوم لیا۔

وہ کانپ گئی۔ چارپائی پر سے ایک دم اُٹھ کر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”یہ آپ کیا

کر رہے ہیں؟ — ہمارے دھرم میں —"

مختار خوشی سے اُچھل پڑا" دھرم ورم کو چھوڑو — پریم کے دھرم میں سب ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر اس نے شاردا کو چومنا چاہا مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹی اور بڑے شرمیلے انداز میں مسکراتی بھاگ گئی۔ مختار نے چاہا کہ وہ اڑ کر ممٹی پر پہنچ جائے۔ وہاں سے نیچے صحن میں کودے اور ناچنا شروع کردے۔

مختار کی والدہ اور بہن آگئیں تو شاردا آئی۔ مختار کو دیکھ کر اس نے فوراً نگاہیں نیچی کرلیں۔ مختار وہاں سے کھسک گیا کہ راز افشا نہ ہو۔

دوسرے روز اوپر کوٹھے پر چڑھا۔ جھرنے میں سے جھانکا تو دیکھا کہ شاردا کھڑکی کے پاس کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ مختار نے اس کو آواز دی۔ "شاردا"

شاردا چونکی، کنگھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گلی میں جا گری۔ مختار ہنسا۔ شاردا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مختار نے اس سے کہا۔ "کتنی ڈرپوک ہو تم — ہولے سے آواز دی اور تمہاری کنگھی چھوٹ گئی۔"

شاردا نے کہا۔ "اب لا کے دیجیے نئی کنگھی مجھے — یہ تو موری میں جا گری ہے۔"

مختار نے جواب دیا "ابھی لاؤں؟"

شاردا نے فوراً کہا۔ "نہیں نہیں — میں نے تو مذاق کیا ہے۔"

"میں نے بھی مذاق کیا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر میں کنگھی لینے جاتا؟ — کبھی نہیں!" شاردا مسکرائی۔ "میں بال کیسے بناؤں؟"

مختار نے جھرنے کے سوراخوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں "یہ میری انگلیاں لے لو!"

شاردا ہنسی — مختار کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری عمر اس ہنسی کی چھاؤں میں گزار دے۔

"شاردا، خدا کی قسم تم ہنسی ہو میرا رواں رواں شاد ماں ہو گیا ہے — تم کیوں اتنی پیاری ہو؟ — کیا دنیا میں کوئی اور لڑکی بھی تم جیسی پیاری ہوگی؟ — یہ کم بخت جھرنے — یہ مٹی کے ذلیل پردے، جی چاہتا ہے ان کو توڑ پھوڑ دوں"۔

شاردا پھر ہنسی۔ مختار نے کہا۔ "یہ ہنسی کوئی اور نہ دیکھے، کوئی اور نہ سُنے شاردا۔ صرف میرے سامنے ہنسنا — اور اگر کبھی ہنسنا ہو تو مجھے بلا لیا کرو — میں اس کے ارد گرد اپنے

ہونٹوں کی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔“

شاردا نے کہا۔ ”آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔“

”تو مجھے انعام دو ـــ محبت کی ایک ہلکی سی نگاہ ان جھرنوں سے میری طرف پھینک دو ـــ میں اسے اپنی پلکوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں میں چھپا لوں گا۔“

مختار نے شاردا کے عقب میں دُور ایک سایہ سا دیکھا اور فوراً جھرنے سے ہٹ گیا تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو کھڑکی خالی تھی۔ شاردا جا چکی تھی۔

آہستہ آہستہ مختار اور شاردا دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ تنہائی کا موقعہ ملتا تو دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے رہتے ـــ ایک دن روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالومل کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مختار گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کو ایک کنکر لگا۔ اس نے اوپر دیکھا شاردا تھی ـــ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

مختار اس کے پاس پہنچ گیا۔ پورا تخلیہ تھا، خوب گھل مل کے باتیں ہوئیں۔ مختار نے اس سے کہا۔ ”اس روز مجھ سے گستاخی ہوئی تھی اور میں نے معافی مانگ لی تھی۔ آج پھر گستاخی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن معافی نہیں مانگوں گا۔“ اور اپنے ہونٹ شاردا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

شاردا نے شرمیلی شرارت سے کہا۔ ”اب معافی مانگئے۔“

”جی نہیں ـــ اب یہ ہونٹ آپ کے نہیں ـــ میرے ہیں ـــ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟“

شاردا نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔ ”یہ ہونٹ کیا، میں ہی آپ کی ہوں۔“

مختار ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”دیکھو شاردا۔ ہم اس وقت ایک آتش فشاں پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ تم سوچ لو، سمجھ لو ـــ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی ـــ میں قسم کھاتا ہوں کہ زندگی بھر میں تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ثابت قدم رہے گی ـــ کیا تم بھی اس کا عہد کرتی ہو!“

شاردا نے اپنی نگاہیں اٹھا کر مختار کی طرف دیکھا۔ ”میرا پریم سچا ہے۔“

مختار نے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور کہا۔ ”زندہ رہو ـــ صرف میرے لیے،

میری محبت کے لئے وقف رہو — خدا کی قسم شاردا۔ اگر تمہارا التفات مجھے نہ ملتا تو میں یقیناً خودکشی کر لیتا — تم میری آغوش میں ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی خوشیوں سے میری جھولی بھری ہوئی ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔‘‘

شاردا نے اپنا سر مختار کے کندھے پر گرا دیا۔ ’’آپ باتیں کرنا جانتے ہیں — مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی جاتی۔‘‘

دیر تک دونوں ایک دوسرے میں مدغم رہے، جب مختار وہاں سے گیا تو اس کی روح ایک نئی اور سہانی لذت سے معمور تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا دوسرے دن کلکتے چلا گیا۔ جہاں اس کا باپ کاروبار کرتا تھا۔ آٹھ دن کے بعد واپس آیا۔ شاردا حسب معمول کروشیہ کا کام سیکھنے مقررہ وقت پر آئی۔ اس کی نگاہوں نے اس کے لئے کئی باتیں کیں۔ کہاں غائب رہے اتنے دن؟ — مجھ سے کچھ نہ کہا اور کلکتے چلے گئے؟ — محبت کے بڑے دعوے کرتے تھے — میں نہیں بولوں گی تم سے — میری طرف کیا دیکھتے ہو، کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے؟

مختار بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تنہائی نہیں تھی۔ وہ کافی طویل گفتگو اس سے کرنا چاہتا تھا۔ دو دن گزر گئے، موقعہ نہ ملا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں گونگی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر تیسرے روز شاردا نے اسے بلایا۔ مختار بہت خوش ہوا۔ روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالومل گھر میں نہیں تھے۔

شاردا سیڑھیوں میں ملی۔ مختار نے وہیں اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا چاہا، وہ تڑپ کر اوپر چلی گئی۔ ناراض تھی۔ مختار نے اس سے کہا۔ ’’دیکھو میری جان میرے پاس بیٹھو، میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں جن کا ہماری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔‘‘

شاردا اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی، تم بات ٹالو نہیں — بتاؤ مجھے بتائے بغیر کلکتے کیوں گئے — سچ، میں بہت روئی۔‘‘

مختار نے بڑھ کر اس کی آنکھیں چومیں۔ ’’اس روز میں جب گیا تو ساری رات سوچتا رہا — جو کچھ اس روز ہوا اس کے بعد یہ سوچ بچار لازمی تھی۔ ہماری حیثیت میاں بیوی کی نہ تھی۔ میں نے غلطی کی۔ تم نے کچھ نہ سوچا — ہم نے ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کر لیں اور غور ہی نہ کیا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے — سمجھ رہی ہو نا شاردا؟‘‘

شاردا نے آنکھیں جھکا لیں۔ ''جی ہاں۔''

''میں کلکتے اس لئے گیا تھا کہ ابا جی سے مشورہ کروں۔ تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے ان کو راضی کر لیا ہے۔'' مختار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا۔ ''میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے ـــــ میں اب تم سے شادی کر سکتا ہوں۔''

شاردا نے ہولے سے کہا۔ ''شادی!''

''ہاں شادی۔''

شاردا نے پوچھا۔ ''کیسے ہو سکتی ہے ہماری شادی؟''

مختار مسکرایا۔ ''اس میں مشکل ہی کیا ہے ـــــ تم مسلمان ہو جانا!''

شاردا ایک دم چونکی۔ ''مسلمان!''

مختار نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''ہاں ہاں ـــــ اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے ـــــ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر والے بڑا ہنگامہ مچائیں گے، لیکن میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے غائب ہو جائیں گے، سیدھے کلکتے چلیں گے۔ باقی کام ابا جی کے سپرد ہے۔ جس روز وہاں پہنچیں گے اسی روز مولوی بلا کر تمہیں مسلمان بنا دیں گے۔ شادی بھی اسی وقت ہو جائے گی۔''

شاردا کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیئے۔ مختار نے اس کی طرف دیکھا ـــــ ''خاموش کیوں ہو گئیں؟''

شاردا کچھ نہ بولی۔ مختار کو بڑی الجھن ہوئی۔ ''بتاؤ شاردا کیا بات ہے؟''

شاردا نے بمشکل اتنا کہا۔ ''تم ہندو ہو جاؤ۔''

''میں ہندو ہو جاؤں؟ مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ ہنسا ''میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں؟''

میں کیسے مسلمان ہو سکتی ہوں؟'' شاردا کی آواز مدھم تھی۔

''تم کیوں مسلمان نہیں ہو سکتیں ـــــ میرا مطلب ہے کہ ـــــ تم مجھ سے

محبت کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اسلام سب سے اچھا مذہب ہے ــــــ ہندو مذہب بھی کوئی مذہب ہے۔ گائے کا پیشاب پیتے ہیں۔ بُت پوجتے ہیں ــــ میرا مطلب ہے کہ ٹھیک ہے اپنی جگہ یہ مذہب بھی۔ مگر اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔” مختار کے خیالات پریشان تھے۔ “تم مسلمان ہو جاؤ گی تو بس ــــــ میرا مطلب ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔”

شاردا کے چہرے کا تانبے جیسا رنگ زرد پڑ گیا۔ “آپ ہندو نہیں ہوں گے؟”

مختار ہنسا۔ “پاگل ہو تم؟”

شاردا کا رنگ اور زرد پڑ گیا۔ “آپ جائیے ــــ وہ لوگ آنے والے ہیں۔” یہ کہہ کر وہ پلنگ پر سے اٹھی۔

مختار متحیر ہو گیا۔ “لیکن شاردا ــــ”

“نہیں نہیں، جائیے آپ ــــــــ جلدی جائیے ــــــ وہ آ جائیں گے۔” شاردا کے لہجے میں بے اعتنائی کی سردی تھی۔

مختار نے اپنے خشک حلق سے بہ مشکل یہ الفاظ نکالے۔ “ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شاردا تم ناراض کیوں ہو گئیں؟”

“جاؤ ــــ چلے جاؤ ــــ ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے ــــ تم مسلمان بہت اچھے ہو۔” شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

مختار اپنا اسلام سینے میں دبائے وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

شاہ دولے کا چوہا

اشاعت: ادبِ لطیف (لاہور) جولائی: ۱۹۵۴ معیار: ۴ ستارے

سلیمہ کی جب شادی ہوئی تو وہ اکیس برس کی تھی۔

پانچ برس ہو گئے مگر اس کے اولاد نہ ہوئی — اس کی ماں اور ساس کو بہت فکر تھی۔ ماں کو زیادہ تھی، اس لئے وہ سوچتی، کہیں سلیمہ کا خاوند نجیب دوسری شادی نہ کر لے۔ چنانچہ کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا، مگر کوئی بات پیدا نہ ہوئی۔

سلیمہ خود بہت متفکر تھی — شادی کے بعد بہت کم لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اولاد کی خواہش مند نہ ہوں — اس نے اپنی ماں سے کئی بار مشورہ کیا اور ماں کی ہدایتوں پر بھی عمل کیا مگر نتیجہ صفر نکلا۔

ایک دن سلیمہ کی ایک سہیلی، جو بانجھ قرار دے دی گئی تھی، بہت عرصے کے بعد اس کے پاس آئی — سلیمہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس کی سہیلی کی گود میں ایک گل گوتھنا لڑکا ہے۔

اس نے بڑے بینڈے انداز میں پوچھا۔ "فاطمہ، تمہارے یہ لڑکا کیسے پیدا ہو گیا؟"

فاطمہ اس سے پانچ سال بڑی تھی — اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ شاہ دولے صاحب کی برکت ہے...... مجھ سے ایک عورت نے کہا تھا۔ اگر اولاد چاہتی ہو تو گجرات جا کر شاہ دولے کے مزار پر منت مانو اور کہو کہ حضور، جو پہلا بچہ پیدا ہو گا، وہ آپ کی خانقاہ پر چڑھاوے کے طور پر چڑھا دیا جائے گا......"

فاطمہ نے سلیمہ کو یہ بھی بتایا کہ جب شاہ دولے صاحب کے مزار پر ایسی منت مانی جاتی ہے تو پہلا بچہ ایسا پیدا ہوتا ہے۔ جس کا سر بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ اور وہ پہلا بچہ اس خانقاہ میں چھوڑ

آنا پڑتا ہے۔

سلیمہ کو فاطمہ کی بات پسند نہ آئی اور اس کو دُکھ بھی ہوا ــــ اس نے سوچا۔ ’’کون ایسی ماں ہے جو اپنے بچّے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گی، اس کا سر چھوٹا ہو، یا ناک چپٹی ہو، یا آنکھیں بھینگی ہوں...... ماں اپنے بچّے کو گھورے میں نہیں پھینک سکتی...... ایسا تو کوئی ڈائن ہی کر سکتی ہے......!‘‘

لیکن اسے اولاد چاہئے تھی، اس لئے وہ اپنی عمر سے بڑی سہیلی کی بات مان گئی، جو گجرات کی رہنے والی تھی۔ اور جہاں شاہ دولے کا مزار تھا۔

سلیمہ نے اپنے خاوند سے کہا۔ ’’فاطمہ مجھے مجبور کر رہی ہے کہ اس کے ساتھ چلوں...... آپ اجازت دے دیجئے۔‘‘

اس کے خاوند کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا ــــ اس نے کہا۔ ’’جاؤ، مگر جلد لوٹ آنا۔‘‘

آخر سلیمہ ایک دن فاطمہ کے ساتھ گجرات چلی گئی۔

شاہ دولے کا مزار، جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا، کوئی عہدِ عتیق کی عمارت نہیں تھی ــــ اچھی خاصی جگہ تھی جو اس کو پسند آئی، مگر جب اس نے ایک حجرے میں شاہ دولے کے چوہے دیکھے، جن کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا تھا اور جن کا دماغ بالکل ماؤف تھا تو وہ کانپ کانپ گئی۔

وہاں اس نے ایک جوان لڑکی دیکھی ــــ پورے شباب پر ــــ جو ایسی حرکتیں کر رہی تھی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی کو بھی ہنسی آ جاتی۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ہنسی، مگر دوسرے لمحے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ سوچنے لگی۔ اس لڑکی کا کیا ہوگا...... یہاں کے مجاور اسے کسی کے پاس بیچ دیں گے جو اسے بندریا بنا کر شہر بہ شہر پھرائیں گے...... یہ غریب ان کی روزی کا ٹھیکرا بن جائے گی۔

اس لڑکی کا سر بہت چھوٹا تھا۔

سلیمہ نے سوچا۔ ’’اگر سر چھوٹا ہے تو انسان کی فطرت تو اتنی چھوٹی نہیں...... وہ تو پاگلوں کے ساتھ بھی چمٹی رہتی ہے۔‘‘

اس شاہ دولے کی چوہیا کا جسم بہت خوب صورت تھا۔ اس جسم کی ہر قوس اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھی، مگر اس کی حرکات ایسی تھیں جیسے اس کے حواس کسی خاص غرض کے ماتحت

تحمل کر دیئے گئے ہوں۔ وہ اس طریقے سے چلتی پھرتی اور ہنستی تھی جیسے وہ کوئی کوک بھرا کھلونا ہو۔

سلیمہ نے محسوس کیا کہ وہ اسی غرض کے لئے بنائی گئی ہے۔

ان تمام احساسات کے باوجود اس نے اپنی سہیلی فاطمہ کے کہنے پر شاہ دولے صاحب کے مزار پر منت مانگی کہ اگر اس کے بچہ ہوا تو وہ ان کی نذر کر دے گی۔

ڈاکٹری علاج سلیمہ نے جاری رکھا ـــــ دو ماہ کے بعد بچے کی پیدائش کے آثار پیدا ہو گئے۔

وہ بہت خوش ہوئی ـــــ مقررہ وقت پر اس کے لڑکا ہوا۔

حمل کے دوران میں چونکہ چاند گرہن لگا تھا، اس لئے لڑکے کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبہ تھا، جو بُرا نہیں لگتا تھا۔

فاطمہ نے آتے ہی کہا کہ اس بچے کو فوراً شاہ دولے صاحب کے حوالے کر دینا چاہیے۔

سلیمہ نے خود یہی منت مانی تھی ـــــ کئی دنوں تک وہ ٹال مٹول کرتی رہی ـــ اس کی ممتا نہیں مانتی تھی کہ وہ اپنا لختِ جگر وہاں پھینک آئے۔

اس سے کہا گیا تھا کہ شاہ دولے صاحب سے جو اولاد مانگتا ہے، اس کے پہلے بچے کا سر چھوٹا ہوتا ہے، اس کے لڑکے کا سر کافی بڑا تھا۔

فاطمہ نے کہا۔ ”یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تم بہانے کے طور پر استعمال کر سکو...... تمہارا یہ پہلا بچہ شاہ دولے صاحب کی ملکیت ہے اور اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے...... اگر تم اپنے وعدے سے پھر گئیں تو تم پر ایسا عذاب نازل ہو گا کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔“

سلیمہ ڈر گئی۔

بادلِ نخواستہ اس کو اپنا پیارا گُل گوتھنا سا بیٹا، جس کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبہ تھا، گجرات جا کر شاہ دولے صاحب کے مزار کے مجاوروں کے حوالے کرنا پڑا۔

وہ اس قدر روئی، اس کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گئی اور ایک برس تک زندگی اور موت کے درمیان معلق رہی ـــــ اس کو اپنا بچہ بھولتا ہی نہیں تھا، خاص طور پر اس کے داہنے گال کا چھوٹا سا دھبہ جس کو وہ اکثر چوما کرتی تھی کہ اس کو بہت اچھا لگتا تھا ـــــ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے بچے کو فراموش نہ کیا۔

وہ عجیب عجیب خواب دیکھتی ـــــ شاہ دولے کا چھوٹے سر والا چوہا اس کے پریشان تصوّر میں ایک بہت بڑا چوہا بن کر نمودار ہوتا جو اس کے گوشت کو اپنے تیز دانتوں سے کترتا ـــــ وہ چیختی اور اپنے خاوند سے کہتی۔ ”مجھے بچائیے...... دیکھیے چوہا میرا گوشت کھا رہا ہے۔“

کبھی اس کا مضطرب دماغ یہ سوچتا کہ اس کا بچہ چوہا بِل کے اندر داخل ہو رہا ہے؛ وہ اس کی دُم کھینچ رہی ہے؛ مگر بل کے اندر کے بڑے چوہوں نے اس کی تھوتھنی پکڑ لی ہے، اس لئے وہ اسے باہر نہیں نکال سکتی۔

کبھی اس کی نظروں کے سامنے وہ لڑکی آجاتی جو پورے شباب پر تھی اور جس کو اس نے شاہ دولے صاحب کے مزار کے ایک حجرے میں دیکھا تھا ـــــ وہ ہنسنا شروع کر دیتی، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد رونے لگتی؛ اتنا روتی کہ اس کے خاوند کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اس کے آنسو کیسے خشک کرے۔

سلیمہ کو ہر جگہ چوہے نظر آتے تھے ـــــ بستر پر، باورچی خانے میں، غسل خانے کے اندر، صوفے پر، دل میں، کانوں میں ـــــ بعض اوقات تو وہ یہ محسوس کرتی کہ وہ خود ایک چوہیا ہے؛ اس کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا ہے اور وہ شاہ دولے کے مزار کے ایک حجرے میں اپنا چھوٹا، بہت ہی چھوٹا سر اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے ایسی حرکات کر رہی ہے کہ دیکھنے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔

اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔

اس کو فضا میں دھبے ہی دھبے نظر آتے، جیسے ایک بہت بڑا گال ہے، جس پر سورج بجھ کر ٹکڑے ہو کے جگہ جگہ جم گیا ہے۔

سلیمہ کا بخار ہلکا ہوا تو اس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔

نجیب قدرے مطمئن ہو گیا ـــــ اس کو معلوم تھا کہ اس کی بیوی کی علالت کا باعث کیا ہے۔ وہ ضعیف الاعتقاد تھا۔ اس کو اپنی پہلی اولاد کے بھینٹ چڑھانے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ جو کچھ کیا گیا تھا، وہ اسے بالکل مناسب سمجھتا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے جو بیٹا ہوا تھا، وہ اس کا نہیں شاہ دولے صاحب کا تھا۔

جب سلیمہ کا بخار بالکل اُتر گیا اور اس کے دل و دماغ کا طوفان ٹھنڈا پڑ گیا تو نجیب نے اس سے کہا۔ "میری جان، اپنے بچّے کو بھول جاؤ...... وہ صدقے کا تھا۔"

سلیمہ نے بڑے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں نہیں مانتی ...... ساری عمر میں اپنی ممتا پر لعنتیں بھیجتی رہوں گی کہ میں نے اتنا بڑا گناہ کیوں کیا...... میں نے اپنا لختِ جگر اس مزار کے مجاوروں کے حوالے کیوں کیا...... وہ مجاور ماں تو نہیں ہو سکتے۔"

ایک دن وہ غائب ہو گئی اور سیدھی گجرات جا پہنچی۔

وہ سات آٹھ روز تک وہاں رہی —— اس نے اپنے بچّے کے متعلق بہت پوچھ گچھ کی مگر کوئی اتا پتا نہ ملا۔

وہ مایوس ہو کر واپس آ گئی اور اس نے اپنے خاوند سے کہا۔ "میں اب اپنے بچّے کو یاد نہیں کروں گی۔"

یاد تو وہ کرتی رہی، لیکن دل ہی دل میں —— اس کے بچّے کے داہنے گال کا چھوٹا سا دھبہ اس کے دل کا داغ بن کے رہ گیا تھا۔

ایک برس کے بعد اس کے لڑکی ہوئی —— لڑکی کی شکل اس کی پہلوٹھی کے لڑکے سے بہت ملتی جلتی تھی، لیکن اس کے داہنے گال پر داغ نہیں تھا۔

اس نے لڑکی کا نام مجیبہ رکھا، کیونکہ اس نے اپنے بیٹے کا نام مجیب سوچا تھا۔

جب اس کی لڑکی دو مہینے کی ہوئی تو اس نے اسے گود میں اٹھایا اور سرمے دانی سے تھوڑا سا سرمہ نکال کر اس کے داہنے گال پر ایک بڑا سا تل بنا دیا اور اپنے بیٹے کو یاد کر کے رونے لگی —— اس کے آنسو بچّی کے گالوں پر گرے تو اس نے فوراً اپنے دوپٹے سے پونچھے اور ہنسنے لگی —— وہ کوشش کرتی تھی کہ اپنا صدمہ بھول جائے۔

اس کے بعد سلیمہ کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کا خاوند بہت خوش تھا۔

کئی برس بیت گئے۔ ایک بار سلیمہ کو کسی سہیلی کی شادی کے موقعہ پر گجرات جانا پڑا تو اس نے ایک بار پھر اپنے بیٹے کے متعلق پوچھ گچھ کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔

اس نے سوچا کہ شاید مر گیا ہو —— اس نے جمعرات کو بڑے اہتمام سے فاتحہ خوانی کرائی۔

اڑوس پڑوس کی سب عورتیں حیران تھیں کہ کس مرگ کے سلسلے میں اتنا تکلف کیا گیا ہے ــــــ بعض نے سلیمہ سے پوچھا، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

شام کو اس نے اپنی دس برس کی لڑکی مجیبہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر کمرے میں لے گئی۔

پھر اس نے سرمے سے مجیبہ کے داہنے گال پر ایک چھوٹا سا دھبہ بنایا اور اس کو دیر تک چومتی رہی۔

وہ مجیبہ ہی کو اپنا گم شدہ بیٹا سمجھتی تھی ــــــ اب اس نے اپنے بیٹے کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا، اس لئے کہ فاتحہ خوانی کرانے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا ــــــ اس نے اپنے، تصوّر میں اس کی قبر بنالی تھی جس پر وہ تصوّر ہی میں پھول بھی چڑھایا کرتی۔

اس کے تینوں بچے اسکول میں پڑھ رہے تھے ــــ وہ ہر صبح ان کو تیار کرتی، ان کے لئے ناشتہ بنواتی، ہر ایک کو بناتی سنوارتی۔ جب وہ اسکول چلے جاتے تو ایک لحظے کے لئے اسے اپنے بڑے بیٹے کا خیال آتا۔ پھر وہ سوچتی کہ وہ اس کی فاتحہ خوانی کرا چکی ہے اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا ہے، پھر بھی اس کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے بیٹے کے داہنے گال کا چھوٹا سا دھبہ اس کے دماغ میں موجود ہے۔

ایک دن اس کے تینوں بچے بھاگے بھاگے آئے اور اس سے کہنے لگے۔ ”امّی، ہم تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔“

اس نے بڑی شفقت سے پوچھا۔ ”کیسا تماشا؟“

اس کی لڑکی مجیبہ نے، جو سب میں بڑی تھی، کہا۔ ”امّی جان، ایک آدمی ہے...... وہ تماشا دکھاتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”جاؤ، اس آدمی کو بلا لاؤ، مگر وہ گھر کے اندر نہ آئے، بس باہر ہی تماشا کرے۔“

بچے بھاگے ہوئے گئے اور اس آدمی کو بلا لائے اور پھر تماشا دیکھتے رہے۔

جب تماشا ختم ہو گیا تو مجیبہ اپنی ماں کے پاس گئی کہ پیسے لے آئے۔

سلیمہ نے اپنے پرس سے چونّی نکالی اور باہر برآمدے کی طرف بڑھی ــــــ جب وہ دروازے کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ شاہ دولے کا ایک چوہا کھڑا عجیب احمقانہ انداز میں سر ہلا رہا ہے ــــــ اس کو ہنسی آگئی۔

دس بارہ بچے اس شاہ دولے کے چوہے کے اردگرد جمع تھے اور بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ اتنا شور مچ رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

سلیمہ چونّی ہاتھ میں لئے آگے بڑھی اور اس نے شاہ دولے کے چوہے کو دینا چاہی، مگر اس کا ہاتھ آپ سے آپ ایک دم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو!

اس چوہے کے داہنے گال پر چھوٹا سا ایک داغ تھا۔

سلیمہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا —— اس کی ناک سے رینٹھ بہہ رہا تھا۔

مجیبہ نے، جو سلیمہ کے پاس کھڑی تھی، اپنی ماں سے کہا۔ "یہ...... یہ چوہا...... امّی جان، اس کی شکل مجھ سے کیوں ملتی ہے...... میں بھی کیا چوہیا ہوں؟"

سلیمہ نے اس شاہ دولے کے چوہے کا ہاتھ پکڑا اور اس کو اندر لے گئی۔

دروازہ بند کر کے سلیمہ نے اس کو چوما، اس کی بلائیں لیں۔

وہ اس کا مجیب تھا اور ایسی احمقانہ حرکتیں کر رہا تھا کہ اس کے غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے دل میں بھی ہنسی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

اس نے کہا۔ "بیٹے، میں تیری ماں ہوں......"

شاہ دولے کا چوہا بڑے بے ہنگم طور پر ہنسا —— اپنی ناک کی رینٹھ آستین سے پونچھ کر اس نے سلیمہ کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ "ایک پیسہ......"

سلیمہ نے اپنا پرس کھولا —— اس کی آنکھیں اپنی ساری نہریں پہلے ہی کھول چکی تھیں —— سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور باہر جا کر اس آدمی کو دینے کی کوشش کی جو اس کے مجیب کو تماشا بنائے ہوئے تھا۔

اس آدمی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اتنی کم قیمت پر اپنی روزی کے ذریعے کو نہیں بیچ سکتا۔

سلیمہ نے اسے بالآخر پانچ سو روپوں پر راضی کر لیا۔

وہ رقم ادا کر کے جب اندر آئی تو مجیب غائب تھا۔

مجیبہ نے اس کو بتایا کہ وہ پچھواڑے سے باہر نکل گیا تھا۔

سلیمہ کی کوکھ پکارتی رہی۔ "مجیب واپس آجاؤ......" مگر وہ ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔

☆☆☆

نعرہ

مجموعہ: منٹو کے افسانے   اوّلین اشاعت: ۱۹۳۹   معیار: ۳ ستارے

اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اترا اور ان تمام منزلوں کا بوجھ اس کے چوڑے مگر دبلے کاندھے پر سوار ہوتا گیا۔ وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لئے اوپر چڑھ رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نے اپنے دل میں سوچا تھا، مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں، اس کی بپتا ضرور سنے گا اور کرایہ چکانے کے لئے اسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا ——— بخش دے گا! ——— یہ سوچتے ہوئے اس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی۔ لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت بھی معلوم ہو گئی تھی ——— وہ بھیک مانگنے ہی تو جا رہا تھا اور بھیک ہاتھ پھیلا کر، آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے دُکھ درد سُنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے ——— !

اس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اس نے اپنے غرور کو، اس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کیا کرتی ہے، نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دیا بُجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں۔ اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی

کی طرف بڑھا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدّی سی آواز گونجی۔

"کیشو لال ——— کھولی پانچویں، دوسرا مالا ——— دو مہینوں کا کرایہ ——— لے آئے ہو کیا؟"

یہ سُن کر اس نے اپنا دل، جس کے سارے پرانے اور نئے گھاؤ، وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کرید کرید کر ہرے کر چکا تھا، سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ پر ——— سیٹھ جی نے کچھ سننا نہ چاہا اور اس کے سینے میں ایک بلوٰ سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے اس نے اپنے وہ تمام دکھ جو بیت چکے تھے، گئے گزرے دنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اس نے اپنے دل میں بھر لئے تھے۔ اور ان تمام زخموں کی جلن جو مدّت ہوئی مٹ چکے تھے، اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی میں جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے سنبھالے؟

اس کے گھر میں بن بلائے مہمان آ گئے ہوتے تو وہ ان سے بڑے روکھے پن سے کہہ سکتا تھا۔ "جاؤ بھئی جاؤ، میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارت کر سکوں۔" لیکن یہاں تو قصّہ ہی دوسرا تھا۔ اس نے تو اپنے بھولے بھٹکے دُکھوں کو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر اپنے سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افراتفری میں اسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں۔ پر جوں جوں اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ پہچاننے لگا کہ فلاں دُکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اسے فلاں وقت پر ہوا تھا۔ اور جب یہ سوچ بچار شروع ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دُھند ہٹا دی جو ان پر لپٹی ہوئی تھی۔ اور کل کے تمام درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کچھ سوچا۔ اس کی کھولی کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا ہے جو اس کی کھولی کے مالک کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا ہے۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چمٹ گئے

جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اسے ان داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی ایک جنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی، وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اسے خیال آیا اور وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا خیال آیا تھا مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا۔ اس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصّے میں آ کر اسے گالی دی۔ گالی ـــــ یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا۔ اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا، اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرما گرم جلسے میں کسی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے، ٹھیک اسی طرح اس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس نے بہت جتن کئے کہ اس کے وہ دُکھ درد جو اس نے سیٹھ کو دکھانے کے لئے اکٹھے کئے تھے چُپ چاپ رہیں۔ پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام بے چین ہو گئے اور اندھا دُھند ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی سے تپ رہی تھیں، آنسو آ گئے جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دھواں نکلنے لگا۔

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھرّیاں پڑے چہرے پر قے کر دے۔ مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے ـــــ اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور ـــــ اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور ان کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر برکھا کے باعث گیلے ہو رہے تھے، ناچنے لگے۔

اس کی آنکھیں ہنسیں، اس کا دل بھی ہنسا، یہ سب کچھ ہوا۔ پر وہ کڑواہٹ دُور نہ ہوئی جو اس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے تھوک دیتا مگر وہ تو بہت بری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی اور نکالے نہ نکلتی تھی۔ اور پھر ایک عجیب قسم کا دکھ جو اس گالی نے پیدا کر دیا تھا، اس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں، اس کے سینے کے اندر اتر

کر آنسو بہا رہی ہیں، جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی، اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی۔ اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف حفاظت کے لئے بڑھا۔ پر اس گالی کی ساری گرد اس پر پھیل چکی تھی ــــــ اسے کچھ خبر نہ تھی ــــــ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اُترا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

ایک نہیں، دو گالیاں ــــــ بار بار وہ گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اُگل دی تھیں۔ اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اس ــــــ اس ــــــ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑبڑ کا نام کیا رکھے جو اس کے دل میں اور دماغ میں ان گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اس تپ کو دُور کر سکتا تھا جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟ ــــــ پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑا بنا ہوا تھا جس میں بہت سے پہلوان کشتی لڑ رہے ہوں۔ جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا، کسی دوسرے خیال سے، جو پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتا بھڑ جاتا اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا۔

چلتے چلتے جب ایکا ایکی اس کے دکھ قے کی صورت میں باہر نکلنے کو تھے، اس کے جی میں آئی۔ جی میں کیا آئی، مجبوری کی حالت میں وہ اس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس سے گزر رہا تھا، یہ کہنے ہی والا تھا۔ ’’بھیا میں روگی ہوں‘‘۔ مگر جب اس نے اس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اس کے پاس ہی زمین میں گڑا تھا، اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا۔ اور جو کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا، ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔

فٹ پاتھ میں چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ان پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک کبھی اس نے ان کی سختی محسوس نہ کی تھی مگر آج انکی سختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ

پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اس کے قدم پڑ رہے تھے، اس کے دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا ——— سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اس کا بند بند ڈھیلا ہو گیا۔

چلتے چلتے اس کی ایک لڑکی سے ٹکر ہوئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے جھٹ اس آدمی کی طرح جس کی جُھولی سے بیر گر رہے ہوں، اِدھر اُدھر اپنے ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے سے چلنا شروع کیا۔

اس کا دماغ اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا بہت پیچھے رہ گیا ہے اور دماغ بہت آگے نکل گیا۔ کئی بار اسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ جس کے اس طرف سڑک پر پوں۔ پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے، گاڑیاں، ٹرامیں بھاری بھرکم ٹرک، لاریاں یہ سب سڑک کی کالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا، پر اس کے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے جیسے ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہو۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کُتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کُتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے ’’چاؤں‘‘ کیا اور پرے ہٹ گیا۔ اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے ——— گالی ——— گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھاڑی کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا، اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

اسے اس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا جو اس کے گھر میں برکھا کے باعث گیلی ہو رہی تھی اور نہ اسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں جن کے پرماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں، وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا اور نہ کبھی ننگا ہی پھرا تھا۔

اسے صرف اس بات کا دکھ تھا کہ اسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے، اس بکرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے۔ شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لئے دُونی پیدا کرے یا اس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔ مکان اور

کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اُونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو سمجھتا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے۔ اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چکتا نہ کر سکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہو گیا کہ وہ اسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہی تھی جو اسے کھائے جا رہی تھی۔ اسے ان بیس روپوں کی پرواہ نہ تھی جو اسے آج نہیں کل ادا کر دینے تھے۔ وہ ان دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو ان بیس روپیوں کے بیچ میں سے نکلی تھیں۔ نہ وہ بیس روپیوں کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے منہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

مان لیا وہ دھنوان تھا۔ اس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں۔ جن کے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اس کے پاس آتا تھا۔ پر ان ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ رہتے ہیں اس کے غلام تو نہیں! اور اگر غلام بھی ہیں تو وہ انہیں گالی کیسے دے سکتا ہے؟

ٹھیک ہے، اسے کرایہ چاہیے، پر میں کہاں سے لاؤں، پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہوں۔ جب ہوگا، دے دوں گا۔ پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا۔ پر میں نے اسے کبھی گالی نہ دی، حالانکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں۔ میں نے سیٹھ سے ہزار بار کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے، اسے بنوا دیجیے۔ پر میری ایک نہ سنی گئی۔ میری پھول سی بچی گری۔ اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اسے بددعا دے سکتا تھا، پر مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا ـــــ دو مہینے کا کرایہ نہ چکانے پر میں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے بچے اپولو بندر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کر مونگ پھلی کھاتے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی، جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہوگی، پر وہ غریب کیسے ہو گیا؟ ـــــ اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی۔ ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اسے دو گالیاں سنا دیتا۔ گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت بُری بات ہے۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اس کے دوا

دارو پر وہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا۔ لیکن یہاں تو اس کے ہونے والے بچّے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اس کو اولاد بہت پیاری تھی، جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی، سب کی سب عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟ —— کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا —— باپ —— پتا —— وہ تو صرف دو مہینے کے کرائے کی بات تھی۔ اگر اسے اپنے بچّے کے لئے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا ——

چوری، نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا۔ یوں سمجھئے کہ وہ اپنے بچّے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ چور کبھی نہ بنتا۔ وہ اپنی چھنی ہوئی چیز واپس لینے کے لئے لڑنے مرنے کو تیار تھا۔ پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس وقت جب سیٹھ نے اسے گالی دی تھی، آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز نوٹ نکال کر بھاگ جاتا، جن کو وہ آج تک لاجونتی کے پتے سمجھا کرتا تھا —— نہیں نہیں وہ ایسا بھی نہ کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی؟ —— پچھلے برس چوپاٹی پر ایک گاہک نے اسے گالی دی تھی، اس لئے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے۔ اور اس نے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دُور بنچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سُن لی تھی۔ مگر سیٹھ نے اسے دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا —— کیشو لال کھاری سینگ والا، جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا —— سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا —— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹّی کا پتلا ہے —— پر مٹّی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر خاموش رہا، اس لئے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا —— مگر اس نے اپنا غرور اپنے سے کیوں الگ کیا؟ سیٹھ سے گالیاں کھانے کے لئے؟

یہ سوچتے ہوئے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں —— نہیں نہیں گالیاں اسے ہی دی گئی تھیں۔ تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو اس کے سینے میں ہلّڑ سا مچ رہا تھا۔ کیا بغیر کسی وجہ کے اسے دکھ دے رہا تھا؟ اسی کو دو گالیاں دی

گئی تھیں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں —— گالیاں —— گالیاں —— وہ جھنجھلا گیا —— وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اس چڑچڑے پن میں اس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے، دل ہی دل میں گالیاں دیں۔ "یوں اکڑ کے چل رہے ہیں۔ جیسے ان کے باوا کا راج ہے!"

اگر اس کا راج ہوتا تو سیٹھ کو مزا چکھا دیتا جو اسے اوپر تلے دو گالیاں سنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدّے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیئے ہیں —— سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپّا مارتا کہ بلبلا اٹھتا —— پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دُکھنے لگتا —— پر اس وقت اسے بالکل ہنسی نہیں آئی تھی —— کیوں؟ —— وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپّا مار سکتا تھا، اسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟ —— رکاوٹ تھی —— رکاوٹ تھی تو میں گالیاں سن کر خاموش ہو رہا۔

اس کے قدم رُک گئے۔ اس کا دماغ بھی ایک دو پل کے لئے سستایا اور اس نے سوچا کہ چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ ہی کر دوں —— بھاگا ہوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اس تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگر مچھ کے منہ کی طرح کھلتا ہے —— لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟

کیا اس میں جرأت نہ تھی؟

اس میں جرأت نہ تھی —— کتنے دُکھ کی بات ہے کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑ گئی تھی —— یہ گالیاں —— وہ ان گالیوں کو کیا کہتا —— ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رول سا پھیر دیا تھا —— صرف دو گالیوں نے۔ حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فساد میں ایک ہندو نے اسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ مؤا کر دیا تھا۔ اور اسے اتنی تکلیف محسوس

نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی۔ کیشو لال کھاری سینگ والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا، آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے ـــــ اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟ ـــــ دو گالیوں نے!

گالیاں ـــــ گالیاں ـــــ کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے۔ پر یہ کیسے ہو سکتا تھا ـــــ اس کا سینہ مربّے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے، لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے۔ جس سے یہ گالیاں دُور دفع ہوں ـــــ کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اسے دُکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟ ہوگا پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتہ تھا۔ وہ کھلی کتاب تھوڑی تھا اور نہ اس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟

نہ معلوم ہو! ـــــ پرماتما کرے کسی کو معلوم نہ ہو ـــــ اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لئے ڈوب مرنے کی بات تھی ـــــ گالیاں سُن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے ـــــ ہمالہ پہاڑ جتنی بات ہے۔ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اس کا غرور مٹی میں مل گیا ہے۔ اس کی ذلت ہوئی ہے ـــــ اس کی ناک کٹ گئی ہے ـــــ اس کا سب کچھ لُٹ گیا ہے۔ چلو بھئی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں ـــــ وہ کمینہ تھا۔ رذیل تھا۔ نیچ تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا۔ کتا تھا ـــــ اس کو گالیاں ملنا ہی چاہئے تھیں ـــــ نہیں نہیں ـــــ کسی کی کیا مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے۔ وہ اسے کچّا نہ چبا جاتا ـــــ اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ـــــ تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزیدار گھونٹ تھے، چلو یہی سہی ـــــ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر سے اُدھر چل رہے ہیں، میں ان سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں

ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا ـــــ مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا ـــــ مر جاؤں گا سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے ـــــ یہ سب کچھ اس لئے ہو گا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سنیں اور خاموش رہا۔ جیسے میرے منہ میں تالا لگا ہوا تھا۔ میں لولا، لنگڑا، اپاہج تھا ـــــ پرماتما کرے میری ٹانگیں اس موٹر کے نیچے آ کر ٹوٹ جائیں، میرے ہاتھ کٹ جائیں۔ میں مر جاؤں تا کہ یہ بک بک تو ختم ہو ـــــ توبہ ـــــ کوئی ٹھکانہ ہے اس دُکھ کا۔ کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کر دوں ـــــ اس ٹرام کے نیچے سر دے دوں، زور زور سے چلانا شروع کر دوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایکا ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہو جائے اور سب ٹریفک کو روک کر جو اس کی زبان پر آئے، بکتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کا سارا خالی ہو جائے، یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلانا شروع کر دے۔ ”مجھے بچاؤ ـــــ مجھے بچاؤ!“

اتنے میں ایک آگ بجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موڑ میں گم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں کہنے ہی والا تھا۔ ”ٹھہرو ـــــ میری آگ بجھاتے جاؤ“۔ مگر نہ جانے کیوں رُک گیا۔

ایکا ایکی اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رُکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے۔ لیکن جوں ہی اس کی رفتار بڑھی، اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے ـــــ دو مہینے کا کرایہ، اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا ـــــ سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور ـــــ یہ موٹی گالی ـــــ پھر دوسری ـــــ اور اس کی خاموشی ـــــ یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں۔ اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے قدم اور تیز کئے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہوا کہ

شعلوں کی ایک بہت بڑی گیندسی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلنے کودنے لگی۔ وہ اب دوڑنے لگا۔ لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلایا۔ ''تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو؟''

اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ بریک سی لگ گئی اور وہ ہولے ہولے چلنے لگا ـــــ وہ سچ مچ بزدل تھا بھاگ کیوں رہا تھا؟ ـــــ اسے تو انتقام لینا تھا ـــــ انتقام۔ یہ سوچتے ہوئے اسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی ـــــ لہو ـــــ لہو۔ اسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے ـــــ لہو ـــــ اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں لال ڈورے ابھر آئے۔ مٹھیاں بھینچ گئیں اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہو گئی ـــــ اب وہ انتقام پر تل گیا تھا۔

وہ بڑھا۔

آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ آگے ـــــ آگے!

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی ہے، اسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں، دوکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے ـــــ آگے ـــــ بہت آگے!

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس کے پاس سے بے پرواہ، ہوا کے مانند بڑھ گیا۔

وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو ایک بم بنا لیا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔ مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہوا وہ اپولو بندر پہنچا ـــــ اپولو ـــــ گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ پر جوڑے کسی کی لاش کے اردگرد بیٹھے ہیں۔ جب اس نے خاموش سمندر کی

طرف دیکھا تو اسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہوا ——— اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا، جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گدگدی پیدا کر رہی تھی۔

کیشو لال کھاری سینگ والا اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اس نے اوپر دیکھا ——— سنگین عمارت کی طرف جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور ——— اس کے حلق سے ایک نعرہ ——— کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا۔ ”ہت تیری ———!“

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے، ڈر گئے اور پھڑ پھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کئے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑاڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سُن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے، جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا ”پگلا ہے!“

☆☆☆

سیاہ حاشیے

اشاعت: ۱۹۴۸   معیار: ۳ستارے

ساعتِ شیریں

نئی دلی جنوری ۱۳ (اے۔ پی): اطلاع موصول ہوئی ہے
کہ مہاتما گاندھی کی موت پر اظہار مسرت کے لیے امرتسر،
گوالیار اور بمبئی میں کئی جگہ لوگوں میں شیرینی بانٹی گئی۔

(ا۔ پ)

مزدوری

لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ اس گرمی میں اضافہ ہوگیا، جب چاروں طرف آگ بھڑکنے لگی۔

ایک آدمی ہارمونیم کی پیٹی اٹھائے خوش خوش گاتا جارہا تھا ——

"جب تم ہی گئے پردیس
لگا کر ٹھیس
او پیتم پیارا،
دنیا میں کون ہمارا۔"

ایک چھوٹی عمر کا لڑکا جھولی میں پاپڑوں کا انبار ڈالے بھاگا جارہا تھا۔ ٹھوکر لگی تو پاپڑوں

کی ایک گڈی اس کی جھولی میں سے گر پڑی۔ لڑکا اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو ایک آدمی نے، جس نے سر پر سلائی کی مشین اٹھائی ہوئی تھی اُس سے کہا۔ ''رہنے دے بیٹا رہنے دے۔ اپنے آپ بھن جائیں گے۔''

بازار میں دھپ سے ایک بھری ہوئی بوری گری۔ ایک شخص نے جلدی سے بڑھ کر اپنے چھرے سے اس کا پیٹ چاک کیا —— آنتوں کی بجائے شکر، سفید سفید دانوں والی شکر اُبل کر باہر آئی۔

لوگ جمع ہو گئے اور اپنی جھولیاں بھرنے لگے۔

ایک آدمی کُرتے کے بغیر تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنا تہبند کھولا اور مٹھیاں بھر بھر اس میں ڈالنے لگا۔

''ہٹ جاؤ —— ہٹ جاؤ ——'' ایک تانگہ تازہ تازہ روغن شدہ الماریوں سے لدا ہوا گزر گیا۔

اونچے مکان کی کھڑکی میں سے ململ کا تھان پھڑ پھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ شعلے کی زبان نے ہولے سے اسے چاٹا...... سڑک تک پہنچا تو راکھ کا ڈھیر تھا۔

''پوں پوں —— پوں پوں ——'' موٹر کے ہارن کی آواز کے ساتھ دو عورتوں کی چیخیں بھی تھیں۔

لوہے کا ایک سیف دس پندرہ آدمیوں نے کھینچ کر باہر نکالا اور لاٹھیوں کی مدد سے اس کو کھولنا شروع کیا۔ ’کاؤ اینڈ گوٹ‘ دودھ کے کئی ٹین دونوں ہاتھوں پر اٹھائے اور اپنی ٹھوڑی سے ان کو سہارا دیئے ایک آدمی دکان سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ بازار میں چلنے لگا۔

بلند آواز آئی۔ ''آؤ آؤ لیمونیڈ کی بوتلیں پیو —— گرمی کا موسم ہے۔''

گلے میں موٹر کا ٹائر ڈالے ہوئے آدمی نے بڑھ کر دو بوتلیں اٹھائیں اور شکریہ ادا کیے بغیر چل دیا۔

ایک اور آواز آئی۔ ''کوئی آگ بجھانے والوں کو اطلاع دے دے —— ورنہ سارا مال جل جائے گا کسی نے اس مفید مشورے کی طرف توجہ نہ دی۔

لوٹ کھسوٹ کا بازار اسی طرح گرم رہا۔ اور اس گرمی میں چاروں طرف بھڑکنے والی

آگ بدستور اضافہ کرتی رہی۔ بہت دیر کے بعد تڑ تڑ کی آواز آئی۔ گولیاں چلنے لگیں۔

پولیس کو بازار خالی نظر آیا ——— لیکن دور دھوئیں میں ملفوف موڑ کے پاس ایک آدمی کا سایہ دکھائی دیا۔ پولیس کے سپاہی سیٹیاں بجاتے اس کی طرف لپکے ——— سایہ تیزی سے دھوئیں کے اندر گھس گیا۔ پولیس کے سپاہی بھی اس کے تعاقب میں گئے۔

دھوئیں کا علاقہ ختم ہوا تو پولیس کے سپاہیوں نے دیکھا کہ ایک کشمیری مزدور پیٹھ پر وزنی بوری اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ سیٹیوں کے گلے خشک ہو گئے مگر وہ کشمیری مزدور نہ رکا ——— اس کی پیٹھ پر وزن تھا۔ معمولی وزن نہیں۔ ایک بھری ہوئی بوری تھی۔ لیکن وہ یوں دوڑ رہا تھا جیسے پیٹھ پر کچھ ہے ہی نہیں۔

سپاہی ہانپنے لگے۔ ایک نے تنگ آ کر پستول نکالا اور داغ دیا۔ گولی کشمیری مزدور کی پنڈلی میں لگی۔ بوری اس کی پیٹھ پر سے گر پڑی۔ گھبرا کر اس نے اپنے پیچھے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا۔ پنڈلی سے بہتے ہوئے خون کی طرف بھی اس نے غور کیا۔ پھر ایک ہی جھٹکے سے بوری اٹھائی اور پیٹھ پر لادی اور لنگڑاتے بھاگنے لگا۔

تھکے ہوئے سپاہیوں نے سوچا۔ ”جانے دو، جہنم میں جائے۔“

ایک دم لنگڑاتا کشمیری مزدور لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ بوری اس کے اوپر آ رہی۔

سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور بوری سمیت تھانے کی طرف چلنے لگے۔

راستے میں کشمیری مزدور نے بارہا کہا۔ ”حضرت! آپ مجھے کیوں پکڑتی ہے...... میں تو غریب آدمی ہوتی...... چاول کی ایک بوری لیتی...... گھر میں کھاتی...... آپ ناحق مجھے گولی مارتی۔“

لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔

تھانے میں بھی کشمیری مزدور نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا ———

”حضرت، دوسرا لوگ بڑا بڑا مال اٹھاتی...... میں تو فقط ایک چاول کی ایک بوری لیتی...... حضرت، میں بہت غریب ہوتی۔ ہر روز بھات کھاتی۔“

جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے اپنی میلی ٹوپی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چاولوں کی بوری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تھانیدار کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ”اچھا

حضرت، تم بوری اپنے پاس رکھ ــــ میں اپنی مزدوری مانگتی ــــ چار آنے!"

تعاون

چالیس پچاس لٹھ بند آدمیوں کا ایک گروہ لوٹ مار کے لیے ایک مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دفعتاً اس بھیڑ کو چیر کر ایک دُبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی باہر نکلا۔ پلٹ کر اس نے بلوائیوں کو لیڈرانہ انداز میں مخاطب کیا۔ "بھائیو! اس مکان میں بے اندازہ دولت ہے۔ بے شمار قیمتی سامان ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس پر قابض ہو جائیں اور مالِ غنیمت آپس میں بانٹ لیں۔"

ہوا میں میں کئی لاٹھیاں لہرائیں۔ کئی مکے بھنچے اور بلند بانگ نعروں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔

چالیس پچاس لٹھ بند آدمیوں کا گروہ دُبلے پتلے ادھیڑ عمر کے آدمی کی قیادت میں اس مکان کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا جس میں بے شمار قیمتی سامان تھا۔

مکان کے صدر دروازے کے پاس رک کر دُبلا پتلا آدمی پھر بلوائیوں سے مخاطب ہوا۔

"بھائیو، اس مکان میں جتنا مال بھی ہے، سب تمہارا ہے لیکن دیکھو چھینا جھپٹی نہیں کرنا ــــ آپس میں نہیں لڑنا ــــ آؤ۔

ایک چلّایا۔ "دروازے میں تالا ہے۔"

دوسرے نے باآواز بلند کہا۔ "توڑ دو!"

"توڑ دو ــــ توڑ دو۔"

ہوا میں کئی لاٹھیاں لہرائیں، کئی مکّے بھنچے اور بلند بانگ نعروں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا۔

دُبلے پتلے آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے دروازے توڑنے والوں کا روکا اور مسکرا کر کہا۔ "بھائیو ٹھہرو ــــ میں اسے چابی سے کھولتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے تالے میں

ڈالی اور اسے کھول دیا۔ شیشم کا بھاری بھرکم دروازہ ایک چیخ کے ساتھ وا ہوا تو ہجوم دیوانہ وار اندر داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ ڈبلے پتلے آدمی نے ماتھے کا پسینہ اپنی آستین سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”بھائیو آرام آرام سے، جو کچھ اس مکان میں ہے سب تمہارا ہے۔ پھر اس افراتفری کی کیا ضرورت ہے؟“

فوراً ہی ہجوم میں ضبط پیدا ہوگیا۔ ایک ایک کر کے بلوائی مکان کے اندر داخل ہونے لگے۔ لیکن جونہی چیزوں کی لوٹ شروع ہوئی پھر دھاندلی مچ گئی۔ بڑی بے رحمی سے بلوائی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

ڈبلے پتلے آدمی نے جب یہ منظر دیکھا تو بڑی دکھ بھری آواز میں لٹیروں سے کہا۔

”بھائیو! آہستہ آہستہ —— آپس میں لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نوچ کھسوٹ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ تعاون سے کام لو۔ اگر کسی کے ہاتھ زیادہ قیمتی چیز آگئی ہے تو حاسد مت بنو، اتنا بڑا مکان ہے۔ اپنے لیے کوئی اور چیز ڈھونڈ لو۔ مگر ایسا کرتے ہوئے وحشی نہ بنو۔ مار دھاڑ کرو گے تو چیزیں ٹوٹ جائیں گی۔ اس میں نقصان تمہارا ہی ہے۔“

لٹیروں میں ایک بار پھر نظم پیدا ہوگیا۔ بھرا ہوا مکان آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا۔

ڈبلا پتلا آدمی وقتاً فوقتاً ہدایت دیتا رہا۔ ”دیکھو بھیا یہ ریڈیو ہے —— آرام سے اٹھاؤ، ایسا نہ ہو ٹوٹ جائے۔ یہ اس کے تار بھی ساتھ لیتے جاؤ۔“

”تہہ کر لو بھائی —— اسے تہہ کر لو۔ اخروٹ کی لکڑی کی تپائی ہے —— ہاتھی دانت کی پچی کاری ہے۔ بڑی نازک ہے۔ ہاں اب ٹھیک ہے!“

”نہیں نہیں —— یہاں مت پیو —— بہک جاؤ گے —— اسے گھر لے جاؤ ——“

”ٹھہرو ٹھہرو، مجھے مین سوئچ بند کر لینے دو۔ ایسا نہ ہو کرنٹ کا دھکا لگ جائے۔“

اتنے میں ایک کونے سے شور بلند ہوا۔ چار بلوائی ریشمی کپڑے کے تھان پر چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ ڈبلا پتلا آدمی تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور ملامت بھرے لہجے میں ان سے کہا۔

”تم کتنے بے سمجھ ہو۔ چندی چندی ہو جائے گی ایسے قیمتی کپڑے کی۔ گھر میں سب چیزیں موجود ہیں۔ گز بھی ہوگا۔ تلاش کرو اور ماپ کر کپڑا آپس میں تقسیم کر لو۔“

دفعتاً کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ''عف عف، عف۔'' اور چشم زدن میں ایک بہت بڑا گدی کتا ایک جست کے ساتھ اندر لپکا اور لپکتے ہی اس نے دو تین لٹیروں کو بھنبھوڑ دیا۔ ڈبلا پتلا آدمی چلّایا۔ ٹائیگر۔ ٹائیگر!''

ٹائیگر، جس کے خوفناک منہ میں ایک لٹیرے کا نُچا ہوا گریبان تھا۔ دم ہلاتا ہوا دبلے پتلے آدمی کی طرف نگاہیں نیچی کیے قدم اٹھانے لگا۔

کتے کے آتے ہی لٹیرے بھاگ گئے تھے۔ صرف ایک باقی رہ گیا تھا جس کے گریبان کا ٹکڑا، ٹائیگر کے منہ میں تھا۔ اس نے ڈبلے پتلے آدمی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

ڈبلا پتلا آدمی مسکرا دیا۔ ''اس گھر کا مالک ——— دیکھو دیکھو تمہارے ہاتھ سے کانچ کا مرتبان گر رہا ہے!

تقسیم

ایک آدمی نے اپنے لیے لکڑی کا ایک بڑا صندوق منتخب کیا جب اسے اٹھانے لگا تو وہ اپنی سے جگہ ایک انچ بھی نہ ہلا۔

ایک شخص نے جسے شاید اپنے مطلب کی کوئی چیز مل ہی نہیں رہی تھی، صندوق اٹھانے کی کوشش کرنے والے سے کہا۔ ''میں تمہاری مدد کروں؟''

صندوق اٹھانے کی کوشش کرنے والا امداد لینے پر راضی ہو گیا۔ اُس شخص نے جسے اپنے مطلب کی کوئی چیز مل نہیں رہی تھی، اپنے مضبوط ہاتھوں سے صندوق کو جنبش دی اور اٹھا کر اپنی پیٹھ پر دھر لیا۔ دوسرے نے سہارا دیا ——— دونوں باہر نکلے۔

صندوق بہت بوجھل تھا۔ اس کے وزن کے نیچے اٹھانے والے کی پیٹھ چٹخ رہی تھی۔ ٹانگیں دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔ مگر انعام کی توقع نے اس جسمانی مشقت کا احساس نیم مردہ کر دیا تھا۔

صندوق اٹھانے والے کے مقابلے میں صندوق کو منتخب کرنے والا بہت ہی کمزور تھا۔ سارا راستہ وہ صرف ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اپنا حق قائم رکھتا رہا۔ جب دونوں محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو صندوق کو ایک طرف رکھ کر ساری مشقت برداشت کرنے والے نے کہا۔ ''بولو۔ اس

صندوق کے مال میں سے مجھے کتنا ملے گا؟“

صندوق پر پہلی نظر ڈالنے والے نے جواب دیا۔ ”ایک چوتھائی۔“

”بہت کم ہے۔“

”کم بالکل نہیں۔ زیادہ ہے ——— اس لیے کہ سب سے پہلے میں نے اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن یہاں تک اس کمر توڑ بوجھ کو اٹھا کے لایا کون ہے؟“

”آدھے آدھے پر راضی ہو؟“

”ٹھیک ہے ——— کھولو صندوق!“

صندوق کھولا گیا تو اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔

ہاتھ میں تلوار تھی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دونوں حصہ داروں کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔

جائز استعمال

دس راؤنڈ چلانے اور تین آدمیوں کو زخمی کرنے کے بعد پٹھان بھی آخر سرخ رُو ہو ہی گیا۔

ایک افراتفری مچی تھی۔ لوگ ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ مار دھاڑ بھی جاری تھی۔ پٹھان اپنی بندوق لیے گھسا اور تقریباً ایک گھنٹہ کشتی لڑنے کے بعد تھرموس بوتل پر ہاتھ صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پولیس پہنچی تو سب بھاگے ——— پٹھان بھی۔

ایک گولی اس کے داہنے کان کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ پٹھان نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور سُرخ رنگ کی تھرموس بوتل کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے رکھا۔

اپنے دوستوں کے پاس پہنچ کر اس نے سب کو بڑے فخریہ انداز میں تھرموس بوتل دکھائی۔ ایک نے مسکرا کر کہا ——— ”خان صاحب، آپ یہ کیا اٹھا لائے ہیں؟“

خان صاحب نے پسندیدہ نظروں سے بوتل کے چمکتے ہوئے ڈھکنے کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیوں؟"

"یہ تو ٹھنڈی چیزیں ٹھنڈی اور گرم چیزیں گرم رکھنے والی بوتل ہے؟"

خان صاحب نے بوتل اپنی جیب میں رکھ لی۔ "خو ام اس میں نسوار ڈالے گا ـــــ گرمیوں میں گرم رہے گی۔ سردیوں میں سرد!"

بے خبری کا فائدہ

لبلبی دبی ـــــ پستول سے جھنجھلا کر گولی باہر نکلی۔

کھڑکی میں سے باہر جھانکنے والا آدمی اسی جگہ دوہرا ہو گیا۔

لبلبی تھوڑی دیر کے بعد پھر دبی ـــــ دوسری گولی بھنبھناتی ہوئی باہر نکلی۔

سڑک پر ماشکی کی مشک پھٹی۔ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو مشک کے پانی میں حل ہو کر بہنے لگا۔

لبلبی تیسری بار دبی ـــــ نشانہ چوک گیا۔ گولی ایک گیلی دیوار میں جذب ہو گئی۔

چوتھی گولی ایک بوڑھی عورت کی پیٹھ میں لگی ـــــ وہ چیخ بھی نہ سکی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔

پانچویں اور چھٹی گولی بے کار گئی۔ کوئی ہلاک ہوا نہ زخمی۔

گولیاں چلانے والا بھنّا گیا دفعتاً سڑک پر ایک چھوٹا سا بچہ دوڑتا دکھائی دیا۔ گولیاں چلانے والے نے پستول کا منہ اس طرف موڑا۔

اس کے ساتھی نے کہا۔ "یہ کیا کرتے ہو؟"

گولیاں چلانے والے نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"گولیاں تو ختم ہو چکی ہیں۔"

تم خاموش رہو ـــــ اتنے سے بچے کو کیا معلوم؟

مناسب کارروائی

جب حملہ ہوا تو محلے میں سے اقلیت کے کچھ آدمی تو قتل ہو گئے۔ جو باقی تھے جانیں بچا کر بھاگ نکلے۔ ایک آدمی اور اس کی بیوی البتہ اپنے گھر کے تہہ خانے میں چھپ گئے۔

دو دن اور دو راتیں پناہ یافتہ میاں بیوی نے قاتلوں کی متوقع آمد میں گزار دیں۔ مگر کوئی نہ آیا۔

دو دن اور گزر گئے۔ موت کا ڈر کم ہونے لگا۔ بھوک اور پیاس نے زیادہ ستانا شروع کیا۔ چار دن اور بیت گئے۔ میاں بیوی کو زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ دونوں جائے پناہ سے باہر نکل آئے۔

خاوند نے بڑی نحیف آواز میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا۔ ''ہم دونوں اپنا آپ تمہارے حوالے کرتے ہیں ——— ہمیں مار ڈالو۔''

جن کو متوجہ کیا گیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ''ہمارے دھرم میں تو جی ہتیا پاپ ہے۔''

وہ سب جینی تھے۔ لیکن انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور میاں بیوی کو مناسب کارروائی کے لیے دوسرے محلے کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔

کرامات

لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کے لیے پولیس نے چھاپے مارنے شروع کیے۔

لوگ ڈر کے مارے لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں باہر پھینکنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا مال بھی موقعہ پا کر اپنے سے علیحدہ کر دیا، تاکہ قانونی گرفت سے بچے رہیں۔

ایک آدمی کو بہت دقت پیش آئی۔ اس کے پاس شکر کی دو بوریاں تھیں جو اس نے پنساری کی دوکان سے لوٹی تھیں۔ ایک تو وہ جوں کی توں رات کے اندھیرے میں پاس والے کنویں میں پھینک آیا۔ لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا تو خود بھی ساتھ چلا گیا۔

شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کنوئیں میں رسیاں ڈالی گئیں۔ دو جوان نیچے اترے اور

اس آدمی کو باہر نکال لیا۔۔۔۔۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا۔

دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کے لیے اس کنوئیں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا۔

اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے۔

اصلاح

”کون ہو تم؟“

”تم کون ہو؟“

”ہر ہر مہادیو۔۔۔۔۔ ہر ہر مہادیو!“

”ہر ہر مہادیو!“

”ثبوت کیا ہے؟“

”ثبوت۔۔۔۔۔ میرا نام دھرم چند ہے۔“

”یہ کوئی ثبوت نہیں۔“

”چار ویدوں میں سے کوئی بھی بات مجھ سے پوچھ لو۔“

”ہم ویدوں کو نہیں جانتے۔۔۔۔۔ ثبوت دو۔“

”کیا؟“

”پائجامہ ڈھیلا کرو۔“

پائجامہ ڈھیلا ہوا تو ایک شور مچ گیا ”مار ڈالو۔۔۔۔۔ مار ڈالو۔“

”ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔۔۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔۔۔۔۔ بھگوان کی قسم تمہارا بھائی ہوں۔“

”تو یہ کیا سلسلہ ہے؟“

”جس علاقے سے آرہا ہوں وہ ہمارے دشمنوں کا تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا۔۔۔۔۔ صرف اپنی جان بچانے کے لیے۔۔۔۔۔ ایک یہی چیز غلط ہو گئی ہے۔ باقی بالکل ٹھیک ہوں۔“

"اڑا دو غلطی کو۔"

غلطی اڑادی گئی ــــــ دھرم چند بھی ساتھ ہی اڑ گیا۔

جیلی

صبح چھ بجے پٹرول پمپ کے پاس ہاتھ گاڑی میں برف بیچنے والے کے چھرا گھونپا گیا۔ سات بجے تک اس کی لاش لُک بچھی سڑک پر پڑی رہی اور اس پر برف پانی بن بن گرتی رہی۔

سوا سات بجے پولیس لاش اٹھا کر لے گئی۔ برف اور خون وہیں سڑک پر پڑے رہے۔

ایک تانگہ پاس سے گزرا۔ بچے نے سڑک پر جیتے جیتے خون کے جمے ہوئے چمکیلے لوتھڑے کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی ماں کا بازو کھینچ کر بچے نے انگلی سے اس طرف اشارہ کیا۔ "دیکھو ممی، جیلی؟"

دعوتِ عمل

آگ لگی تو سارا محلہ جل گیا ــــــ صرف ایک دوکان بچ گئی جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا ــــــ

"یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے۔"

پٹھانستان

"خو، ایک دم جلدی بولو، تم کون اے؟"

"میں.......... میں.........."

خو شیطان کا بچہ جلدی بولو ــــــ اِندو اے یا مسلمین"

"مسلمین"

"خو تمہارا رسول کون ہے؟"

"محمد خان"

ٹیک اے ___ جاؤ۔

خبردار

بلوائی مالکِ مکان کو بڑی مشکلوں سے گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ کپڑے جھاڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بلوائیوں سے کہنے لگا۔ "تم مجھے مار ڈالو لیکن خبردار جو میرے روپے پیسے کو ہاتھ لگایا۔"

ہمیشہ کی چھٹی

"پکڑ لو ___ پکڑ لو ___ دیکھو جانے نہ پائے۔"

شکار تھوڑی سے دوڑ دھوپ کے بعد پکڑ لیا گیا۔ جب نیزے اس کے آر پار ہونے کے لیے آگے بڑھے تو اس نے لرزاں آواز میں گڑگڑا کر کہا۔ "مجھے نہ مارو ___ مجھے نہ مارو۔ میں تعطیلوں میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

حلال اور جھٹکا

میں نے اس کی شہ رگ پر چھری رکھی۔ ہولے ہولے پھیری اور اس کو حلال کر دیا۔"

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"کیوں؟"

"اس کو حلال کیوں کیا؟"

مزہ آتا ہے اس طرح۔"

"مزہ آتا ہے کے بچے، تجھے جھٹکا کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح!"

اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا۔

گھاٹے کا سودا

دو دوستوں نے مل کر دس بیس لڑکیوں میں سے ایک لڑکی چُنی اور بیالیس روپے دے کر اُسے خرید لیا۔ رات گزار کر ایک دوست نے اس لڑکی سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے اپنا نام بتایا تو وہ بھنّا گیا ——— ”ہم سے تو کہا گیا تھا کہ تم دوسرے مذہب کی ہو۔“

لڑکی نے جواب دیا ”اس نے جھوٹ بولا تھا۔“

یہ سن کر وہ دوڑا دوڑا اپنے دوست کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا ———

”اُس حرامزادے نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ ہمارے ہی مذہب کی لڑکی تھما دی ——— چلو واپس کر آئیں۔“

حیوانیت

بڑی مشکل سے میاں بیوی گھر کا تھوڑا اثاثہ بچانے میں کامیاب ہوئے۔

ایک جوان لڑکی تھی۔ اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کو ماں نے اپنے سینے کے ستھ چمٹائے رکھا۔ ایک بھوری بھینس تھی۔ اس کو بلوائی ہانک کر لے گئے۔ گائے بچ گئی مگر اس کا بچھڑا نہ ملا۔

میاں بیوی، ان کی چھوٹی لڑکی اور گائے ایک جگہ چھپے ہوئے تھے۔ سخت اندھیری رات تھی۔ بچی نے ڈر کے رونا شروع کیا تو خاموش فضا میں جیسے کوئی ڈھول پیٹنے لگا۔ ماں نے خوفزدہ ہو کر بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ دشمن سن نہ لے۔ آواز دب گئی۔ باپ نے احتیاطاً اوپر گاڑھے کی موٹی چادر ڈال دی۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے کسی بچھڑے کی آواز آئی۔ گائے کے کان کھڑے ہوئے۔ اُٹھی اور ادھر اُدھر دیوانہ وار دوڑتی ڈکرانے لگی۔ اس کو چپ کرانے کی بہت کوشش کی گئی مگر بے

سود۔

شور سن کر دشمن آ پہنچا۔ دور سے مشعلوں کی روشنی دکھائی دی۔ بیوی نے اپنے میاں سے بڑے غصے کے ساتھ کہا ——

''تم کیوں اس حیوان کو اپنے ساتھ لے آئے تھے؟''

کسرِ نفی

چلتی گاڑی روک لی گئی۔ جو دوسرے مذہب کے تھے ان کو نکال نکال کر تلواروں اور گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر گاڑی کے باقی مسافروں کی حلوے دودھ اور پھلوں سے تواضع کی گئی۔ گاڑی چلنے سے پہلے تواضع کرنے والوں کے منتظم نے مسافروں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بھائیو اور بہنو! ہمیں گاڑی کی آمد کی اطلاع بہت دیر میں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس طرح چاہتے تھے اس طرح آپ کی خدمت نہ کر سکے۔''

کھاد

اس کی خودکشی پر اس کے ایک دوست نے کہا ——

''بہت ہی بے وقوف تھا جی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو اگر تمہارے کیس کاٹ دیے ہیں اور تمہاری داڑھی مونڈ دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا دھرم ختم ہو گیا ہے —— روز دہی استعمال کرو۔ واہگورو جی نے چاہا تو ایک ہی برس میں تم پھر ویسے کے ویسے ہو جاؤ گے۔''

استقلال

''میں سکھ بننے کے لیے ہرگز تیار نہیں —— میرا استرا واپس کر دو مجھے۔''

نگرانی میں

الف نے اپنے دوست ب کو اپنا ہم مذہب ظاہر کر کے اسے محفوظ مقام پر پہنچانے کے لیے ملٹری کے ایک دستے کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں ب نے، جس کا مذہب مصلحتاً بدل دیا گیا تھا، ملٹری والوں سے پوچھا۔ ’’کیوں جناب آس پاس کوئی واردات تو نہیں؟‘‘

جواب ملا۔ ’’کوئی خاص نہیں — فلاں محلے میں البتہ ایک کتا مارا گیا۔‘‘

سہم کر ب نے پوچھا۔ ’’کوئی اور خبر؟‘‘

جواب ملا۔ ’’خاص نہیں — نہر میں تین کتیوں کی لاشیں ملیں —‘‘

الف نے ب کی خاطر ملٹری والوں سے کہا۔ ’’ملٹری کچھ انتظام نہیں کرتی؟‘‘

جواب ملا۔ ’’کیوں نہیں — سب کام اسی کی نگرانی میں ہوتا ہے —‘‘

جوتا

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں، اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے منہ پر تارکول مل دیا۔ دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کیے اور ان کا ہار بنا کر بُت کے گلے میں ڈالنے کے لیے آگے بڑھا۔

مگر پولیس آگئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔

جوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لیے اسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

پیش بندی

پہلی واردات ناکے کے ہوٹل کے پاس ہوئی۔ فوراً ہی وہاں ایک سپاہی کا پہرہ لگا دیا گیا۔

دوسری واردات دوسرے ہی روز شام کو اسٹور کے سامنے ہوئی۔ سپاہی کو پہلی جگہ سے

ہٹا کر دوسری واردات کے مقام پر متعین کر دیا گیا۔

تیسرا کیس رات کے بارہ بجے لانڈری کے پاس ہوا۔

جب انسپکٹر نے سپاہی کو اس نئی جگہ پہرہ دینے کا حکم دیا تو اس نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا۔ ”مجھے وہاں کھڑا کیجیے جہاں نئی واردات ہونے والی ہے۔“

سوری

چُھری پیٹ چاک کرتی ہوئی ناف کے نیچے تک چلی گئی۔ ازار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے منہ سے دفعتاً کلمۂ تاسف نکلا ______

”چ، چ، چ، چ مشٹیک ہو گیا۔“

رعایت

”میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔“

”چلو اسی کی مان لو ______ کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔“

صفائی پسندی

گاڑی رُکی ہوئی تھی۔

تین بندوقچی ایک ڈبے کے پاس آئے۔ کھڑکیوں میں سے اندر جھانک کر انہوں نے مسافروں سے پوچھا۔ ”کیوں جناب کوئی مرغا ہے؟“

ایک مسافر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ باقیوں نے جواب دیا۔ ”جی نہیں۔“

تھوڑی دیر کے بعد چار نیزہ بردار آئے۔ کھڑکیوں میں سے اندر جھانک کر انہوں نے مسافروں سے پوچھا۔ ”کیوں جناب کوئی مرغا ورغا ہے؟“

اس مسافر نے جو پہلے کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا جواب دیا۔ ”جی معلوم نہیں ______ آپ

اندر آ کے سنڈاس میں دیکھ لیجئے۔''

نیزہ بردار اندر داخل ہوئے۔ سنڈاس توڑا گیا، تو اس میں سے ایک مرغا نکل آیا۔

ایک نیزہ بردار نے کہا ——— ''کر دو حلال۔''

دوسرے نے کہا۔ ''نہیں یہاں نہیں، ڈبہ خراب ہو جائے گا ——— باہر لے چلو۔''

صدقے اس کے

مجرا ختم ہوا۔ تماشائی رخصت ہو گئے۔ تو استاد جی نے کہا۔ سب کچھ لٹا پٹا کر یہاں آئے تھے۔ لیکن اللہ میاں نے چند دنوں ہی میں وارے نیارے کر دیئے۔''

اشتراکیت

وہ اپنے گھر کا تمام ضروری سامان ایک ٹرک میں لدوا کر دوسرے شہر جا رہا تھا کہ راستے میں لوگوں نے اسے روک لیا۔ ایک نے ٹرک کے مال و اسباب پر حریصانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو یار کس مزے سے اتنا مال اکیلا اڑائے چلا جا رہا ہے۔''

اسباب کے مالک نے مسکرا کر کہا۔ ''جناب یہ مال میرا اپنا ہے۔''

دو تین آدمی ہنسے۔ ''ہم سب جانتے ہیں۔''

ایک آدمی چلایا۔ ''لوٹ لو، یہ امیر آدمی ہے ——— ٹرک لے کر چوریاں کرتا ہے۔''

اُلہنا

''دیکھو یار۔ تم نے بلیک مارکٹ کے دام بھی لیے اور ایسا رڈی پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی!''

آرام کی ضرورت

”مرا نہیں ——— دیکھو ابھی جان باقی ہے۔“

”رہنے دو یار ——— میں تھک گیا ہوں۔“

قسمت

”کچھ نہیں دوست ——— اتنی محنت کرنے پر صرف ایک بکس ہاتھ لگا تھا۔ پر اس میں بھی سالا سور کا گوشت نکلا۔“

آنکھوں پر چربی

”ہماری قوم کے لوگ بھی کیسے ہیں ——— پچاس سور اتنی مشکلوں کے بعد تلاش کر کے اس مسجد میں کاٹے ہیں۔ وہاں مندروں میں دھڑا دھڑ گائے کا گوشت بک رہا ہے، لیکن یہاں سؤر کا مانس خریدنے کے لیے کوئی آتا ہی نہیں۔“

☆☆☆

کبوتروں والا سائیں

مجموعہ: دھواں **اولین اشاعت: ۱۹۴۰** **معیار: ۳ ستارے**

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکیئے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اپلوں سے آگ سلگا رہی تھی۔ صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھیں سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے منہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر، اوپر تلے رکھے ہوئے اپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اڑتی ہے اور اس کے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر، جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آ گئی ہے۔

اپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال، لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر، جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر بنی ہوئی قبر کی بابت اس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے ان کے قبضہ میں تھی۔ گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اس کی ہوشیار بیوی اس تکیئے کی مجاور تھی۔ گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دل عزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اسے تکیئے کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی، اس لئے اس نے برتن بنانے چھوڑ دیئے تھے، لیکن اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کے لئے سال بھر میں چھ کونڈیاں بنایا

کرتا تھا، جن کے متعلق وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ۔ "چوہدری لوہا ہے لوہا —— فولاد کی، کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی بھنگ گھوٹ کر پئے۔"

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا، جواب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکئے میں جمع ہوتے تھے، اور سردائی پیا کرتے تھے، گھوٹنے کے لئے گاما سائیں نہیں تھا پر اس کے بہت سے چیلے چانٹے جواب سر اور، بھوئیں منڈا کر سائیں بن گئے تھے، اس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے، اور مائی جیواں کی سلگائی ہوئی آگ سلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام تو خیر کافی رونق رہتی تھی۔ مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ ادھر ادھر کونے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی، کابک تھے، جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پرانے دوست ابو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے۔ تکئے کی دھوپ بھری فضا میں ان سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت بھلی سی معلوم ہوتی تھی۔ جس طرح تکئے میں آنے والے لوگ شکل وصورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے، اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھر پہنا رکھے تھے، بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا، جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کر موقعہ دیکھنے کے لئے گاؤں میں آیا کرتا تھا اور گاما سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اس کے نام میں تھانیداری کی بو سونگھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا۔ پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برس میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا۔ یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چپ چپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور منہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا، پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی ناک سے رینٹھ اور منہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی

ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لے گا۔ کمانا ومانا کیا تھا۔ عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس کی ماں نے اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی۔ جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ کبوتروں والا سائیں اسے اس لئے کہا جاتا تھا کہ اسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکئے میں جتنے کبوتر تھے ان کی دیکھ بھال ابو پہلوان سے زیادہ وہی کیا کرتا تھا۔

اس وقت وہ سامنے کوٹھری میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا، باہر اس کی ماں آگ سلگا رہی تھی ــــــ

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں اس لئے گاؤں ابھی تک رات اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے، مگر تکیہ، جو کہ گاؤں سے فاصلے پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا، البتہ دور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سلگا کر بکری کے لئے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی، مڑ کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اس نے موٹی آواز میں ”مائی جیواں السلام علیکم۔“ کہا تو، پگڑی کا کھردرا کپڑا اس کے منہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کئے بغیر کہا۔

”وعلیکم السلام ــــــ آؤ بھائی بیٹھو۔ آگ تاپو۔“

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھ کر اس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سلگتی رہتی تھی۔

اجنبی اور وہ دونوں پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا۔

”ماں، اللہ بخشے گاما سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا، اس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے صدمہ ہوا۔ مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ! گاما سائیں کے ایک ہی تعویذ سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔“

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر

آتا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا۔ ''میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لئے۔'' اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا۔ ''میں سندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں، پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں۔ خون خرابہ ہوگا، اس لیے میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکے کو دور ہی رکھنا، میں نے سنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا، ایسا نہ ہو کہ جوش مار اٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ تم ان کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیج دو تو ٹھیک رہے گا ___ بس مجھے یہی کہنا تھا، میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔''

___ ''السلام علیکم۔''

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اٹھا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی راستے سے باہر چلا گیا۔

سندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اسی کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ بے شمار گیت اس کی بہادری اور بے باکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اس کا نام سن کر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا، مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے، تو ہر شخص اس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا، اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے۔ بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قد آور جوان ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا، ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے، مگر بدن اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا۔ بہر حال سب متفقہ طور پر اس کی طاقت اور بے باکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سنا کہ سندر جاٹ ان کے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آ رہا ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکی۔ مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سندر جاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی لال مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی

تھی اور گاؤں کی سب سے سندر اور چنچل چھوکری ایسی گم ہوئی تھی کہ اب تک اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ بلا اب ان کے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے ـــــ چوہدری کے گھر خبر کر دے ـــــ لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ تھے۔ پچھلے دنوں اس نے تھوڑا سا ساگ مانگا تھا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ گھسیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے۔ نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی، گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے مہربانی کے قابل نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا اگر اس نے کسی کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا۔ اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا، جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی۔ اور رحمان کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھری کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اسے عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا۔ اس کی یہ ہنسی آج خلاف معمول معنی خیز تھی۔ مائی جیواں کو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوش مندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کوٹھری کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا۔ ”ماں یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟“

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا۔ اس لئے اس کی ماں جواب دیئے بغیر اندر چلی گئی اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی۔ ”ارے رحمان، اے رحمان! اٹھ اٹھ۔“

بازو جھنجھوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا۔ اور جب وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش آ گیا تو اس کی ماں نے اس کو ساری بات سنا دی، رحمان کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا۔ گو اس کی عمر اس وقت بائیس سال کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا، مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی۔ سندر جاٹ! ـــــ اتنا بڑا ڈاکو جس

کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا، تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لئے آ رہا تھا۔ وہ فوراً اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہو گیا، بلکہ یوں کہئے کہ وہ اسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی، جو کہ گاؤں کی ایک بیباک۔ اور شوخ چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے، مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اڑا دیتی تھی۔ چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا، اس فن کے بڑے بڑے ماہر دور دور سے اس کو نیچا دکھانے کے لئے آتے تھے مگر اس کی کلائی کسی سے بھی نہ مڑی تھی۔ وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اس کی یہ ساری اکڑ فوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی۔ جب اس نے دھان کے کھیت میں اس سے کہا۔ ''فجے، گنڈا سنگھ کی کلائی موڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا ——— آ میرے سامنے بیٹھ، میری کلائی پکڑ۔ ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے، دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں''۔

فضل دین اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسے یقین تھا، کہ اس کی طاقت اور شہ زوری کے رعب اور دبدبے میں آ کر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی۔ لیکن جب اس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر چڑھ جاتی ہے اور وہ اگر اس کی دعوت قبول کرتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے، عورت ذات سے مقابلہ کرتے ہوئے شرم تو نہیں آئی مرد کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، چنانچہ اس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے، اس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں دھنس گئیں۔ ایک نعرہ بلند ہوا، اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہو گئی ——— اس دن سے لے کر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں تو رحمان کو اس نیتی سے محبت تھی۔ جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا، اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دور دور سے دیکھ کر وہ اپنے دل کی ہوس پوری کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ اس

کے پاس ہوتی تو اس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ حرف مدعا زبان پر لائے۔ مگر نیتی سب کچھ جانتی تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ اس کے عشق میں کون گرفتار نہ تھا؟ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اس کے دل میں اس قدر موجود تھی، کہ بالکل اس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی، جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا ـــــ وہ بےخبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان پر پہنچ چکی تھی۔ اور اب تمام گاؤں والے اس کی افتاد کے منتظر تھے، جو کہ یقینی تھی۔

رحمان کو بھی اس افتاد کا یقین تھا۔ مگر اس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں۔ نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی۔ اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔

جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہنچنے کے لئے تیار ہو کر تکیئے سے باہر نکلا تو اسے راستے میں نیتی کا خیال آیا۔ مگر اس وقت اس نے یہ نہ سوچا کہ سندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زوروں سے پیار محبت کر رہا تھا کہ اسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اس نے سوچا کہ نیتی کو بتا دینا چاہیے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے۔ لیکن اب واپس کون جاتا!

عبدالغفار ـــــ یعنی کبوتروں والا سائیں تکیئے سے باہر نکلا۔ اس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ تکیئے سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گذار دیتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو ان کے چلنے سے جو دھول اڑتی ہے اس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آ جاتی تھی۔ گاؤں اس کو پسند نہیں تھا، اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اسے غیر محسوس طور پر محبت تھی۔ یہاں بھی لوگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کے لئے دعا مانگے۔ اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اس سے اپنے دل کا حال بیان

کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ نوجوان چھوکریاں بھی چپکے چپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے 'ماہیا' کا دل کیسا ہے۔ عبدالغفار ان سوالوں کے اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ اسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں، لیکن لوگ جو اس کے پاس سوال لے کر آتے تھے اس کی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفار مختلف کھیتوں میں ہوتا ہوا اس کنوئیں کے پاس پہنچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنوئیں کی حالت بہت ابتر تھی۔ اس بوڑھے برگد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا، اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے، کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا بن دیا ہے۔

اس کنویں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبدالغفار بیٹھ گیا اور دوپہر کی اداس فضا میں اس نے اپنے وجود سے اور بھی اداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اڑتی ہوئی چیلوں کی اداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اٹھی۔
اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔

نیتی گا رہی تھی
؎

ماہیا مرے نے باگ لوایا   چمپا، مروا خوب کھلایا
اسی نے لوابیاں کھٹیاں وے   راتیں سونڑ نہیں دیندیاں اکھیاں وے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اس میں ہر طرح کے پھول اگائے ہیں۔ چمپا، مروا وغیرہ کھلائی ہیں اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں، رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں۔ کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں جذباتِ نازک بالکل نہیں تھے ______ پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اس کو چونکا دیا اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ نیتی کی آواز ہے۔

نیتی گاتی گاتی کنوئیں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھ کر وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی

اور کہنے لگی۔ ’’اوہ غفار سائیں ـــــ تم ـــــ اوہ مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں ـــــ اور اس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا، اور کوئی بھی نہیں ـ دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی، اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی۔ اور ـــــ لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو ـــــ اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے۔‘‘

وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اس کی نگاہیں گاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں۔ کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اس نے گردن اٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا۔ ’’غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں ـــــ ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے! ـــــ اللہ میاں کی محبت اور اس کے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی کیوں غفار سائیں ـــــ ارے تم بولتے کیوں نہیں ـــــ کچھ تو بولو ـــــ کچھ کہو ـــــ اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی ـــــ تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں ـــــ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی‘‘ ـــــ یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی۔ اور اس کی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی، اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا۔ ’’سائیں میں کب تھکوں گی؟‘‘

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا۔ اس نے کنوئیں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’بہت جلد۔‘‘

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر نیتی نے اس کے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا۔ ’’کب؟ ـــــ کب؟ ـــــ سائیں کب؟‘‘

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نیتی کچھ دیر کنوئیں کے پاس سوچتی رہی، پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا ادھر چل دی!

☆☆☆

وہ رات جس میں سندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آ رہا تھا، مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی تھی،

رحمان کو اس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ ابو پہلوان کبھی کبھی تکئے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس سو جایا کرتا تھا۔ مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی، مگر اس کو ہلکی سی آہٹ بھی نہ سنائی دی۔ جب رات گذر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سندر جاٹ کی بابت سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی۔ اس لئے صبح بہت دیر کے بعد جاگی۔ کوٹھری سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ ابو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکئے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے باہر نکلتے ہی اس سے کہا۔ "ساری رات مجھے نیند نہیں آئی، یہ موا بڑھاپا بڑا تنگ کر رہا ہے۔ صبح سوئی ہوں اور اب اٹھی ہوں۔ ہاں تم سناؤ کل کہاں رہے؟"

ابو نے جواب دیا۔ "گاؤں میں۔"

اس پر مائی جیواں نے کہا۔ "کوئی تازہ خبر؟"

ابو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا۔ "آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا۔ کہ گاما چمار کی وہ لونڈیا —— کیا نام ہے اس کا؟ —— ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے —— میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا —— حرام زادی نے سارے گاؤں کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔"

"کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اٹھا کر لے گیا ہے؟"

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا۔ پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سندر جاٹ سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ وہ تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکئے میں آتے جاتے رہے۔ لیکن جو کچھ ابو نے بتایا تھا اس سے زیادہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔ شام کو رحمان لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکے کے متعلق پوچھا۔ اس پر مائی جیواں نے کہا۔

''سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا، نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے ——— ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔''

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے، وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔

ایک دم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا بیٹا؟''

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔ ''کچھ نہیں ماں ——— تھک گیا ہوں۔''

''اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟''

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا کہا تھا اس نے تجھ سے؟''

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔ ''کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں ——— پر اب وہ تھک جائے گی۔''

رحمان نے تیزی سے پوچھا۔ ''کیسے؟''

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ''مجھے کیا معلوم؟ ——— سندر جاٹ جانے اور وہ جانے۔''

یہ سن کر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھا گئی اور مائی جیواں کی جھریاں اور زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

☆☆☆

ممد بھائی

مجموعہ: سرکنڈوں کے پیچھے اشاعت: ۱۹۵۴ معیار: ۳ ستارے

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوران ہوتے ہیں، مگر یہ ریستوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی رنڈیاں بستی ہیں۔

ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھئے کہ بیس برس کے قریب، جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی سے آگے نکل کر ’پلے ہاؤس‘ آتا ہے۔ ادھر دن بھر ہاؤ ہو رہتی ہے۔ سینما کے شو دن بھر چلتے رہتے تھے۔ چمپیاں ہوتی تھیں۔ سینما گھر غالباً چار تھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے سماعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے تھے: ”آؤ آؤ ــــ دو آنے میں ــــ فسٹ کلاس کھیل ــــ دو آنے میں!“

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجانے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے تھے۔ باہر کرسیوں پر چمپی کرانے والے بیٹھے ہوتے تھے جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنٹیفک طریقے پر کی جاتی تھی۔ مالش اچھی چیز ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دن کو اور رات کو ہر وقت انہیں تیل مالش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل مالشیا بلا سکتے ہیں۔ یوں بھی ساری

رات، آپ خواہ بمبئی کے کسی کونے میں ہوں، یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے۔ ''پی — پی — پی — '' —

یہ 'پی' چمپی کا مخفف ہے۔

فارس روڈ یوں تو ایک سڑک کا نام ہے لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں، لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلا لگی دکانیں ہیں جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف داموں پر، آٹھ آنے سے آٹھ روپے تک، آٹھ روپے سے سو روپے تک — ہر دام کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔

یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی، جاپانی، غرضکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے — یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں — معاف کیجیے گا، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیے — بس عورتیں ہوتی ہیں — اور ان کو گاہک مل ہی جاتے ہیں۔

اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا کاروبار کرتے ہیں، مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو ریستوران چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اوپر نیچے کیڑے مکوڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے — معلوم نہیں کیا — اسی علاقے میں بزنس مین اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب لین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس کی میں بات کر رہا ہوں، اس گلی میں غالباً بیس پچیس عرب رہتے تھے جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔

اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا، ہر وقت بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔

آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں کہ وہاں کسی کو کسی اور سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے

پڑوس میں قتل ہو جائے، مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اور اس کا نام ممّد بھائی تھا۔

ممّد بھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اوّل درجے کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی میں آیا تو ہوٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا، لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا۔ لیکن مجھے ممّد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا کیونکہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں کہ بیس پچیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار ساری بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

اس کے ہاتھ کی صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا۔ لیکن اس کے متعلق اور باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باتیں نہ کروں لیکن قریب سے دیکھ لوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکّا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی —— صرف عرب گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں تھیں، ان میں جتنی نادار عورتیں تھی، سب ممّد بھائی کو جانتی تھیں کیونکہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خیرت دریافت کر لیا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگہ تھا جس میں بڑا تندرست ٹٹو جتا ہوتا تھا اس کو وہ خود چلاتا تھا۔ ساتھ دو یا تین شاگرد ہوتے تھے، بڑے باادب —— بھنڈی بازار کا ایک چکر لگا کر یا کسی درگاہ میں ہو کر وہ اس تانگے میں واپس عرب گلی آ جاتا تھا اور کسی ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے

ساتھ گنگنے اور بنوٹ کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میری کھولی کے ساتھ ہی ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقاص رہتا تھا۔ اس نے مجھے ممدّ بھائی کی سینکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ ممد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ ممد بھائی کو پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیئے اور ان سے کہا ــــــ ''دیکھو، اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا۔'' عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب! ممدّ بھائی فرشتہ ہے ــــ فرشتہ ــــ جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کانپنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دو دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

ممدّ بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور واہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص نے جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھکیت سمجھتا تھا، مجھ سے یہ کہا تھا کہ ممدّ دادا اپنے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر اڑسے رکھتا ہے، جو استرے کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا، کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے، جھکتے ہوئے اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو ممدّ بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتیاق دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصوّر میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا، بہرحال اتنی مدّت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام ممدّ بھائی تھا۔ اس قسم کا آدمی جو ہرکولیس سائیکلوں پر اشتہار کے طور پر دیا جاتا ہے۔

میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے وانے سے فارغ ہو کر واپس آکر فوراً سو جاتا تھا۔ اس دوران میں ممدّ بھائی سے کیسے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گزار کر ممدّ بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں، مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میری ملازمت ہی بڑی واہیات قسم کی تھی۔ ممدّ بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوئنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا، کیونکہ عرب گلی کے

ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تنہا تھا۔ میرے ساتھ جو ایک آدمی رہتا تھا، اس کو پونہ میں نوکری مل گئی تھی، اس لیے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کھولی میں رکھا تھا وہ میرے لئے ناکافی تھا۔ اور دوست یار کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں، دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا۔ انفلوئنزا تھا، ملیریا تھا یا کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلاسہ دے۔ دلاسہ نہ دے تو کم از کم ایک سیکنڈ کے لئے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے تا کہ مجھے یہ خوشگوار احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں لیتا رہا، مگر کوئی نہ آیا — آتا بھی کسے تھا — میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے — دو تین یا چار — اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا — اور پھر وہاں بمبئی میں کون کس کو پوچھتا ہے — کوئی مرے یا جئے — ان کی بلا سے —!

میری بہت بری حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیوی بیمار تھی اس لئے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا — بڑی نڈھال حالت میں تھا، اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرا جسے بمبئی کی زبان میں 'باہر والا' کہتے ہیں، ہو گا۔ بڑی مریل آواز میں کہا۔ ''آجاؤ!''

دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی جس کی مونچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں، اندر داخل ہوا۔

اس کی مونچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی مونچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی ہے۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے میری

کھاٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے، عجیب و غریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے آدمی نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا۔ ''ونٹو صاحب! آپ نے حد کردی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟'' منٹو کا 'ونٹو' بن جانا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں اس موڈ میں بھی نہیں تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا۔ میں نے اپنی نحیف آواز میں اس کی مونچھوں سے صرف اتنا کہا۔ ''آپ کون ہیں؟''

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ممدّ بھائی!''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا: ''ممدّ بھائی ـــــ تو ـــــ تو آپ ممدّ بھائی ہیں ـــــ مشہور دادا''!

میں نے یہ کہہ تو دیا۔ لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈے پن کا احساس ہوا اور رک گیا۔ ممدّ بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی مونچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کئے اور مسکرایا ''ہاں ونٹو بھائی ـــــ میں ممدّ ہوں ـــــ یہاں کا مشہور دادا ـــــ مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو ـــــ سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ ممدّ بھائی کا مستک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔''

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ارے ـــــ کیا نام ہے تیرا ـــــ جا بھاگ کے جا، اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا ـــــ سمجھ گئے نا، اس سے کہہ کہ ممدّ بھائی تجھے بلاتا ہے ـــــ ایک دم جلدی آ ـــــ ایک دم سب کام چھوڑ دے اور جلدی آ ـــــ اور دیکھ سالے سے کہنا، سب دوائیں لیتا آئے۔''

ممدّ بھائی نے جس کو حکم دیا تھا، وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا ـــــ وہ تمام داستانیں میرے بخار آلود دماغ میں چل پھر رہی تھیں۔ جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سن چکا تھا ـــــ لیکن گڈمڈ صورت میں۔ کیونکہ بار بار اس کو دیکھنے کی وجہ سے اس کی مونچھیں سب پر چھا جاتی تھیں۔ بڑی خوفناک، مگر بڑی خوبصورت مونچھیں تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملائم اور نرم و نازک ہیں، صرف خوفناک بنانے کے لئے یہ مونچھیں رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلود دماغ میں سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا

خوفناک نہیں جتنا اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔

کھولی میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ میں نے ممّد بھائی سے کہا کہ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے سے لہجے میں کہا ——— ”ٹھیک ہے ——— ہم کھڑے رہیں گے۔“

پھر اس نے ٹہلتے ہوئے ——— حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کرتے کا دامن اٹھا کر پاجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا ——— میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر چمک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اس کی زد میں آئے، سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔

اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر گیا تھا۔ میں نے اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا: ”ممّد بھائی ——— یہ چھری تم اس طرح اپنے .... نیفے میں ——— یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو۔ اتنی تیز ہے، کیا تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟“

ممّد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

”منٹو بھائی ——— یہ چھری دوسروں کے لیے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے۔ سالی، اپنی چیز ہے، مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟“

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، یا بیٹی ہے۔ اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آ گیا ——— اس کا نام پنٹو تھا، اور میں منٹو ——— اس نے ممّد بھائی کو اپنے کرسچین انداز میں سلام کیا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا، وہ ممّد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر، لیکن کڑے الفاظ میں، جن میں تحکم تھا کہ دیکھو اگر تم نے منٹو بھائی کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پنٹو نے فرماں بردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی ——— سیتھو اسکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ مجھ سے میری بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں، ممّد بھائی سے کہا۔ ”کوئی فکر کی بات نہیں ——— ملیریا ہے ——— میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔“

ممد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنٹو کی بات سنی اور خنجر سے اپنی کلائی کے بال اڑاتے ہوئے کہا ”میں کچھ نہیں جانتا۔ انجکشن دینا ہے تو دے دو، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو............“

ڈاکٹر پنٹو کانپ گیا: ”نہیں ممد بھائی ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ممد بھائی نے خنجر اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ ”تو ٹھیک ہے۔“

”تو میں انجکشن لگاتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی ـــــ

”ٹھہرو ـــــ ٹھہرو ـــــ“

ممد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھ دی، اور ممیاتے ہوئے ممد بھائی سے مخاطب ہوا۔ ”کیوں؟“

”بس ـــــ میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ کھولی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پنٹو نے میرے کونین کا انجکشن لگایا۔ بڑے سلیقے سے، ورنہ ملیریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے فیس پوچھی۔ اس نے کہا۔ ”دس روپے!“ میں تکیئے کے نیچے سے اپنا بٹوا نکال رہا تھا کہ ممد بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنٹو کو دے رہا تھا۔

ممد بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”فیس دے رہا ہوں۔“

ممد بھائی ڈاکٹر پنٹو سے مخاطب ہوا۔ ”سالے یہ فیس کیسی لے رہے ہو؟“

ڈاکٹر پنٹو بوکھلا گیا۔ ”میں کب لے رہا ہوں ـــــ یہ دے رہے تھے!“

”سالا ـــــ ہم سے فیس لیتے ہو ـــــ واپس کرو یہ نوٹ!“ ممد بھائی کے لہجے میں اس کے خنجر ایسی تیزی تھی۔

ڈاکٹر پنٹو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممد بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

ممد بھائی نے ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تاؤ دیا اور مسکرایا: ”منٹو

بھائی۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے ——— تمہاری قسم، اپنی مونچھیں منڈوا دیتا اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی ——— یہاں سب تمہارے غلام ہیں۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "ممد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

ممد بھائی کی مونچھیں تھرتھرائیں۔ "ممد بھائی کسے نہیں جانتا ——— ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے ——— اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی۔ آئی۔ ڈی۔ ہے۔ وہ ہمیں بتاتی رہتی ہے ——— کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت میں ہے، کون بری حالت میں ——— تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں نے ازراہ تفنن پوچھا۔ "کیا جانتے ہیں آپ؟"

"سالا ——— ہم کیا نہیں جانتے ——— تم امرتسر کا رہنے والا ہے ——— کشمیری ہے ——— یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے ——— تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اسی لیے تم ادھر سے نہیں گزرتے۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کو روتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔"

میں پانی پانی ہو گیا۔

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا۔ "منٹو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیئے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار اگر منٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا ——— اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ بیمار تھا، کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت محنت کرنی پڑتی ——— میں صرف اتنا کہہ سکا۔ "ممد بھائی! خدا تمہیں زندہ رکھے ——— تم خوش رہو۔"

ممد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کیے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنٹو ہر روز صبح شام آتا رہا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا مگر اس نے

کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”نہیں، مسٹر منٹو! ممّد بھائی کا معاملہ ہے۔ میں ایک ڈیڑھیا بھی نہیں لے سکتا۔

میں نے سوچا یہ ممّد بھائی کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ یعنی خوفناک قسم کا جس سے ڈاکٹر پنٹو جو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے، ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرأت نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔

بیماری کے دوران میں ممّد بھائی بھی بلاناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا، کبھی شام کو، اپنے چھ ساتھ شاگردوں کے ساتھ۔ اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا تھا کہ معمولی ملیریا ہے، تم ڈاکٹر پنٹو کے علاج سے انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔

پندرہ روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں ممّد بھائی کے ہر خدوخال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر یہی پچیس تیس کے درمیان ہو گی۔ پتلی پتلی بانہیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھرتیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا سا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا تو وہ سیدھا اس کے دل میں کھبتا تھا۔ یہ مجھے عرب گلی کے لوگوں نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ اس نے کسی کو قتل کیا تھا، میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چھری مار وہ اوّل درجے کا تھا۔ بنوٹ اور گتکے کا ماہر۔ یوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے، مگر میں یہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن پر جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوف ناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے رہتا ہے؟

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنا وہی خوف ناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”ممّد بھائی۔ آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے ـــــ تم یہ خنجر کیوں لئے پھرتے ہو؟“

ممّد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا۔ ”منٹو بھائی! بندوق پستول میں کوئی مزا نہیں۔ انہیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔ گھوڑا دبایا اور ٹھاہ .... اس میں کیا مزا ہے ـــــ یہ چیز .... یہ خنجر .... یہ چھری .... یہ چاقو .... مزا آتا ہے نا،

خدا کی قسم — یہ وہ ہے .... تم کرا کہا کرتے ہو .... ہاں .... آرٹ .... اس میں آرٹ ہوتا ہے میری جان .... جس کو چاقو یا چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے۔ پستول کیا ہے — کھلونا ہے — جو نقصان پہنچا سکتا ہے — پر اس میں کیا لطف آتا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تم یہ جر دیکھو — اس کی تیز دھار دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا۔" اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا — بس، یوں پیٹ کے اندر داخل کر دو — اس صفائی سے کہ اس سالے کو معلوم تک نہ ہو .... بندوق پستول سب بکواس ہے۔"

ممّد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنونِ احسان تھا — لیکن جب میں اس کا ذکر کیا کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم ہے۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے کوئی تکلیف ہو، ممّد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور یہ اس کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دادا تھا۔ یعنی ایک خطرناک غنڈہ۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی اس طرح پرورش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی مونچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا، جیسے خار پشت کا — مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ممّد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھاتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک تھیں۔ در اصل مونچھوں کا نام ہی ممّد بھائی تھا — یا اس خنجر کا جو اس کی تنگ گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا، نہ معلوم کیوں — ممّد بھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا، لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا

ذرائع تھے، پر وہ ہر حاجت مند کی بروقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا، اس لئے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

میری اس کی بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ان پڑھ تھا، لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کرتے تھے۔ ایک دن صبح سویرے، دفتر جاتے وقت میں نے چینی کے ہوٹل میں کسی سے سنا کہ ممّد بھائی گرفتار کرلیا گیا ہے۔ مجھے بہت تعجب ہوا، اس لئے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہوسکتی تھی ——— میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو ممّد بھائی گرفتار ہوگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسی عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے جس کا نام شیریں بائی ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے، اس کو کل ایک آدمی نے خراب کردیا۔ یعنی اس کی عصمت دری کردی۔ شیریں بائی روتی ہوئی ممّد بھائی کے پاس آئی اور اس سے کہا۔ ”تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برا کیا ہے ——— لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو۔“ ممّد بھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا۔ ”تم چاہتی کیا ہو؟“ اس نے کہا۔ ”میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس حرام زادے کا پیٹ چاک کردو۔“

ممّد بھائی اس وقت ہوٹل میں سیس پاؤ کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سن کر اس نے اپنے نیفے میں سے خنجر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی اور بڑھیا سے کہا۔ ”جا ——— تیرا کام ہو جائے گا۔“

اور اس کا کام ہوگیا ——— دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہوگیا۔

ممّد بھائی گرفتار تو ہوگیا تھا، مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چابک دستی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کردیا گیا۔

وہ دو دن حوالات میں رہا تھا، مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی، انسپکٹر، سب انسپکٹر، سب اس کو جانتے تھے۔ لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اوپر کو اٹھی

ہوتی تھیں، اب کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔

چینی کے ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے، جو ہمیشہ اجلے ہوتے تھے میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی لیکن اس نے خود کہا۔ ''منٹو صاحب! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالا دیر سے مرا ـــــ چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑا ـــــ لیکن وہ بھی اس سالے کا قصور تھا ـــــ ایک دم مڑ گیا اور اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا ـــــ لیکن مر گیا ـــــ ذرا تکلیف کے ساتھ، جس کا مجھے افسوس ہے۔''

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میرا ردعمل کیا ہوگا۔ یعنی اس کو افسوس تھا کہ وہ اسے بطریق احسن قتل نہ کر سکا، اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔

مقدمہ چلنا تھا ـــــ اور ممدّ بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے پہلے بھی قتل کیے تھے کہ نہیں، لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق تھا وہ مجسٹریٹ، وکیل اور گواہ سے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، اس لئے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔

وہ بہت فکر مند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہو گئی تو ممدّ بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کیسے حاضر ہوا جاتا ہے، اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرخت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا اور مجھ سے کہتا تھا۔ ''منٹو صاحب! میں مر جاؤں گا، پر کورٹ میں نہیں جاؤں گا ـــــ سالی، معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔''

عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انہوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں، ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف یقینی طور پر کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، اس کی صرف مونچھیں ہی تھیں جو اس کو خوفناک بناتی تھیں ـــــ اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہرگز ہرگز 'دادا' دکھائی نہ دیتا۔ اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی کے ہوٹل میں جب میری اس کی ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے

ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہوا تو بہت ممکن ہے اس کو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے، اس لئے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کو مونچھوں کی فکر تھی کیونکہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا۔ ’’ممد بھائی ——— کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کے ساتھ کبھی نہ جانا۔ مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا۔‘‘

اور وہ سوچتا تھا ——— ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے ——— لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خنجر معلوم نہیں جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا، اپنے نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ’’ممد بھائی ——— یہ کیا؟‘‘

’’کچھ نہیں، ومٹو بھائی۔ بہت گھوٹالا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے۔ یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزا دے گا ——— اب بولو، میں کیا کروں؟‘‘

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفناک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا۔ ’’ممد بھائی! بات تو ٹھیک ہے ——— تمہاری مونچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر ضرور اثر انداز ہوں گی ——— سچ پوچھو تو جو کچھ ہوگا، تمہارے خلاف نہیں — مونچھوں کے خلاف ہوگا۔‘‘

’’تو میں منڈوا دوں؟‘‘ ممد بھائی نے اپنی چہیتی مونچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری۔ ——— میں نے اس سے پوچھا۔ ’’تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’میرا خیال جو کچھ بھی ہے، وہ تم نہ پوچھو ——— لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انہیں منڈوا دوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں ومٹو بھائی؟‘‘

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا۔ ’’ہاں، اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو ——— عدالت کا سوال ہے، اور تمہاری مونچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔‘‘

دوسرے دن ممد بھائی نے اپنی مونچھیں ——— اپنی جان سے عزیز مونچھیں منڈوا ڈالیں۔ کیونکہ اس کی عزت خطرے میں تھی ——— لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر ———

مسٹر ایف۔ ایچ۔ ٹیگ کی عدالت میں اس کا مقدمہ تھا۔ مونچھوں کے بغیر ممد بھائی

پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی، لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں ـــــ مگر وہاں کوئی بال ہی نہیں تھا۔

شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا، میری اس کی ملاقات ایرانی کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی ـــــ مونچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا۔ ”کیا بات ہے ممّد بھائی؟“

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا۔ ”سالا، اب ممّد بھائی ہی نہیں رہا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا جا چکا ہے۔ ”کوئی بات نہیں ممّد بھائی ـــــ یہاں نہیں تو کسی اور جگہ سہی!“

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں ”سالا ـــــ اپن کو یہ غم نہیں ـــــ یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں ـــــ یہ سالی مونچھیں کیوں منڈوائیں؟“

پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو مونچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا، ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا۔ ”سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا ـــــ“

مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ ”سالا تم کیسا آدمی ہے، منٹو ـــــ ہم سچ کہتا ہے، خدا کی قسم ـــــ ہمیں پھانسی لگا دیتے ـــــ پر .... یہ بے وقوفی تو ہم نے خود کی ـــــ آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا ـــــ سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔“

یہ کہہ کر اس نے دوہتڑ اپنے منہ پر مارا۔ ”ممّد بھائی لعنت ہے تجھ پر ـــــ سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا اب جا اپنی ماں کے ....“ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔

☆☆☆

دودا پہلوان

مجموعہ: پھندے **اشاعت: 1955** **معیار: ۳ ستارے**

اسکول میں پڑھتا تھا تو شہر کا حسین ترین لڑکا متصوّر ہوتا تھا۔ اس پر بڑے بڑے امرد پرستوں کے درمیان بڑی خونخوار لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دو اسی سلسلے میں مارے بھی گئے۔

وہ واقعی حسین تھا۔ بڑے مالدار گھرانے کا چشم و چراغ تھا اس لئے اس کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ مگر جس میدان میں وہ کود پڑا تھا اس کو ایک محافظ کی ضرورت تھی جو وقت پر اس کے کام آسکے۔ شہر میں یوں تو سیکڑوں بدمعاش اور غنڈے موجود تھے جو حسین و جمیل صلاحو کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھے، مگر دودے پہلوان میں ایک نرالی بات تھی۔ وہ بہت مفلس تھا، بہت بدمزاج اور اکھڑ طبیعت کا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس میں ایسا بانکپن تھا کہ صلاحو نے اس کو دیکھتے ہی پسند کرلیا اور ان کی دوستی ہوگئی۔

صلاحو کو دودے پہلوان کی رفاقت سے بہت فائدے ہوئے۔ شہر کے دوسرے غنڈے جو صلاحو کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب ہو سکتے تھے، دودے کی وجہ سے خاموش رہے۔ اسکول سے نکل کر صلاحو کالج میں داخل ہوا تو اس نے اور پَر پُرزے نکالے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی سرگرمیاں نیا رخ اختیار کر گئیں۔ اس کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ صلاحو کا باپ مر گیا۔ اب وہ اس کی تمام جائداد، املاک کا واحد مالک تھا۔ پہلے تو اس نے نقدی پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر مکان گروی رکھنے شروع کئے۔ جب دو مکان بک گئے تو ہیرا منڈی کی تمام طوائفیں صلاحو کے نام سے واقف تھیں۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن لوگ کہتے

ہیں کہ ہیرامنڈی میں بوڑھی نائکائیں اپنی جوان بیٹیوں کو صلاحو کی نظروں سے چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ مبادا وہ اس کے حسن کے چکّر میں پھنس جائیں۔ لیکن ان احتیاطی تدابیر کے باوجود جیسا کہ سننے میں آیا ہے، کئی کنواری طوائف زادیاں اس کے عشق میں گرفتار ہوئیں اور اُلٹے راستے پر چل کر اپنی زندگی کے سنہرے ایام اس کے تلوّن کی نذر کر بیٹھیں۔

صلاحو کھل کھیل رہا تھا۔ دودے کو معلوم تھا کہ یہ کھیل دیر تک جاری نہیں رہے گا۔ وہ عمر میں صلاحو سے دوگنا بڑا تھا۔ اس نے ہیرامنڈی میں بڑے بڑے سیٹھوں کی خاک اڑتے دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہیرامنڈی ایک ایسا اندھا کنواں ہے جس کو دنیا بھر کے سیٹھ مل کر بھی اپنی دولت سے نہیں بھر سکتے۔ مگر وہ اس کو کوئی نصیحت نہیں دیتا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ جہاندیدہ ہونے کے باعث اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جو بھوت اس کے حسین وجمیل بابو کے سر پر سوار ہے، اسے کوئی ٹونا ٹوٹکا اتار نہیں سکتا۔

دودا پہلوان ہر وقت صلاحو کے ساتھ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں جب صلاحو نے ہیرامنڈی کا رخ کیا تو اس کا خیال تھا کہ دودا بھی اس کے عیش میں شریک ہوگا۔ مگر آہستہ اسے معلوم ہوا کہ اس کو اس قسم کے عیش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں وہ دن رات غرق رہتا تھا۔ وہ گانا سنتا تھا، شراب پیتا تھا۔ طوائفوں سے فحش مذاق بھی کرتا تھا، مگر اس سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔ اس کا بابو رات رات بھر اندر کسی معشوق کو بغل میں دبائے پڑا رہتا اور وہ باہر کسی پہرے دار کی طرح جاگتا رہتا۔

لوگ سمجھتے تھے کہ دودے نے اپنا گھر بھر لیا ہے۔ دولت کی لُوٹ مچی ہے۔ اس میں اس نے یقیناً اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب صلاحو داد عیش دینے کو نکلتا تھا تو ہزاروں نوٹ دودے ہی کی تحویل میں ہوتے تھے۔ مگر یہ صرف اسی کو معلوم تھا کہ پہلوان نے ان میں سے ایک پائی بھی کبھی اِدھر اُدھر نہیں کی۔ اس کو صرف صلاحو سے دلچسپی تھی جس کو وہ اپنا آقا سمجھتا تھا اور یہ لوگ بھی جانتے تھے کہ دودا کس حد تک اس کا غلام ہے۔ صلاحو اس کو ڈانٹ ڈپٹ لیتا تھا۔ بعض اوقات شراب کے نشے میں اسے مار پیٹ بھی لیتا تھا مگر وہ خاموش رہتا۔ حسین وجمیل صلاحو اس کا معبود تھا۔ وہ اس کے حضور کوئی گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن اتفاق سے دودا بیمار تھا۔ صلاحو رات کو حسب معمول عیش کرنے کے لئے

ہیرامنڈی پہنچا۔ وہاں کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے کے دوران میں اس کی جھڑپ ایک تماش بین سے ہوگئی اور ہاتھاپائی میں اس کے ماتھے پر ہلکی سی خراش آ گئی۔ دودے کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے دیوار کے ساتھ ٹکریں مار مار کر اپنا سارا سر زخمی کر لیا۔ خود کو بے شمار گالیاں دیں۔ بہت برا بھلا کہا۔ اس کو اتنا افسوس ہوا کہ دس پندرہ دن تک صلاحو کے سامنے اس کا سر جھکا رہا۔ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ چنانچہ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بہت دیر تک نمازیں پڑھ پڑھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا۔

صلاحو کی وہ اس طرح خدمت کرتا تھا جس طرح پرانے قصے کہانیوں کے وفادار نوکر کرتے ہیں۔ وہ اس کے جوتے پالش کرتا تھا۔ اس کے پاؤں دابتا تھا۔ اس کے چمکیلے بدن پر مالش کرتا تھا۔ اس کے ہر آرام اور آسائش کا خیال رکھتا تھا، جیسے اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔

کبھی کبھی صلاحو ناراض ہو جاتا۔ یہ وقت دودے پہلوان کے لئے بڑی آزمائش کا وقت ہوتا تھا۔ دنیا سے بیزار ہو جاتا۔ فقیروں کے پاس جا کر تعویز گنڈے لیتا۔ خود کو طرح طرح کی جسمانی تکلیف پہنچاتا۔ آخر جب صلاحو موج میں آ کر اسے بلاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ دونوں جہان مل گئے ہیں۔ دودے کو اپنی طاقت پر ناز نہیں تھا، اسے یہ بھی گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ چھری مارنے کے فن میں یکتا ہے۔ اس کو اپنی ایمانداری اور اپنے خلوص پر بھی کوئی فخر نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی اس بات پر بہت نازاں تھا کہ لنگوٹ کا پکا ہے۔ وہ اپنے دوستوں، یاروں کو بڑے فخر و امتہاج سے بتایا کرتا تھا کہ اس کی جوانی میں سینکڑوں مردمار عورتیں آئیں، چلتروں کے بڑے بڑے منتر اس پر پھونکے مگر وہ — شاباش ہے اس کے استاد کو، لنگوٹ کا پکا رہا۔

یہ بڑ نہیں تھی۔ ان لوگوں کو جو دودے پہلوان کے لنگوٹیے تھے، اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا دامن عورت کی تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ متعدد بار کوشش کی گئی کہ وہ گمراہ ہو جائے مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ثابت قدم رہا۔

خود صلاحو نے کئی بار اس کا امتحان لیا۔ اجمیر کے عرس پر اس نے میرٹھ کی ایک کافر ادا طوائف انوری کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دودے پہلوان پر ڈورے ڈالے۔ اس نے اپنے تمام گر استعمال کر ڈالے مگر دودے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عرس ختم ہونے پر جب وہ لاہور روانہ ہوئے تو گاڑی میں اس نے صلاحو سے کہا۔ "باؤ! بس اب میرا کوئی اور امتحان نہ لینا۔ یہ سالی انوری بہت

آگے بڑھ گئی تھی۔ تمہارا خیال تھا ورنہ گلا گھونٹ دیتا حرامزادی کا۔"

اس کے بعد صلاحو نے اس کا اور کوئی امتحان نہ لیا۔ دودے کے یہ تنبیہی الفاظ کافی تھے جو اس نے بڑے سنگین لہجے میں ادا کئے تھے۔

صلاحو عیش و عشرت میں بدستور غرق تھا۔ اس لئے کہ ابھی تین چار مکان باقی تھے۔ ہیرامنڈی کی تمام قابل ذکر طوائفیں ایک ایک کر کے اس کے پہلو میں آ چکی تھیں۔ اب اس نے جھوٹے جاموں کا دور شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران میں جانے کہاں سے ایک طوائف الماس پیدا ہو گئی جو ایک دم ساری ہیرامنڈی پر چھا گئی۔ دیکھا کسی نے بھی نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس کے حسن کے چرچے عام تھے۔ ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے۔ پانی پیتی ہے تو اس کے شفاف حلق میں سے نظر آتا ہے۔ ہرنی کی سی آنکھیں ہیں جن میں خدا نے اپنے ہاتھ سے سرمہ لگایا ہے۔ بدن ایسا ملائم ہے کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی ہیں۔ صلاحو جہاں بھی جاتا تھا، اس پری چہرہ اور حور شمائل معشوقہ کے حسن و جمال کی باتیں سنتا تھا۔

دودے پہلوان نے فوراً پتہ لگایا اور اپنے بابو کو بتایا کہ یہ الماس کشمیر سے آئی ہے۔ واقعی خوبصورت ہے۔ ادھیڑ عمر کی ماں اس کے ساتھ ہے جو اس پر بہت کڑی نگرانی رکھتی ہے۔ اس لئے کہ وہ لاکھوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔

جب الماس کا مجرا شروع ہوا تو اس کے کوٹھے پر صرف وہی صاحب ثروت جاتے تھے جن کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔ صلاحو کے پاس اب اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ ان تگڑے دولت مند عیاشوں کا مقابلہ خم ٹھونک کے کر سکے۔ آٹھ دس مجروں ہی میں اس کی حجامت ہو جاتی۔ چنانچہ وہ اسی خیال کے تحت خاموش رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ دودا پہلوان اپنے بابو کی یہ بے چارگی دیکھتا تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا۔ ایک صرف اس کی جان تھی مگر وہ اس معاملے میں کیا کام دے سکتی تھی؟

بہت سوچ بچار کے بعد آخر دودے نے ایک ترکیب سوچی جو یہ تھی کہ صلاحو، الماس کی ماں اقبال سے رابطہ پیدا کرے۔ اس پر یہ ظاہر کرے کہ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس طرح جب موقع ملے تو الماس کو اپنے قبضے میں کر لے۔

صلاحو کو یہ ترکیب پسند آئی۔ چنانچہ فوراً اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اقبال بہت خوش

ہوئی کہ اس ڈھلتی عمر میں اسے صلاحو جیسا خوبرو چاہنے والا مل گیا۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اس دوران میں سینکڑوں مرتبہ الماس صلاحو کے سامنے آئی۔ بعض اوقات اس کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی کرتی رہی اور اس کے حسن سے کافی متاثر ہوئی۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ اس کی ماں سے کیوں دلچسپی لے رہا ہے، جب کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ لیکن اس کی یہ حیرت، بہت دیر تک قائم نہ رہی۔ جب اس کو صلاحو کی حرکات وسکنات سے معلوم ہو گیا کہ وہ چال چل رہا ہے، اس انکشاف سے اسے خوشی ہوئی۔ اندرونی طور پر اس کے احساسِ جوانی کو بڑی ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

باتوں باتوں میں ایک دن صلاحو کا ذکر آیا تو الماس نے اس کی خوبصورتی کی تعریف ذرا چٹخارے کے ساتھ بیان کی، جو اس کی ماں اقبال کو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں میں خوب چخ ہوئی۔ الماس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ صلاحو اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اقبال کو بہت دکھ ہوا۔ یہاں اب بیٹی کا سوال نہیں تھا بلکہ رقیب کا یا موت کا۔ چنانچہ دوسرے روز جب صلاحو آیا تو اس نے سب سے پہلے اس سے پوچھا۔ ’’آپ کسے پسند کرتے ہیں، مجھے یا میری بیٹی الماس کو؟‘‘

صلاحو عجب مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس کو بالآخر یہی کہنا پڑا۔ ’’تمہیں، میں تو صرف تمہیں پسند کرتا ہوں‘‘ اور پھر اسے اقبال کو مزید یقین دلانے کے لیے اور بہت سی باتیں گڑھنا پڑیں۔ اقبال یوں تو بڑی چالاک تھی مگر اس کو کسی حد تک یقین آ ہی گیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی عمر کے ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں اسے چند جھوٹی باتوں کو بھی سچا سمجھنا ہی پڑتا تھا۔

جب یہ بات الماس تک پہنچی تو وہ بہت جزبز ہوئی۔ جونہی اسے موقع ملا، اس نے صلاحو کو پکڑ لیا اور اس سے سچ اُگلوانے کی کوشش کی۔ صلاحو زیادہ دیر تک اس کی جرح برداشت نہ کرسکا۔ آخر اسے ماننا ہی پڑا کہ اسے اقبال سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل میں تو الماس کا حصول ہی اس کے پیش نظر ہے۔

یہ قبولوانے پر الماس کی تسلی ہو گئی۔ مگر وہ لگاؤ جو اس کے دل و دماغ میں صلاحو کے متعلق پیدا ہوا تھا، غائب ہو گیا اور اس نے ٹھیٹ طوائف بن کر اپنی ماں کو سمجھایا کہ بچپنا چھوڑ دو اور اس سے میرے دام وصول کرو، تمہیں وہ کیا دے گا۔ اپنی لڑکی کی یہ عقل والی بات اقبال کی سمجھ میں

آگئی اور وہ صلاحو کو دوسری نظر سے دیکھنے لگی۔

صلاحو بھی سمجھ گیا کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ نیلام میں الماس کی سب سے بڑھ کر بولی دے۔ دودے پہلوان نے ادھر ادھر سے کرید کر معلوم کیا کہ الماس کی نتھنی اُتر سکتی ہے، اگر صلاحو پچیس ہزار روپے اس کی ماں کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

صلاحو اب پوری طرح جکڑا جا چکا تھا۔ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ اس نے دو مکان بیچے اور پچیس ہزار روپے حاصل کر کے اقبال کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی رقم پیدا نہیں کر سکے گا۔ جب وہ لے آیا، تو وہ بوکھلا سی گئی۔ الماس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ پہلے اس سے کہو کہ ہمارے ساتھ کلیر شریف کے عرس پر چلے۔ صلاحو کو جانا پڑا اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پورے پندرہ ہزار روپے مجروں میں اُڑ گئے۔ اس کی ان تماش بینوں پر جو عرس میں شریک ہوئے تھے، دھاک تو بیٹھ گئی مگر اس کے پچیس ہزار روپوں کو دیمک لگ گئی۔ واپس آئے تو باقی کا روپیہ آہستہ آہستہ الماس کی فرمائشوں کی نذر ہو گیا۔ دودا اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اقبال اور الماس دونوں کا سر اُڑا دے۔ مگر اسے اپنے بابو کا خیال تھا۔ اس کے دل میں بہت سی باتیں تھیں جو وہ صلاحو کو بتانا چاہتا تھا۔ مگر بتا نہیں سکتا تھا۔ اس سے اسے اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ صلاحو بہت بری طرح الماس پر لٹو تھا۔ پچیس ہزار روپے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ اب وہ دس ہزار روپے اس مکان کو گروی رکھ کر اجاڑ رہا تھا جس میں اس کی نیک سیرت ماں رہتی تھی۔ یہ روپیہ کب تک اس کا ساتھ دیتا۔ اقبال اور الماس دونوں جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب اس پر نالش ہوئی اور عدالت نے قرقی کا حکم دے دیا۔

صلاحو بہت پریشان ہوا، اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو اسے قرض دیتا۔ لے دے کے ایک مکان تھا، سو وہ بھی گروی تھا اور قرقی آئی ہوئی تھی، اور حلیف صرف دودے پہلوان کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے جس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد روپے کا بندوبست کر دے گا۔

صلاحو بہت ہنسا تھا کہ دودا کہاں سے روپے کا بندوبست کرے گا۔ سو دو سو روپے کی بات ہوتی تو اسے یقین آ جاتا۔ مگر سوال پورے دس ہزار روپے کا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلوان کا

بڑی بے دردی سے مذاق اُڑایا تھا کہ وہ اس کو طفل تسلیاں دے رہا ہے۔

پہلوان نے یہ لعن طعن خاموشی سے برداشت کی اور چلا گیا۔ دوسرے روز آیا تو اس کا شنگرف ایسا چہرہ زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بستر علالت پر سے اُٹھ کر آیا ہے۔ سر نیوڑھا کر اس نے اپنے ڈب میں سے رومال نکالا جس میں سو سو کے کئی نوٹ تھے، اور صلاحو سے کہا۔ ”لے باؤ —— لے آیا ہوں۔“

صلاحو نے نوٹ گنے۔ پورے دس ہزار تھے۔ ٹکر ٹکر پہلوان کا منہ دیکھنے لگا۔

”یہ روپیہ کہاں سے پیدا کیا تم نے؟“

دودے نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”ہو گیا پیدا کہیں سے۔“

صلاحو قرقی کو بھول گیا۔ اتنے سارے نوٹ دیکھے تو اس کے قدم پھر الماس کے کوٹھے کی طرف اُٹھنے لگے۔ مگر پہلوان نے اسے روکا۔

”نہیں باؤ —— الماس کے پاس نہ جاؤ۔ یہ روپیہ قرقی والوں کو دو۔“

صلاحو نے بگڑے ہوئے بچے کی مانند کہا۔ ‘کیوں؟ —— میں جاؤں گا الماس کے پاس“

دودے نے کڑے لہجے میں کہا۔ ”تو نہیں جائے گا!“

صلاحو طیش میں آگیا۔ ”تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا!“

دودے کی آواز نرم ہو گئی۔ ”میں تیرا غلام ہوں باؤ —— پر اب الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”کیوں“

دودے کی آواز میں لرزش سی پیدا ہو گئی: ”نہ پوچھ باؤ۔ یہ روپیہ مجھے اسی نے دیا ہے۔“

صلاحو قریب قریب چیخ اٹھا۔ ”یہ روپیہ الماس نے دیا ہے —— تمہیں دیا ہے؟“

”ہاں باؤ، اسی نے دیا ہے۔ مجھ پر بہت دیر سے مرتی تھی سالی۔ پر میں اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ تجھ پر تکلیف کا وقت آیا تو میرے دل نے کہا دودے چھوڑ اپنی قسم کو۔ تیرا باؤ تجھ سے قربانی مانگتا ہے۔ سو میں کل رات اس کے پاس گیا اور .... اور .... اور .... اس سے یہ سودا کر لیا۔“

دودے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

☆☆☆

پھوجا حرام دا

اشاعت: ادبِ لطیف (لاہور)　　اپریل ۱۹۵۴　　معیار: ۳ ستارے

ٹی ہاؤس میں حرامیوں کی باتیں شروع ہوئیں تو یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔

ہر ایک نے کم از کم ایک حرامی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے جس سے اس کو اپنی زندگی میں واسطہ پڑ چکا تھا ——— کوئی جالندھر کا تھا، کوئی سیالکوٹ کا؛ کوئی لدھیانے کا اور کوئی لاہور کا؛ مگر سب کے سب اسکول یا کالج کی زندگی سے متعلق تھے۔

مہر فیروز صاحب سب سے آخر میں بولے ——— آپ نے کہا۔ ”امرتسر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو پھوجے حرام دے کے نام سے ناواقف ہو۔ یوں تو اس شہر میں اور بھی کئی حرام زادے تھے مگر اس کے پلّے کے نہیں تھے۔ وہ نمبر ایک حرام زادہ تھا۔ اسکول میں اُس نے تمام ماسٹروں کا ناک میں دَم کر رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر، جس کو دیکھتے ہی بڑے بڑے شیطان لڑکوں کا پیشاب خطا ہو جاتا تھا، پھوجے سے بہت گھبراتا تھا۔ اِس لئے کہ اُس پر اُن کے مشہور بید کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا؛ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تنگ آ کر اس کو مارنا چھوڑ دیا تھا......“

”یہ دسویں جماعت کی بات ہے...... ایک دن یار لوگوں نے اُس سے کہا۔ دیکھو پھوجے، اگر تم کپڑے اُتار کر ننگ دھڑنگ اسکول کا ایک چکّر لگاؤ تو ہم تمہیں ایک روپیہ دیں گے......“ پھوجے نے روپیہ لے کر کان میں اڑسا، کپڑے اُتار کر بستے میں باندھے اور سب کے سامنے ننگ دھڑنگ چلنا شروع کر دیا۔ وہ جس کلاس کے پاس سے گزرتا وہ زعفران زار بن جاتی...... چلتے چلتے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے چک اٹھائی

اور غڑاپ سے اندر داخل ہو گیا۔ معلوم نہیں، کیا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سخت بوکھلائے ہوئے باہر نکلے اور انھوں نے چپراسی کو بلا کر اس سے کہا: "جاؤ، بھاگ کے پھوجے کے گھر جاؤ اور اس کے کپڑے لے آؤ …… کہتا ہے، مسجد کے سقاوے میں نہا رہا تھا کہ کوئی چور اس کے کپڑے اٹھا کر لے گیا……"

"دینیات کے ماسٹر 'مولوی پوٹیٹو' تھے …… معلوم نہیں، انھیں پوٹیٹو کس رعایت سے کہتے تھے۔ کیونکہ آلوؤں کے تو داڑھی نہیں ہوتی …… ان سے پھوجا ذرا دبتا تھا…… ایک دن ایسا ہوا کہ انجمن کے ممبروں کے سامنے، جو اسکول چلاتے تھے، مولوی صاحب نے غلطی سے پھوجے سے ایک آیت کا ترجمہ پوچھ لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ خاموش رہتا مگر پھر پھوجا حرام دا پچانا کیسے جاتا؟ اس کے منہ میں جو آیا اس نے اول جلول بک دیا۔ مولوی پوٹیٹو کے پسینے چھوٹ گئے۔ ممبروں کے جاتے ہی انھوں نے اپنا عصا اٹھایا اور پھوجے کو وہ چار چوٹ کی مار ماری کہ وہ بلبلا اٹھا مگر پھر بھی بڑے ادب سے کہتا رہا: "مولوی صاحب، میرا کوئی قصور نہیں …… مجھے کلمہ ٹھیک سے نہیں آتا اور آپ نے ایک پوری آیت کا مطلب پوچھ لیا" …… مارنے سے بھی مولوی پوٹیٹو صاحب کا جی ہلکا نہ ہوا۔ وہ پھوجے کے باپ کے پاس گئے اور اس سے شکایت کی۔ پھوجے کے باپ نے ان کی سب باتیں سنیں اور بڑے رحم ناک لہجے میں کہا: "مولوی صاحب، میں اس سے خود عاجز آ گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے …… ابھی کل کی بات ہے۔ میں پاخانے گیا تو اس نے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ میں اندر سے بہت گرجا اور اسے بے شمار گالیاں دیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ اگر میں اٹھنی دینے کا وعدہ کروں تو دروازہ کھلے گا اور اگر وعدہ کر کے پھر جاؤں گا تو وہ اگلی مرتبہ کنڈی میں تالہ بھی ڈال دے گا …… ناچار پہلے وعدہ کرنا پڑا، پھر اٹھنی دینی پڑی۔ اب بتایئے، میں ایسے نابکار لڑکے کا کیا کروں……"

"اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ اس کا کیا ہو گا …… پڑھتا وڑھتا خاک بھی نہیں تھا …… انٹرنس کے امتحان ہوئے تو سب کو یقین تھا کہ بہت بری طرح فیل ہو گا، مگر نتیجہ نکلا تو سب سے زیادہ نمبر اسی کے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کالج میں داخل ہو، مگر اس کے باپ کی یہ خواہش تھی کہ وہ کوئی ہنر سیکھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دو برس تک آوارہ پھرتا رہا …… اس دوران میں اس نے جو حرامزدگیاں

کیس، ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"تنگ آکر اس کے باپ نے بالآخر اسے کالج میں داخل کرا دیا۔ پہلے ہی دن اس نے یہ شرارت کی کہ میتھ میٹکس کے پروفیسر کی سائیکل اٹھا کر ایک درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر لٹکا دی۔ سب حیران کہ سائیکل وہاں پہنچی کیونکر؟ مگر وہ لڑکے جو اسکول میں پھوجے کے ساتھ پڑھ چکے تھے، اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کارستانی پھوجے کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس ایک شرارت ہی سے اس کا پورے کالج سے تعارف ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"اسکول میں اس کی سرگرمیوں کا میدان محدود تھا۔ کالج میں یہ میدان بہت وسیع ہو گیا۔۔۔۔۔۔ پڑھائی میں، کھیلوں میں، مشاعروں اور مباحثوں میں، قیامت کی شرارتوں میں، ہر جگہ پھوجے کا نام روشن تھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کا نام اتنا روشن ہوا کہ سارے شہر میں اس کے غنڈپنے کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ بڑے جغادری بدمعاشوں کے کان کاٹنے لگا۔۔۔"

"اس کا قد ناٹا تھا مگر بدن کسرتی تھا۔ اس کی بھیڑو ٹکر بہت مشہور تھی۔ وہ ایسے زور سے مدّمقابل کے سینے میں، یا پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارتا کہ مدّمقابل کے سارے وجود میں زلزلہ سا آجاتا۔۔۔۔۔۔۔۔"

"الف اے کے دوسرے سال میں اس نے تفریحاً پرنسپل کی نئی موٹر کے پٹرول ٹینک میں چار آنے کی شکر ڈال دی جس نے کار کا سارا انجن غارت کر دیا۔ پرنسپل کو کسی نہ کسی طریقے سے معلوم ہو گیا کہ یہ خطرناک شرارت پھوجے کی ہے، مگر حیرت ہے انھوں نے اس کو معاف کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پھوجے کو ان کے بہت سے راز معلوم تھے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"یہ وہ زمانہ تھا، جب کانگریس کا بہت زور تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انگریزوں کے خلاف کُھلّم کُھلّا جلسے ہوتے تھے۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کئی ناکام سازشیں ہو چکی تھیں۔ گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ سب جیل باغیوں سے پُر تھے۔ آئے دن ریل کی پٹریاں اکھاڑی جاتی تھیں۔ خطوں کے بھبکوں میں آتش گیر مادہ ڈالا جاتا تھا۔ بم بنائے جا رہے تھے۔ پستول برآمد ہوتے تھے۔ غرض کہ ایک ہنگامہ برپا تھا جس میں اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم بھی شامل تھے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"پھوجا سیاسی آدمی بالکل نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے، اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ

مہاتما گاندھی کون ہے، لیکن جب اچانک ایک روز اسے پولیس نے گرفتار کرلیا اور وہ بھی ایک سازش کے سلسلے میں، تو سب کو بڑی حیرت ہوئی..........''

''اس سے پہلے کئی سازشیں پکڑی جاچکی تھیں۔ سانڈرس کے قتل کے سلسلے میں بھگت سنگھ اور دت کو پھانسی ہوچکی تھی۔ اس لئے یہ نیا معاملہ بھی کچھ سنگین ہی معلوم ہوتا تھا...... الزام یہ تھا کہ مختلف کالجوں کے لڑکوں نے مل کر ایک خفیہ جماعت بنائی ہے جس کا مقصد حضور ملکِ معظم کی سلطنت کا تختہ الٹنا ہے..........''

''کچھ لڑکوں نے کالج کی لیباریٹری سے پکرک ایسڈ چرایا تھا جو بم بنانے کے کام آتا ہے.......... پھوجے کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ اس چوری میں شریک تھا اور اس کو تمام خفیہ باتوں کا علم تھا..........''

''اس کے ساتھ کالج کے دو اور لڑکے بھی پکڑے گئے تھے۔ ان میں ایک مشہور بیرسٹر کا لڑکا تھا اور دوسرا رئیس زادہ۔ دونوں ڈاکٹری معائنے کے مطابق مریض تھے، اس لئے پولیس کی مار پیٹ سے بچ گئے.......... شامت غریب پھوجے حرام دے کی آئی۔ تھانے میں اس کو لٹکا لٹکا کر پیٹا گیا۔ برف کی سلوں پر کھڑا کیا گیا۔ غرض کہ ہر قسم کی جسمانی اذیت اسے پہنچائی گئی کہ وہ راز کی باتیں اگل دے۔ مگر وہ بھی کُتّے کی ایک ہڈی تھا، ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ تھانے میں بھی کمبخت اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا..........''

''ایک مرتبہ جب وہ مار برداشت نہ کرسکا تو اس نے تھانیدار سے ہاتھ روک لینے کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ بتادے گا.......... وہ بالکل نڈھال تھا، اس لئے اس نے گرم گرم دودھ اور جلیبیاں مانگیں.......... جب اس کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو تھانیدار نے کاغذ قلم سنبھالا اور اس سے کہا۔ اب بتاؤ.......... پھوجے نے اپنے مار کھائے ہوئے اعضا کا جائزہ انگڑائی لے کر لیا اور جواب دیا۔ اب کیا بتاؤں، طاقت آگئی ہے چڑھا دو پھر مجھے ٹکٹکی پر..........''

''ایسے اور بھی کئی قصے ہیں جو مجھے یاد نہیں رہے، مگر یہ قصہ بہت پُرلطف ہے...... ملک حفیظ، جو ہمارا ہم جماعت تھا، اس کی زبان سے آپ سنتے تو اور ہی مزا آتا..........''

''ایک دن پولیس کے دو سپاہی پھوجے کو عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جا

رہے تھے کہ کچہری میں اس کی نظر ملک حفیظ پر پڑگئی جو کسی کام سے وہاں آیا تھا.......... ملک حفیظ کو دیکھتے ہی پھوجا پکارا۔ "السلام علیکم حفیظ صاحب" .... ملک حفیظ چونکا۔ پھوجا ہتھکڑیوں میں اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ملک صاحب، بہت اداس ہو گیا ہوں .... جی چاہتا ہے، آپ بھی آجائیں میرے پاس .... بس میرا نام لے دینا ہی کافی ہے ......"

ملک حفیظ نے جب پھوجے کی بات سُنی تو اس کی روح قبض ہو گئی .... پھوجے نے ملک حفیظ کو ڈھارس دی۔ "گھبراؤ نہیں ملک میں، تو مذاق کر رہا ہوں .... ویسے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ" ...... اب آپ ہی بتایئے کہ پھوجا کس لائق تھا۔ ملک حفیظ گھبرا رہا تھا اور کنّی کترا کے بھاگنے ہی والا تھا کہ پھوجے نے کہا۔ "بھئی اور تو ہم سے کچھ ہو نہیں سکتا، کہو تو تمہارے بدبودار کنویں کی گار نکلوا دیں ...."

"ملک حفیظ ہی آپ کو بتا سکتا ہے کہ پھوجے کو اس کنویں سے کتنی نفرت تھی ...... اس کنویں کے پانی سے ایسی بساند آتی تھی جیسی مرے ہوئے چوہوں سے آتی ہے .... معلوم نہیں، لوگ اسے صاف کیوں نہیں کراتے تھے ......"

"ایک ہفتے کے بعد، جیسا کہ ملک حفیظ کا بیان ہے، وہ باہر نہانے کے لئے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو تین ٹوبے کنویں کی گندگی نکالنے میں مصروف ہیں ...... ملک حفیظ بہت حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔ ٹوبوں کو بلایا کس نے ہے ...... پڑوسیوں کا خیال تھا کہ بڑے ملک صاحب کو بیٹھے بیٹھے خیال آگیا ہوگا کہ چلو کنویں کی صفائی ہو جائے، لوگ بھی کیا یاد رکھیں گے ...... لیکن پڑوسیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ چھوٹے ملک کو اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ اور یہ کہ بڑے ملک صاحب تو شکار پر گئے ہوئے ہیں تو انہیں بھی حیرت ہوئی ...... پولیس کے بے وردی سپاہیوں سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ پھوجے حرام دے کی نشاندہی پر کنویں میں سے بم نکلوا رہے ہیں ......"

"بہت دیر تک گندگی نکلتی رہی۔ پانی صاف شفاف ہو گیا، مگر بم تو کیا، ایک چھوٹا سا پٹاخہ بھی برآمد نہ ہوا پولیس بہت بھنّائی۔ چنانچہ پھوجے سے باز پرس ہوئی۔ اس نے مسکرا کر تھانیدار سے کہا۔ "بھولے بادشاہو، ہمیں تو اپنے یار کا کنواں صاف کرانا تھا، سو ہم نے کرا لیا ......"

"بڑی خوبصورت شرارت تھی، مگر پولیس نے پھوجے کو وہ مارا کہ مار مار کر ادھ موا کر دیا ...... اور پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ پھوجا سلطانی گواہ بن گیا ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ

وہ سب کچھ بک دے گا......"

"کہتے ہیں، اس پر بڑی لعن طعن ہوئی۔ اس کے دوست ملک حفیظ نے بھی، جو حکومت سے بہت ڈرتا تھا، اس کو بہت گالیاں دیں ——— حرام زادہ ڈر کے مارے غدار بن گیا ہے...... معلوم نہیں، اب کس کس کو پھنسائے گا......"

"بات اصل میں یہ تھی کہ وہ مار کھا کھا کے تھک گیا تھا۔ جیل میں اس کو کسی سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ مرغن غذائیں کھانے کو دی جاتی تھیں، مگر سونے نہیں دیا جاتا تھا۔ کم بخت کو نیند بہت پیاری تھی، اس لئے تنگ آکر اس نے سچے دل سے وعدہ کر لیا کہ وہ بم بنانے کی سازش کے جملہ حالات بتا دے گا۔"

"رکھا تو اسے جیل ہی میں گیا، مگر اب اس پر کوئی سختی نہ تھی۔ کئی دن تو اس نے آرام کیا کہ اس کے بند بند ڈھیلے ہو چکے تھے...... اچھی خوراک ملی اور بدن پر مالشیں ہوئیں تو وہ بیان لکھوانے کے قابل ہو گیا۔"

"صبح لسی کے یہ دو بڑے گلاس پی کر وہ اپنی داستان شروع کر دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتہ آتا تو اس سے فارغ ہو کر وہ پندرہ بیس منٹ آرام کرتا اور پھر کڑی سے کڑی ملا کر اپنا بیان جاری رکھتا......"

"آپ محمد حسین اسٹینوگرافر سے پوچھیے، جس نے پھوجے کا بیان ٹائپ کیا تھا...... اس کا کہنا ہے کہ پھوجے حرام دے نے پورا ایک مہینہ لیا اور وہ سارا جال کھول کے رکھ دیا جو سازشیوں نے ملک کے اس کونے سے اس کونے تک بچھایا ہوا تھا اور مزید بچھانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس نے سینکڑوں آدمیوں کے نام لئے اور ایسی ہزاروں جگہوں کا نام بتایا جہاں سازشی لک چھپ کے ملتے تھے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی ترکیبیں سوچتے تھے۔"

"وہ بیان، محمد حسین اسٹینوگرافر کا کہنا ہے، فل اسکیپ کے ڈھائی سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے...... جب پھوجے کا بیان ختم ہوا تو پولیس نے اسے سامنے رکھ کر پلان بنایا۔ چنانچہ فوراً نئی گرفتاریاں عمل میں آئیں اور ایک بار پھر پھوجے کی ماں بہن پنی جانے لگی۔"

"اخباروں نے بھی دبی زبان میں پھوجے کے خلاف کافی زہر اگلا...... اکثریت حکام کے خلاف تھی، اس لئے پھوجے کی غداری کی ہر جگہ مذمت ہونے لگی۔"

"پھوجا جیل میں تھا جہاں اس کی خوب خاطر تواضع ہو رہی تھی...... یہ بڑی طرّے والی کلف لگی پگڑی سر پر باندھے، دو گھوڑے کی بوسکی کی قمیض اور چالیس ہزار لٹھے کی گھیرے دار شلوار پہنے وہ جیل میں یوں ٹہلتا تھا جیسے کوئی افسر معائنہ کر رہا ہو۔"

"جب ساری گرفتاریاں عمل میں آ گئیں اور پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تو سازش کا یہ معرکہ انگیز کیس عدالت میں پیش ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

"پولیس کی حفاظت میں جب پھوجا نمودار ہوا تو غصّے سے بھرے ہوئے نعرے بلند ہوئے ——— "پھوجا حرام دا۔ مردہ باد...... پھوجا حرام دا۔ مردہ باد......" ہجوم بہت مشتعل تھا اور خطرہ تھا کہ پھوجے پر ٹوٹ نہ پڑے، اس لئے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ جس کے باعث کئی آدمی زخمی ہوئے۔"

"عدالت میں مقدمہ پیش ہوا...... جب پھوجے سے پوچھا گیا کہ وہ اس بیان کے متعلق کیا کہنا چاہتا ہے جو اس نے پولیس کو دیا تھا تو اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "جناب، میں نے کوئی بیان ویان نہیں دیا ہے...... ان لوگوں نے خود ہی ایک پلندہ سا تیار کیا تھا اور زبردستی مجھ سے دستخط کروا لئے تھے...... یہ سن کر انسپکٹر پولیس کی، بقول پھوجے، بھمیری بھول گئی۔ اور جب یہ خبر اخباروں میں چھپی تو سب چکرا گئے کہ پھوجے حرام دے نے یہ کیا نیا چکر چلایا ہے۔"

"چکر نیا ہی تھا، کیونکہ عدالت میں اس نے ایک نیا بیان لکھوانا شروع کر دیا جو پہلے بیان سے بالکل مختلف تھا...... نیا بیان قریب قریب پندرہ دن میں ختم ہوا، اور جب ختم ہوا تو فل اسکیپ کے ایک سو اٹھاون صفحے کالے ہو چکے تھے...... پھوجے کا کہنا ہے کہ اس نئے بیان سے جو حالت پولیس والوں کی ہوئی، ناقابلِ بیان ہے...... پولیس نے جو عمارت کھڑی کی تھی، کمبخت نے اس کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کے رکھ دی......"

سارا کیس چوپٹ ہو گیا...... نتیجہ یہ نکلا کہ اس سازش میں جتنے لوگ گرفتار ہوئے تھے، ان میں سے اکثر بری ہو گئے۔ دو کو تین تین برس کی اور پانچ کو چھ چھ مہینے کی سزائے قید ہوئی۔"

جو لوگ یہ قصہ فیروز صاحب سے سن رہے تھے، ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "اور

پھوجے کو؟"

مہر فیروز صاحب نے کہا۔ "پھوجے کو کیا ہوتا تھا...... وہ تو وعدہ معاف، یعنی سلطانی گواہ تھا۔"

سب نے پھوجے کی حیرت انگیز ذہانت کو سراہا کہ اس نے پولیس کو کس صفائی سے غچہ دیا۔

ایک نے، جس کے دل و دماغ کو پھوجے حرام دے کی شخصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا، مہر فیروز صاحب سے پوچھا۔ "پھوجا آج کل کہاں ہوتا ہے؟"

"یہیں لاہور میں ہے...... آڑھت کی دکان کرتا ہے۔"

اتنے میں بیرا بل لے کر آیا اور مہر فیروز صاحب کے سامنے رکھ دیا، کیونکہ چائے وغیرہ کا آرڈر انھوں نے دیا تھا۔

پھوجے کی شخصیت سے متاثر شدہ صاحب نے بل دیکھا اور ان کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا، اس لئے کہ رقم زیادہ تھی۔ چنانچہ وہ ایسے ہی مہر فیروز صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "آپ کے اس پھوجے سے کبھی ملنا چاہیے۔"

مہر فیروز اٹھے۔ "آپ اس سے مل چکے ہیں...... یہ خاکسار ہی پھوجا حرام دا ہے...... بل آپ ادا کر دیجئے گا...... السلام علیکم۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

ضمیمہ

پھُندنے

مجموعہ: پھُندنے　**اشاعت: 1955**

کوٹھی سے ملحقہ وسیع و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلّی نے بچے دیئے تھے جو بلا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کتیا نے بچے دیئے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے، اور جو دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے تھے۔ انکو زہر دیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی...... ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔

جانے کتنے برس گزر چکے تھے...... کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری بیونتی، کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیئے تھے جن کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بد عادت مرغیاں انڈے دیا کرتی تھیں جن کو ہر صبح وہ اٹھا کر اندر لے جاتی تھی۔

اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمیں ازار بند، جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا پھنسا ہوا تھا۔ اس زور سے قاتل پیچ دیئے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہو گئی تھی اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن نہیں ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے قتل کے بعد مرغیوں نے انڈے نہیں بلیوں نے بچے دیئے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی۔ کتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔

مکیشی ـــــ جھلمل جھلمل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا ـــــ سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی مشکیں بغلوں میں دبا کر منھ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنھیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے۔ پر جب صبح ہوئی تھی تو ان کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ سب کو زہر دے دیا گیا۔

دلہن کو جانے کیا سوجھی، کمبخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں، اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا جو بڑا اگل گوتھنا، لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مرگئی...... باپ بھی...... دونوں کو بچے نے مارا...... اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکائے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے، جو اسے گھورتے تھے۔ اس کو چھچھڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے، حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کے آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا مگر وہ نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں۔ مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہوگئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔

اب کتے بھونکنے لگے۔ نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے ہر فرش پر اچھلیں، ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں۔ کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔

جانے کیا ہوا، ان کتوں میں دو زہر کھا کر مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان کی جگہ آئی تھی جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا، گلے میں اس کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندا ڈال کر۔

اس کی ماں تھی۔ ادھیڑ عمر ملازمہ سے عمر میں چھ سات برس بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی

نہیں تھی۔ ہر روز صبح شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی اور بدعادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔ آملیٹ بناتی تھی، جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتے تو ان کو باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سہیلی آئی ـــــ پاکستان میل موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی۔ ایل۔ بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی تھیں۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی بلاؤز اتاری اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ ابلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے...... اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ ابلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ہل مل کر گنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئے۔

اس سہیلی کا بینڈ بج گیا...... مگر وہ وردی والے سپاہی پھندنے نچاتے نہیں آئے۔ ان کی جگہ پیتل کے برتن تھے۔ چھوٹے اور بڑے جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرج دار اور دھیمی...... دھیمی اور گرج دار۔

یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے

پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا...... ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اسے بہت دلاسہ دیا۔ بے چاری کو اپنی شادی یاد آ گئی تھی۔

رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی، وہ روتی رہی۔ وہ ہنستا رہا...... صبح ہوئی تو ہٹی کٹی ادھیڑ عمر کی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسہ دینے کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلایا گیا ـــــ اس کی شلوار میں اس کا لال پھندنوں والا ازار بند پڑا تھا۔ معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھا گیا۔

اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں...... اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا...... مگر پہلا تو ابھی تک اترا نہیں...... ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو، جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

اس کی ماں موٹر ڈرائیوی سیکھ رہی ہے...... باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اسے دلاسہ دیتا ہے، وہ اسے پچکارتی ہے اور دلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دلہن بھابی دونوں سیر کو جاتی ہیں ____ سہیلی بھی۔ پاکستان میل موٹر ۹۶۱۲ پی۔ ایل۔ سیر کرتے کرتے دونوں اجنتا جا نکلتی ہیں جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویریں بن جاتی ہیں۔ رنگ ہی رنگ، لال پیلے ہرے نیلے...... سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو ان رنگوں کا خالق چپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں سردیوں اور گرمیوں میں اور کوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل وصورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرتا ہے ____ اپنے رنگوں کو چپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کراتی ہیں اور بعد میں خود چلانے لگتی ہیں۔

تینوں اجنتا میں مجرد آرٹ کے سینکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دو پیٹ ہوتے ہیں، مختلف رنگوں کے...... دوسری کی تصویروں میں عورت ادھیڑ عمر کی ہوتی ہے، ہٹی کٹی تیسری کی تصویروں میں پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔

مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے...... بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنے بلاؤز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔

اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی سٹینو گرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش، اجنتا اسٹوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ اسٹکیں، اس کے بکھیرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں، ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی ____

اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں منتیں

پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف قسم کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔

ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہٹ جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ۔ عقب میں چلے جاؤ تو کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر...... ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ساس سے بھرا ہوا مرتبان ــ اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ ـــــ نیچے سے دیکھو تو میراجی کی مبہم شاعری۔

فن شناس نگاہیں عش عش کر اٹھیں...... دولہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا گیا۔ جہاں نہیں معلوم ہوا کہ ان کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن ہی کے ہاں رہتا ہے۔

اس کی ہونے والی دلہن وہی گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دوسری لپ اسٹکوں کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع میں چند مہینے تک اس کے شوہر کو اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی۔ لیکن جب اجنتا اسٹوڈیو بند ہو گیا اور اس کے مالک کی کہیں سے بھی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔

اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔

یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لئے تلخی کا موجب ہوئی۔ لیکن بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سہیلی نے، جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ کا چکر لگا آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی، اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہر کے پودوں کے درمیان اس انداز سے اوپر تلے رکھے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئی تھیں۔ ان پر شہد کی مکھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔

اس کی دوسری سہیلی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بیہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں بیہوشی نئی تھی یا وہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا۔ جہاں اس کا ہوٹل اس کی لیڈی اسٹینوگرافر کا سر

سہلاتا تھا۔ اس کی ممی، نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اس کو ڈرائیونگ آ گئی تھی۔ مگر بہت بیمار ہو گئی تھی مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے پلّے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔

اس کی بھابی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہٹی کٹی ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات، جب کہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کر رہے تھے، اس کی بھابی نمودار ہوئی۔ وہ مجرد تھی...... اس کے ہاتھ میں قلم تھا نہ برش۔ لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔

صبح کمرے میں سے جمے ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابی کے گلے میں لگا دیے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی۔ مگر ناکام رہی اس لیے کہ مقدار کم تھی...... اس نے مقدار بڑھا دی۔ حتی کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی اور اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھر آتی تھی ــــ منہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔

صبح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کا جسم کا ذرہ ذرہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے۔ اس کے وہ سب بچے جو پیدا ہو سکتے تھے 'ان قبروں میں جوان کے لئے بن سکتی تھیں، اس دودھ کے لئے جو ان کا ہو سکتا تھا بلک بلک کر رو رہے ہیں...... مگر اس کے دودھ کہاں تھے۔ وہ تو جنگلی پلّے پی چکے تھے۔

وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے۔ مگر اس کی خواہش پوری نہ ہوتی تھی۔ ذہین تھی، پڑھی لکھی تھی، جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

بالکل کھوکھلی ہو گئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے۔ وہ سمجھ گئی

چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتی، شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی...... رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔

سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لئے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا، موٹر گراج میں اور ماں اسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی اور دوسری کاٹی جانے والی تھی۔

وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تلچھٹ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے۔ مگر اس بدذائقہ شے سے تو اس کے بچے کے ہونٹ بھی تر نہ ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے۔ نرس بہت اچھی ہے۔ اسپتال سے نکلتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور، کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے، چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے کے باعث اسپتال میں مر گئی۔

اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے اس نے علیحدہ کر دیئے، ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لئے اس نے آیا رکھ دی...... کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آہستہ آہستہ اسے ان سے بھی چھٹکارا مل جائے۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھتی تھی ”چلے جاؤ...... جو کوئی بھی تم ہو چلے جاؤ...... میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“

سیف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے، جن سے اس کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر کن سری آواز میں فحش نغمے گاتی تھی۔ آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی۔ اس لئے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا

کر دے۔ مگر اس میں وہ زبردست حجاب محسوس کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ پیے اور خوب پیے۔ اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدد لے...... مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر ستر پوش ہو گیا تھا۔

تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی...... ایک عرصے اس کی پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی۔ اور اپنے جسم پر نئے خدوخال بنانے شروع کئے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی۔

وہ اپنا سامنا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی۔ بن کھائے پیے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا...... آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا...... ایک آدمی ہاتھ میں چھرا لیے منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے مگر جب وہ مڑی تو حملہ آور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کا رخ کیا کبھی ادھر کا...... آخر جو رستہ ملا اس میں سے بھاگ نکلا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگی، چیختی پکارتی۔ ”ٹھہرو...... ٹھہرو...... میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی...... ٹھہرو!“

مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی، دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی۔

اچانک اس کی نظریں آئینے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا۔ وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس پر خنجر رکھ کر دیکھا خول بہت چھوٹا تھا اس لئے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے گھونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلو بند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔

دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلو بند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے۔ وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑے رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔

☆☆☆

FASANEY MANTO KE

Anthology of selected Urdu short stories of
Saadat Hasan Manto

Ed: Dr. Khalid Ashraf

نئی نسل کے معتبر نقاد **ڈاکٹر خالد اشرف** کے قلم سے

منٹو سلسلے کی دوسری کتاب

فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا

کتابِ ہٰذا میں مشمولہ تیس منتخب افسانوں کے فنّی اور تنقیدی تجزیے کے علاوہ سعادت حسن منٹو کی حیات اور فکری کائنات پر ایک طویل اور دلچسپ باب، اُن کی تمام تصانیف کی تعداد کا تعین بمع اجمالی جائزہ اور منٹو کے نظریۂ فن پر چونکا دینے والے مباحث پیش کیے گئے ہیں

قیمت: ۳۷۰ روپے

صفحات: ۵۲۰

دونوں کتابوں کا سیٹ ہم سے طلب فرمائیں

Kitabi Duniya
1955, Turkman Gate, Delhi - 110006 (INDIA)
Mobile: 9313972589, Phone: 0091-11-23288452
E-mail : kitabiduniya@rediffmail.com

ISBN-81-89461-29-X